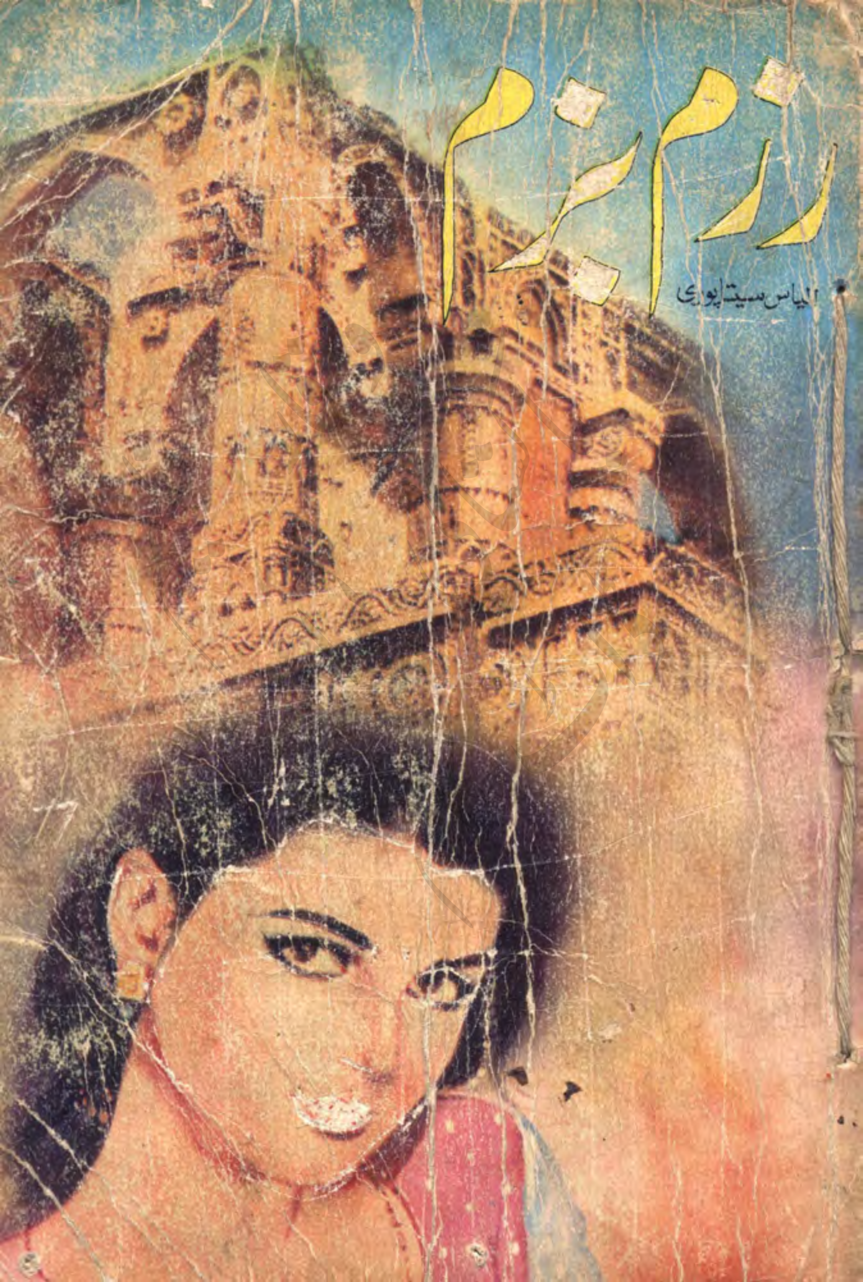
رزم بزم
الیاس سیتاپوری

رزم بزم

جب ترکی کے نامور فاتح مراد ثانی نے وفات پائی تو بد قسمتی سے اس کا اکیس سالہ بیٹا محمد خاں وطن سے دور ایشیائے کوچک کی مہمات میں الجھا ہوا تھا۔ شاہی قاصدوں اور تیز رفتار ہرکاروں نے نوجوان ولی عہد کو اس کے باپ کے سانحۂ ارتحال کی افسوسناک خبر پہنچا کر وطن فوراً واپس چلنے کی درخواست کی، محمد خان نے فوراً درۂ دانیال عبور کیا اور اڈریانوپل میں داخل ہو گیا۔

اڈریانوپل میں بڑے بڑے فوجی عہدیدار اور نوجوان ولی عہد کے رشتے دار جمع ہونا شروع ہو گئے تھے۔ یہ سب یہاں اس لئے نہیں جمع ہو رہے تھے کہ ولی عہد کی رسم تاج پوشی کی تقریب میں حصّہ لے سکیں بلکہ یہ لوگ نئے بادشاہ کی خوشنودی اور مصاحبت کی خاطر بڑی بڑی قربانیاں اور کارنامے انجام دے کر اس ناتجربہ کار سلطان کے مزاج میں رسوخ حاصل کرنا چاہتے تھے۔

مرحوم سلطان کی بیوی بھی اپنے آٹھ دس ماہ کے بیٹے کو سینے سے لگائے نئے بادشاہ کا انتظار کر رہی تھی، یہ ولی عہد کی سوتیلی ماں تھی اور مذہباً عیسائی تھی۔ شاہ سرویا نے اپنی شرمناک اور ذلت آمیز شکست کے موقع پر اپنی بیٹی کی شادی سلطان مراد ثانی سے کر دی تھی اور اب شاہ سرویا کی بیٹی بیوہ ہو چکی تھی۔ اسے جیسے جیسے نئے سلطان کے قریب آنے کی خبریں مل رہی تھیں، خوف سے اس کا دل بیٹھا جا رہا تھا۔ وہ اپنے معصوم بیٹے کو بار بار اپنے سینے سے لگا کر بھینچ لیتی اور پھر خوب خوب پیار کرتی۔ پھر اس کی دونوں بغلوں میں ہاتھ دے کر اسے اپنے روبرو کر لیتی۔ اور نہایت افسوس سے کہتی "افسوس کہ تو لڑکا ہے، کاش تو بیٹی ہوتا۔ تیرا باپ مر چکا ہے اور تیرا سوتیلا بھائی تاج و تخت سنبھالنے اڈریانوپل میں داخل ہو چکا ہے میں جانتی ہوں کہ تیرا کیا حشر ہوگا۔"

بچہ ماں کے رنج وغم سے نا آشنا، مسکرانے لگا۔ ماں کی آنکھیں بھر آئیں۔ اس نے بے اختیار بچے کے گالوں کو بوسہ دینا شروع کر دیا۔ بچے کا دم گھٹا تو وہ ہاتھ پاؤں مارنے لگا۔ اسی وقت ایک کنیز بھاگتی ہوئی آئی اور سرورین شہزادی کو مطلع کیا۔

"شہزادی صاحبہ! ینی چری سردار آپ سے ملنا چاہتا ہے۔"

شہزادی نے خوفزدہ ہو کر بچے کو سینے سے لگا کر بھینچ لیا۔ اس کی آنکھیں ڈر سے اُبل پڑی تھیں۔ پوچھا۔ "ینی چری سردار کے ارادے کیسے لگتے ہیں؟"

کنیز نے جواب دیا۔ "ارادے اچھے ہوتے تو وہ جبر و زیادتی سے کام نہ لیتا۔ جب آپ کے خدام اور محافظین نے اسے روکنا چاہا تو اس نے دھمکی دی کہ اگر اس کی راہ میں مزاحم ہونے کی کوشش کی گئی تو وہ اپنے ینی چری دستے کی مدد سے آپ کے خدام اور محافظین کو قتل کر کے اندر چلا جائے گا۔"

سرویا کی بیوہ شہزادی زار و قطار رونے لگی۔ "میں جانتی ہوں کہ ینی چری سردار مجھ سے کیوں ملنا چاہتا ہے۔" اس کے بعد اس نے اپنے بچے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "وہ مجھ سے نہیں اس بچے سے ملنا چاہتا ہے۔" پھر کنیز سے خوشامدانہ لہجے میں پوچھا۔ "کیا تو اسے چھپا نہیں سکتی؟ تو اگر اسے کہیں چھپا دے تو میں بعد میں تجھے مالا مال کر دوں گی۔"

کنیز نے بے بسی سے جواب دیا۔ "حضور ملکہ صاحبہ! اگر میری کوئی اولاد ہوتی تو میں اس وقت اسے آپ کے بیٹے پر قربان کر دیتی، آپ کا بیٹا میں لے لیتی اور اپنا آپ کو دے دیتی۔ آپ میرے بیٹے کو شوق سے ینی چری سردار کے حوالے کر دیتیں۔"

شہزادی نے مایوسی سے پوچھا۔ "پھر اب میں کیا کروں، میری عقل تو کام نہیں کر رہی، کچھ تو ہی بتا۔"

کنیز نے جواب دیا۔ "کسی بھی طرح اس وقت تک اپنے بچے کو ینی چری سردار یا اسی نوع کے دوسرے خونخواروں سے محفوظ رکھیئے جب تک نیا بادشاہ رسمِ تاجپوشی نہیں ادا کرتا۔"

"پھر؟ پھر کیا ہوگا؟ پھر میں کیا کروں گی؟"

کنیز نے جواب دیا۔ "جشنِ تاجپوشی میں آپ بھی شریک ہوں گی آپ اپنے بچے کو سینے سے لگاتے نئے بادشاہ کے قریب پہنچ جائیے گا اور اسے تاج و تخت کی مبارکباد دے کر روتے ہوئے اپنا بچہ اس کے حوالے کر دیجئے گا اور کہیئے گا کہ اسے

سلطان! یہ تیرے باپ کی امانت ہے اور تجھے پورا پورا اختیار ہے کہ چاہے تو اس امانت کو ایک امین کی طرح محفوظ کر دے ورنہ ماضی کے دوسرے ترک بادشاہوں کی طرح تو بھی اسے ہلاک کر دے کیونکہ ہر نیا ترک حکمران فتنہ و فساد کے ڈر سے اپنے بقیہ بھائیوں کو قتل کرتا چلا آیا ہے۔!"

شہزادی نے سوگوار آنکھیں اوپر اٹھا دیں اور سوال کیا۔ "تیرا کیا خیال ہے، کیا اس طرح سلطان محمد خان اسے معاف کر دے گا؟"

"شہزادی صاحبہ!" کنیز نے نکتے کی بات سمجھائی۔ "انسانی مزاج کا اعتبار ہو یا نہ ہو، لیکن بادشاہوں کے مزاج کا واقعی کوئی اعتبار نہیں ہوتا۔ یہ لوگ بڑی سے بڑی بات کو ہنس کر گوارا کر لیتے ہیں اور بعض اوقات یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ کسی معمولی سی بات پر زندگیاں چھین لیتے ہیں۔"

"میں تیری بتائی ہوئی ترکیب پر عمل کرنے کو تیار تو ہوں، مگر اس وقت ینی چری سردار سے اپنے بیٹے کو کس طرح بچاؤں؟"

کنیز نے فوراً بے رُخی اختیار کی، بولی۔ "اب میرے پاس اتنا فالتو دماغ نہیں ہے کہ جو بات میرے بس کی نہیں ہے اس میں بھی بلا وجہ سر کھپاؤں۔ یہ آپ کا اپنا مسئلہ ہے اس پر جس دردمندی اور قلق سے آپ سوچیں گی، میں نہیں سوچ سکتی۔"

شہزادی سہم کر چپ ہو گئی۔ وہ اس لئے ڈر گئی کہ اگر اب وہ زیادہ اصرار کرے گی تو کہیں یہ کنیز اس ینی چری سردار کو لے کر ہی نہ آ جائے کیونکہ جس ذات سے ان خدام اور کنیزوں پر اس کا اقتدار اور رعب قائم تھا وہ رخصت ہو چکا تھا اور اب وہ سراپا انہی کمزوروں کے رحم و کرم پر زندہ تھی۔

شہزادی نے اپنے بچے کو آغوش میں چھپا لیا اور محل میں اس گوشے کی تلاش میں نکل گئی جہاں وہ اپنے معصوم کو ینی چری سردار سے بچا سکتی تھی۔ ابھی وہ چند کمرے بھی نہ طے کر سکی تھی کہ ینی چری سردار اس کے سر پر پہنچ گیا۔ اس نے شہزادی کو ڈانٹ دیا۔ "کہاں جاتی ہے او نامراد عورت، میں کہتا ہوں ٹھہر جا۔"

شہزادی سہم کر رُک گئی اور اس نے اپنے بچے کو مضبوطی سے بھینچ لیا، خوشامد کرتی ہوئی بولی۔ "ینی چری سردار! میں تمہارے قدموں میں گر جانے کو تیار ہوں۔ خدا کے لئے تم مجھ سے میرے معصوم کو مت چھینو۔"

ینی چری سردار شہزادی کے سر پر پہنچ چکا تھا، اس کے گول سر، تنگ پیشانی

کے نیچے دو چھوٹی چھوٹی سرخ آنکھوں میں سفاکی اور بے رحمی اس طرح عیاں تھی جیسے کسی حبشی کے سیاہ چہرے پر موٹے موٹے ہونٹوں کے درمیان سفید سفید دانت۔ اس نے شہزادی کو حکم دیا۔ "سرویا کی شہزادی! مجھے معلوم ہے کہ تو مرحوم بادشاہ کی بیوی رہ چکی ہے لیکن اب وہ بادشاہ چونکہ ہمارے درمیان موجود نہیں ہے اس لئے اب ہم سب کی وفاداریاں نئے سلطان محمد خان کی طرف منتقل ہو جائیں گی اور اگر خدا نے تجھے ذرا سی بھی عقل دی ہے تو تجھے بھی اپنے نئے بادشاہ کے لئے قربانی دینی چاہیئے۔"

شہزادی کی آنکھیں برسنے لگی تھیں اس نے ڈبڈبائی آنکھوں سے ینی چری سردار کی طرف دیکھا اور کہا۔ "ینی چری سردار! میں اپنے نئے سلطان پر اپنی جان قربان کر سکتی ہوں لیکن اپنے معصوم بے گناہ کو کوئی گزند ہرگز نہ پہنچنے دوں گی۔"

ینی چری سردار نے بچے کی گردن پکڑ لی۔ بولا۔ "اسے چھوڑ دے ورنہ یہ تیری گود ہی میں ہلاک ہو جائے گا۔"

اس شور و غل اور واویلا میں محل کے خدام اور محافظ بھی پہنچ گئے ان میں شاہی قرابت دار بھی تھے۔ ینی چری سردار نے ان سب کو ڈانٹ دیا۔ "تم سب اپنی اپنی جگہوں پر چلے جاؤ۔ نیا بادشاہ کسی بھی قیمت پر اپنی حکومت کے اس رقیب کو زندہ نہیں چھوڑے گا۔ اس لیئے ایک وفادار نمک خوار کی حیثیت سے یہ میرا فرض ہے کہ میں کسی فرمان سے پہلے ہی یہ روایتی اور رسمی قانون یا فرض بجا لاؤں۔"

ایک محافظ آگے بڑھا اور اس نے ینی چری سردار کو دھکا دے کر بچے کی گردن اس کی گرفت سے چھڑا دی، بولا۔ "ینی چری سردار! میں جانتا ہوں کہ تم لوگ بادشاہ کے کتنے وفادار اور جاں نثار ہوتے ہو، لیکن شہزادی کی طرف سے میں تم سے یہ درخواست کرتا ہوں کہ تم اس معصوم بچے کو کم از کم اس وقت تک زندہ رہنے دو جب تک کہ نیا سلطان خود اس سلسلے میں اپنا کوئی فیصلہ نہ صادر کر دے!"

شہزادی نے شکر گزار نظروں سے اپنے حمایتی محافظ کو دیکھا اور نظروں ہی نظروں میں اس کا شکریہ ادا کرنے لگی۔

ینی چری سردار ایک دم مشتعل ہو گیا۔ بولا۔ "احمق، کم حیثیت چوکیدار، تیری یہ مجال کہ تو میرے فرائض منصبی کی ادائیگی میں میری مخالفت کرے یا اس میں ٹانگ اڑائے؟ میں نے یہ تو کبھی سوچا بھی نہ تھا۔"

محافظ نے کہا۔ "میں بھی اس محل کا محافظ ہوں اور میرے ذمے بھی کچھ فرائض منصبی ہیں۔ تیرا کیا یہ خیال ہے کہ میں ان کی بجا آوری میں غفلت یا کوتاہی برتوں گا یا تجھ سے مرعوب ہو کر بزدلی دکھا جاؤں گا۔"

ینی چری سردار نے ایک زوردار سیٹی بجائی اور محافظ کو حکم دیا۔ "تو مجھ سے دس قدم دور ہٹ جا۔" یہ کہتے ہوئے اس نے اپنی تلوار نیام سے نکال لی۔

محافظ نے بھی اپنی تلوار سونت لی اور ینی چری سردار کو للکارا۔ "آجا او لالچی نمک حرام، میرے اندر سے دل یہ گواہی دے رہا ہے کہ میں تیرے حق میں قضا ثابت ہوں گا۔"

ینی چری سردار مسکرایا اور بولا۔ "ہو سکتا ہے تو بہادری میں کچھ زیادہ ہو، اور میں تیرا ہم پلہ نہ نکلوں، لیکن یہ طے ہے کہ میں اپنے تجربوں میں بہت آگے ہوں اور اس کا فوری ثبوت تجھے اسی وقت اسی جگہ مل جائے گا۔"

محافظ نے حکم دیا۔ "تم شاہی محل سے نکل جاؤ، اس کے بعد جو ہو گا دیکھا جائے گا۔"

ینی چری سردار نے تعجب سے کہا۔ "یہ تیری ہمت کہ تو مجھے محل سے نکل جانے کا حکم دے! خوب خوب!!"

محافظ نے اچانک اپنی تلوار کی نوک ینی چری سردار کے پیٹ میں چبھو دی، بولا "بس اب تم یہاں سے چلتے پھرتے نظر آؤ ورنہ یاد رکھو کہ جو تلوار تمہارے پیٹ کی جلد پر رک گئی ہے وہ اندر بھی جا سکتی تھی لیکن نہیں ایسا نہیں ہونا چاہیئے۔"

ینی چری سردار بولا۔ "بس ذرا دیر اور میرے مہربان دوست اس کے بعد تم جو کچھ بھی کہو گے میں اس کی حرف بہ حرف تعمیل کروں گا۔"

محافظ کو ینی چری سردار کی خوشامد سے رحم آ گیا۔ بولا۔ "بہتر ہے میں تجھے پندرہ بیس لمحے دیتا ہوں، تو ان لمحات میں یہاں سے چلا جا ورنہ میں اس کے بعد جو قدم اٹھاؤں گا شاید تو اس کے لئے ابھی سوچ بھی نہ سکے۔"

شہزادی اپنے بچے کو لے کر جانے لگی۔ ینی چری سردار چیخا۔ "اسے روکو، یہ ابھی یہیں رکے۔"

محافظ نے جواب دیا۔ "اب ان کی یہاں کوئی ضرورت نہیں انہیں ہم دونوں کے سامنے سے ہٹ ہی جانا چاہیئے۔"

اچانک محل کے مختلف گوشوں سے شور غل بلند ہونے لگا۔ اور بھاگ دوڑ مچ گئی۔ چیخ پکار، آہ و بکا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے لوگ کسی مصیبت سے بچنے کے لئے اپنی اپنی جانیں بچا کر بھاگتے پھر رہے ہیں، محافظ کی توجہ چیخ پکار کی طرف منعطف ہو گئی ینی چری سردار نے اس کی اس غفلت سے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور پیچھے سے تلوار کا ایک بھرپور ہاتھ رسید کر دیا۔ اسی وقت مختلف حصوں سے بہت سارے ینی چری اپنی خون آلود تلواریں اٹھائے ینی چری سردار کے پاس پہنچ گئے۔ ایک ینی چری نے زور زور سے ہنستے ہوئے کہا۔

"سردار! تمہاری سیٹی کی آواز سنتے ہی ہم کسی روک ٹوک یا مزاحمت کی پرواہ کئے بغیر محل میں داخل ہو گیا۔ اور جس محافظ یا نگران نے ہمارا راستہ روکنے کی کوشش کی کہ ہم سب اندر نہ داخل ہو سکیں لیکن ہم نے ان کا محاصرہ توڑ کر اور انہیں قتل اور زخمی کرتے ہوئے تمہارے پاس تک آگئے۔"

ینی چری سردار نے زخمی محافظ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "یہی کام اس نے بھی کیا تھا لیکن اسے میں نے تقریباً دوسری دنیا میں پہنچا دیا ہے۔" پھر اچانک شہزادی کی طرف دیکھا جو جا چکی تھی۔ ینی چری اس سمت بھاگا جدھر شہزادی تیز تیز قدم اٹھاتی حمام کے قریب پہنچ چکی تھی۔ ینی چری سردار نے شہزادی کو گدی کے بالوں سے پکڑ لیا "ٹھہر جا او ناہنجار بدبخت عورت! میں تجھے حکم کچھ دیتا ہوں اور تو عمل کچھ اور کرتی ہے کیا تو یہ سمجھتی ہے کہ اس محل کی موٹی موٹی دیواریں، مضبوط دروازے اور تنگ یا کشادہ کمرے تیرے بچے کو چھپا لیں گے؟ کبھی نہیں کبھی نہیں!"

شہزادی رونے لگی۔ "ینی چری سردار! خدا کے لئے رحم کرو۔"

ینی چری سردار نے بالوں کو ایک زور کا جھٹکا دے کر زمین پر گرا دیا اور بچے کو زبردستی اس کی گود سے چھین لیا۔ شہزادی اتنی زور سے چیخی کہ گویا اسے ذبح کر دیا گیا ہے، اس نے بے بسی میں اپنا سر کئی بار زمین پر دے مارا، جس سے اس کی پیشانی لہولہان ہو گئی۔

ینی چری سردار بچے کو لے کر حمام میں گھس گیا۔ بچہ بھی زور زور سے رو رہا تھا لہولہان ماں ان دونوں کے پیچھے دوڑی لیکن جب وہ حمام کے دروازے پر پہنچی تو وہ بند ہو چکا تھا۔ اس نے اپنا سر دروازے سے ٹکرانا شروع کر دیا۔

ینی چری سردار نے پانی کے حوض میں بچے کو ڈال کر ہاتھوں کی مدد سے تہہ

سے لگا دیا اور پھر داہنے ہاتھ سے اس کے پیٹ کو دبا کر اسے تہہ سے لگائے رکھا۔ بچے نے ہاتھ پیر مارنا شروع کر دیئے۔ رونے کے لئے منہ کھولا تو ناک کے ساتھ ساتھ منہ سے بھی پانی اندر جانے لگا۔ حوض کی سطح پر پانی کے بلبلے نمودار ہوتے جو بتدریج کم ہوتے چلے گئے۔ ادھر بچے کی قوتِ مدافعت بھی کم ہوتے ہوتے ختم ہو گئی۔ ینی چری سردار کو جب بچے کی موت کا یقین ہو گیا تو اس نے اسے حوض سے باہر نکال لیا۔ بچے کا پیٹ پھول چکا تھا۔ دونوں آنکھیں بند تھیں۔ لیکن آس پاس کرب کے آثار اس وقت بھی پائے جاتے تھے۔ منہ میں جمع پانی دونوں باچھوں سے بہہ نکلا۔ وہ حمام سے باہر نکلا تو سیڑھیوں پر نیم مدہوش شہزادی کو پڑا ہوا دیکھا۔ اس نے مردہ بچے کو شہزادی کے جسم پر پھینک دیا۔ اور کہا۔ "لے سنبھال اپنے بچے کو، دیکھ اس میں کوئی کمی تو نہیں ہوئی۔ اس کے سارے اعضا موجود ہیں نا؟"

اوپر سے ماں پر گرنے کی وجہ سے بچے کا پیٹ دب گیا۔ جس سے منہ سے پانی بہہ نکلا۔ شہزادی کو کچھ ہوش نہ تھا کہ کیا ہو چکا ہے۔ اس نے اس مدہوشی میں بھی محبت کی گرم جوشی سے بچے کو سینے سے لگا لیا۔ وہ جیسے جیسے اسے بھینچ رہی تھی پیٹ کا پانی منہ کے راستے کُلیوں کی طرح اُبل اُبل کر باہر نکل رہا تھا۔

★ ★ ★

شہزادہ محمد خان اڈریا نوپل کے محل میں داخل ہوا تو امرائے سلطنت اور فوجی عہدے دار اس کے گرد و پیش جمع ہو گئے۔ ان سب کا خیال تھا کہ شہزادہ ابھی نوعمر اور ناتجربہ کار ہے اس لئے اس پر قابو پا لینا کوئی بڑی بات نہیں۔ ینی چری سردار نے سب سے پہلے تاج و تخت کے وارث کو خوش آمدید کہا اور دعائیں دیتا ہوا بولا۔

"شہزادے! آپ کتنے خوش قسمت ہیں کہ اس نوعمری ہی میں آپ کو وہ شے مل گئی جس کی تمنا میں لوگ اپنی پوری زندگیاں گزار، بحسرت و یاس چلے جاتے ہیں!"

شہزادے نے ترشی سے جواب دیا۔ "بے ادب، موقع ناشناس سردار! سب سے پہلے تجھے والد مرحوم کی مجھ سے تعزیت کرنی تھی، اس کے بعد جشنِ تاجپوشی پر یہ مبارکباد بھی پیش کر دیتا۔"

ینی چری سردار ڈر کر خاموش ہو گیا۔

جشنِ تاج پوشی کے موقع پر محل اور شہر کے در و دیوار سجا دیئے گئے۔ لوگوں

کے چہروں پر شگفتگی اور مسرت کھیلنے لگی۔ یہ شہزادہ اپنے باپ کی زندگی میں بھی دو بار تخت نشین ہو چکا تھا۔ اس کا باپ مراد ثانی کاروبارِ سلطنت سے اکتا کر دو بار گوشہ نشین ہوا اور حکومت اپنے بیٹے کے حوالے کر دی ان دنوں شہزادے کی عمر سولہ سال کی تھی، جب پڑوس کی عیسائی حکومتوں کو مراد ثانی کی گوشہ نشینی اور ناتجربہ کار اور نوعمر شہزادے کی سلطانی کی خبریں ملیں تو انہوں نے سر اٹھانا شروع کر دیا۔ مراد ثانی بدرجۂ مجبوری گوشے سے باہر آ گیا اور سرکش فتنہ جو، اور بدعہد عیسائی حکمرانوں کو سزائیں دے کر پھر خلوت گزیں ہو گیا، اور اقتدار ایک بار پھر شہزادہ محمد کے ہاتھ میں چلا گیا۔ دشمنوں نے پھر سر اٹھایا اور مراد ثانی نے انہیں ایک بار پھر عبرت ناک سزا دی۔ شہزادے نے دونوں ہی مرتبہ کاروبارِ سلطنت جس طرح انجام دیا تھا اس سے دوست اور دشمن یہی سمجھ بیٹھے تھے کہ بیٹے میں باپ جیسی صلاحیتیں نہیں ہیں اور اس کی ذات سے عثمانی سلطنت کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچ جائے گا۔

اڈریانوپل میں شہزادے کے خود اپنے آدمی بھی کچھ اسی قسم کی رائے رکھتے تھے۔ ایک امیر نے دبے لفظوں میں یہاں تک کہہ دیا کہ "اب ہمیں کسی اور دربار کا رخ کرنا چاہیئے، کیونکہ ایک اکیس سالہ نوعمر اور ناتجربے کار بادشاہ کی چاکری میں آزمودہ کار بوڑھوں کے لئے عزت و آبرو کی بات نہیں رہ گئی ہے۔"

دوسرے تیس پینتیس سالہ امیر نے کہا۔ "حالات کا تقاضہ تو یہ ہے کہ ہمیں کسی اور دربار میں جانے کے بجائے یہیں قسمت آزمائی کرنا چاہیئے چاکری چاکری ہی ہے وہ کسی عمر رسیدہ بادشاہ کی چاکری ہو، یا چھ ماہ کے انگوٹھا چوستے معصوم حکمران کی چاکری ہو۔ آدمی کی انا اور خودداری تو دونوں ہی جگہ تباہ و برباد ہو جاتی ہے۔"

کسی تیسرے تجربے کار نے کہا۔ "اگر سچ پوچھو تو اس نوعمر سلطان کی چاکری میں زیادہ فائدے ہیں کیونکہ ہمارا تجربہ اس کی ناتجربہ کاری پر ہمیشہ حاوی رہے گا۔ اور ہم اس سے مفید طلب فائدے اٹھا سکیں گے!"

کسی اور نے تیسرے کی تائید میں کہا۔ "میں اپنے ان بھائی کا ہم خیال ہوں، ہمیں ناتجربہ کار سلطان کی بیعت میں زیادہ تاخیر سے کام نہیں لینا چاہیئے۔"

محمد خان کے جشنِ تاج پوشی کے موقع پر مبارکباد دینے والوں کا ہجوم لگ گیا نذرانے پیش کئے گئے۔ دعائیں دی گئیں، قصیدے پڑھے گئے اور شہزادے تک کورنش و تسلیمات بجالائے۔

شام کے وقت مردوں کو حصۂ خاص سے باہر نکال دیا گیا، اور عورتوں کو شرفِ باریابی بخشا گیا، باری باری عورتیں نئے بادشاہ کے روبرو جاتیں اور چند دعائیہ مبارکبادی کے کلمات ادا کر کے بادشاہ کے دائیں ہاتھ کی ہتھیلی کی پشت کو بوسہ دے کر دوسری کے لئے راستہ چھوڑ دیتیں اور الٹے پاؤں واپس چلی جاتیں۔ انہی میں مردیا کی شہزادی اپنے خورد سالہ بچے کے غم کو سینے سے لگاتے آگے بڑھی اور بادشاہ کو تاج و تخت سنبھالنے کی مبارکباد پیش کی۔ اس وقت اس کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں اور کپڑوں میں سلوٹیں پڑی ہوئی تھیں اور آواز میں ارتعاش کے ساتھ گھبراہٹ بھی شامل تھی۔ اس نے نئے بادشاہ سے کیا کچھ کہا، خود اسے بھی پتہ نہ تھا۔

سلطان محمد نے پوچھا۔ "کم عمری کے باوجود تم میری ماں ہو، مجھے یہ تو بتاؤ کہ تم اتنی آزردہ کیوں ہو؟"

شہزادی نے اصل غم کو چھپانا چاہا۔ بولی۔ "نوجوان بادشاہ! کیا تجھے اپنے باپ کی وفات کا غم نہیں ہے اور میں تو اس کی بیوی تھی اس کی موت کا غم جتنا مجھے ہے، بادشاہ کے علاوہ کسی اور کو اتنا صدمہ ہرگز نہ اٹھانا پڑا ہوگا۔"

سلطان نے اس کی خالی آغوش کو دیکھ کر سوال کیا۔ "تمہارا بیٹا کہاں ہے؟"

شہزادی تڑپ گئی۔ بولی۔ "بادشاہ کو تو یہ معلوم ہی ہے کہ یہاں جب ایک شہزادہ برسرِ اقتدار آتا ہے تو اس کے بقیہ بھائی اس دنیا سے رخصت کر دیئے جاتے ہیں۔ میرا اپنا بیٹا بھی نئے بادشاہ پر قربان ہو گیا۔"

اتنا کہہ کر شہزادی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

سلطان محمد نے بے چینی سے پوچھا۔ "لیکن اسے مارا کس نے؟ میں نے تو اس بات کا کسی کو حکم ہی نہ دیا تھا!"

شہزادی نے ہچکیوں میں جواب دیا۔ "ینی چری سردار کہتا تھا کہ وہ ترکی کے عثمانی بادشاہوں کی یہ رسم اس لئے ادا کر رہا ہے کہ جب نیا بادشاہ یہ خبر سنے گا تو بہت خوش ہوگا۔"

سلطان محمد چیخا۔ "وہ سردار کہاں ہے؟"

"اپنے بیرک میں۔"

بادشاہ نے زور زور سے تالی بجائی اور حکم دیا۔ "ینی چری سردار کو فوراً حاضر کیا جائے!"

خادم واپس چلا گیا اور بادشاہ روتی ہوئی اپنی سوتیلی ماں کو تسلیاں دینے لگا۔ بولا۔" میں اس بچے کو کس طرح قتل کرا سکتا تھا وہ ابھی آٹھ دس ماہ سے زیادہ عمر کا تو نہیں تھا، پھر میں اس سے کیوں ڈرتا، وہ میری حکومت کے لئے وبال جان بننے کی صلاحیت تو نہیں رکھتا تھا؟"

شہزادی کی چیخ نکل گئی۔" بادشاہ! ان تسلیوں سے میرے زخم ہرے ہوتے جاتے ہیں، خدا کے لئے مجھے تسلیاں نہ دیجئے۔"

کچھ دیر بعد ینی چری سردار بھی آ گیا، سلطان محمد نے خشمناک لہجے میں پوچھا۔ "تجھے یہ حکم کس نے دیا تھا کہ تو آٹھ دس ماہ کے معصوم کو بے دردی اور سفاکی سے ہلاک کر دے؟"

ینی چری سردار نے کہا۔" کسی نے بھی نہیں، بلکہ عثمانی حکمرانوں میں یہ قانون ایک عرصے سے چلا آ رہا ہے کہ برسر اقتدار شہزادے کے علاوہ سبھی شہزادوں کو ہلاک کر دیا جائے۔ میں نے اس قانون پر عمل کیا ہے اور یہ جو کچھ بھی میں نے کیا ہے نئے بادشاہ کی فلاح و بہبود میں کیا ہے۔"

بادشاہ نے پوچھا۔" اور تو اس غیر معمولی کارنامے کی انجام دہی پر انعام و اکرام کا خواہشمند بھی ہوگا؟"

"بجا طور پر، اگر مزاج عالی میں آجائے۔"

بادشاہ نے ایک بار پھر تالی بجائی اور جب خدام حاضر ہوئے تو انہیں حکم دیا۔" اس ینی چری سردار کو فوراً قتل کر دیا جائے۔"

ینی چری سردار چیخا۔" حضور والا رحم!"

بادشاہ نے غصے میں کہا۔" رحم ان پر کیا جاتا ہے جو خود بھی رحم کرتے ہیں۔"

ینی چری سردار چیختا چلاتا اور روتا دھاڑتا رہا۔ شاہی خدام اسے پکڑ کر باہر لے گئے جہاں جلاد نے اسی وقت اس کی گردن اڑا دی اور خدام نے اس کا سر طشت میں رکھ کر سلطان محمد کے روبرو پیش کر دیا اس نے نفرت سے سر کی طرف دیکھا اور حکم دیا اس کے سر اور جسم کو بحیرۂ مارمورہ میں پھینک دیا جائے۔

شہزادی کی آنکھوں میں اس وقت خوشی کے آنسو بھی تھے اور غم کے بھی۔ بادشاہ نے اس زخمی محافظ کو وہیں طلب کر لیا، جس نے ینی چری سردار کا مقابل بن کر زخم کھایا تھا۔ بادشاہ نے اسے شاباشی دی اور انعام و اکرام سے بھی نوازا۔ آخر میں پوچھا۔

"تو اور کیا چاہتا ہے؟ بتا تاکہ تیری وہ خواہش بھی پوری کر دی جائے!"

محافظ نے دزدیدہ نظروں سے شہزادی کی طرف دیکھا، سلطان محمد نے اس کی چوری پکڑ لی، لیکن شہزادی نے نظروں ہی نظروں میں اس سے کیا کہا۔ بادشاہ یہ نہیں سمجھ سکا۔

محافظ نے خوشامدانہ عرض کیا۔" حضور والا! میں سرویا کا رہنے والا ایک غریب الدیار شخص ہوں، مجھے شہزادی صاحبہ کے ساتھ یہاں بھیج دیا گیا تھا۔ ایک عرصے سے میں نے اپنے وطن اور اپنے اعزاء کی شکلیں نہیں دیکھیں۔ اب اگر حضور اجازت مرحمت فرما دیں گے تو بڑی مہربانی اور بندہ نوازی ہوگی۔ ورنہ تقدیر کے لکھے پر قناعت کر لوں گا۔"

ہوشیار بادشاہ نے شہزادی سے پوچھا۔" اور تم کیا چاہتی ہو؟"

شہزادی نے جواب دیا۔" میں بھی کچھ دنوں کے لئے اپنے وطن کی آب و ہوا میں سانس لینا چاہتی ہوں۔"

بادشاہ نے محافظ کو حکم دے دیا۔" تم ایک سال کے لئے سرویا جا سکتے ہو۔ اور سرویا کی شہزادی تم! تم ابھی۔۔۔ کہیں بھی نہیں جا سکتیں افسوس کہ تمہیں محلات کی چہار دیواریوں ہی میں رہنا پڑے گا۔"

اس حکم سے دونوں ہی کے چہرے فق ہو گئے۔ سلطان محمد کو کچھ ایسا محسوس ہوا گویا کہ ان دونوں میں کوئی ایسا معاہدہ ضرور ہو چکا ہے جس کی مدد سے ان دونوں کو ایک ساتھ سرویا پہنچنا چاہیئے۔

بادشاہ نے پوچھا۔" تم دونوں کو میرا یہ فیصلہ منظور ہے یا نہیں؟"

شہزادی نے جواب دیا۔" مجھے منظور ہے۔!" اس کی آواز میں مایوسی تھی، عجز تھا، بے بسی تھی اور حالات سے سمجھوتہ کر لینے کا ایک مایوسانہ انداز پایا جاتا تھا اس کے بعد بادشاہ نے محافظ کی طرف دیکھا۔ اس عرصے میں شہزادی نے نہایت ہوشیاری سے اپنا سر نفی میں ایک طرف اٹھا کر اشارے سے محافظ سے کہہ دیا کہ، تم بھی بادشاہ کی تجویز مان لو۔

محافظ نے کہہ دیا۔" حضور والا! مجھے جانے کی اجازت مرحمت فرمائی جائے۔ میں سرویا جانا چاہتا ہوں۔"

بادشاہ نے اسی وقت اسے چلے جانے کی اجازت دے دی۔

محافظ دربار سے باہر نکلا تو بادشاہ نے اُسے ایک بار پھر بلوا لیا اور کہا۔ ”اور وہاں دیکھنا زادِ راہ اور سفر کا خرچ تم شاہی خزانے سے لوگے۔“

محافظ نے بادشاہ کو دعائیں دیں اور الٹے قدموں واپس ہوا۔

*　　*　　*

رات کے سناٹے میں محل کے موٹے موٹے ستونوں کے درمیان سے گزر کر رویا کی شہزادی تک پہنچ جانا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ جگہ جگہ قدِ آدم شمع دانوں میں موم بتیاں روشن ہو رہی تھیں جس سے محل کے تمام گوشے منور تھے۔ مسلح عورتیں غلام گردشوں میں منڈلا رہی تھیں ایک ستون کے سہارے دو پہرے دار عورتیں اپنی اپنی پشتیں ٹکائے سرگوشیوں میں باتیں کر رہی تھیں۔ اسی عالم میں ایک طرف سے ان کی افسر محافظ نمودار ہوئی اس کے ساتھ ایک اور عورت تھی، جب یہ دونوں باتونی عورتوں کے سر پر پہنچ گئیں تب ان دونوں کو ہوش آیا اور وہ ایک دم کھڑی ہو کر مختلف سمتوں میں بھاگنے لگیں۔ افسر خاتون نے ان دونوں کو للکارا ”کہاں بھاگ رہی ہو، ٹھہرو تو، یہ تم پہرہ دے رہی تھیں یا ستون کے سہارے آرام کر رہی تھیں؟“

لیکن دونوں میں سے کسی ایک نے بھی جواب نہ دیا۔ اور کچھ پتہ نہ چلا کہ وہ دونوں بھاگ کر گئیں کہاں۔ افسر خاتون نے اپنی ساتھی عورت سے کہا ”اب تم نہایت خاموشی سے شہزادی کے در پر دستک دے کر اندر جا سکتی ہو!“

اس عورت نے سردار خاتون کا شکریہ ادا کیا اور اس کی پہلی ہی دستک پر شہزادی کے محل کا دروازہ کھل گیا یہ دروازہ شہزادی نے خود کھولا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرا دیئے۔ شہزادی کو بہت زیادہ ہنسی آ رہی تھی۔

اس نے ہنستے ہوئے کہا ”اینجل! میں حیران ہوں کہ تم خواتین کا لباس پہن کر محل کے وہ محافظ نظر ہی نہیں آ رہے ہو جس نے چند دن پہلے ینی چری سردار کو سراسیمہ کر دیا تھا۔ تم تو بالکل عورت نظر آ رہے ہو۔“

اینجل نے محافظوں کی سردار خاتون کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ”یہ سب کچھ ان کی مہربانی سے ہوا ہے یہ اگر نہ چاہتیں تو میں یہاں تک کبھی بھی نہ آ سکتا تھا۔ اور خاص کر ان حالات میں کہ میں اب محافظ کا منصب بھی نہیں رکھتا اور رات کے اندھیرے میں تو محافظ کی حیثیت سے بھی میں آپ کے محل میں نہیں داخل ہو سکتا تھا!“

سردار خاتون نے دریافت کیا ”حضورِ شہزادی صاحبہ! میں کتنی دیر بعد واپس آجاؤں؟“

شہزادی نے جواب دیا ”دو گھنٹے بعد۔“

سردار خاتون نے عاجزی سے کہا ”خدا کے لئے احتیاط سے کام لیجئے گا ورنہ میرا خاندان تباہ و برباد کر دیا جائے گا۔“

شہزادی نے کہا ”تو بے فکر رہ۔“

سردار خاتون چلی گئی۔ شہزادی نے دروازہ اندر سے بند کر لیا اور واپس آتی ہوئی بولی ”اینجل! میں نے تمہیں یہاں تک لانے کے عوض اس سردار خاتون کو ایک معقول رقم دی ہے۔ یہ بہت لالچی لوگ ہیں۔ میں تو اس ماحول سے تنگ آ گئی ہوں۔“

اینجل شہزادی کو بڑی حریصانہ نظروں سے دیکھ رہا تھا شہزادی نے اسے اپنی خواب گاہ سے دور ہی رکھا اور ایک ایسے کمرے میں لے گئی جہاں رقص و سرود کی محفل جما کرتی تھی۔ شہزادی خود تو صندلین تخت پر بیٹھ گئی، جس پر دبیز لیکن نرم و ملائم گدا اور گدے پر خوبصورت ریشمی چادر بچھی تھی۔ شہزادی گدے میں دھنس سی گئی۔

اینجل نے شہزادی کے قریب بیٹھنے کی جسارت کی تو وہ بھڑک اٹھی، بے چینی سے کھڑی ہو گئی، بولی ”خبردار، ایسی جسارت کبھی نہ کرنا کچھ بھی سہی، لیکن میں ترکی کے نامور فاتح مراد ثانی کی بیوی رہ چکی ہوں اور موجودہ نوجوان بادشاہ میرا سوتیلا بیٹا ہے جب تک میں اس محل اور ترکوں کی سرزمین پر ہوں ان کی عزت و آبرو کا خاص خیال رکھوں گی۔“

اینجل کھسیا گیا، سامنے کی منقش کرسی کی طرف اشارہ کرتا ہوا بولا۔

”کیا میں اس پر بیٹھ سکتا ہوں؟“

”ہاں اس پر بیٹھ جاؤ۔“ شہزادی دوبارہ گدے میں دھنس گئی۔

اینجل کے چہرے سے صاف ظاہر تھا کہ اس کی طبیعت میں تکدر پیدا ہو گیا ہے شہزادی نے بھی اس کی یہ کیفیت محسوس کر لی لیکن ایسی بن رہی گویا کچھ جانتی ہی نہ ہو۔

اینجل نے اُکھڑے اکھڑے لہجے میں کہا ”میں سرویا واپس جا رہا ہوں، وہاں کے لئے کوئی خاص پیغام؟“

شہزادی نے جواب دیا ”ہاں وہاں بتا دینا کہ شہزادی کی گود جبراً اجاڑ دی گئی اور ترک قوم کی مہار ایک نابالغ بچے کے ہاتھوں میں تھما دی گئی ہے۔ غیرت مند مسیحی چاہیں تو باہم متحد ہو کر اپنی سابقہ بے عزتیوں کا بدلہ لے سکتے ہیں۔ ایسے موقع بار بار

نہیں ملتے۔"

اینجل نے شہزادی کے کسے ہوئے جسم پر لباس کی سلوٹوں کے نیچے نشیب و فراز کو دیکھنے کی کوشش تو کی لیکن انہیں ایک جھلک سے زیادہ نہیں دیکھ سکا۔ اس وقت وہ اپنی قسمت پر نازاں تھا کہ اتفاق اور وقت کے ہاتھوں اسے یہ شرف حاصل ہو گیا کہ شہزادی کی خلوت اور رات کی تاریکی میں اسے شہزادی کا قرب ملا اور باتیں کرنے کی آزادی ہاتھ آ گئی۔ اس نے شہزادی سے سوال کیا۔ "محترم شہزادی صاحبہ! کیا آپ کو سرویا نہیں یاد آتا؟"

شہزادی نے جواب دیا۔ "یاد کیوں نہیں آتا لیکن یاد آنے سے کیا ہوتا ہے، میں وہاں پہنچ تو نہیں سکتی۔"

اینجل نے کہا۔ "ذرا ہمت کی ضرورت ہے۔ میں آپ کو سرویا پہنچانے کی ذمہ داری قبول کر سکتا ہوں۔"

شہزادی نے کہا۔ "ہاں، لیکن بذاتِ خود میں چوری سے بھاگنا پسند نہیں کرتی۔"

اینجل کسی سوچ میں پڑ گیا۔ وہ بار بار شہزادی کو دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا. کمرے کی اشیاء اور شہزادی کے معطر لباس کی بھینی بھینی خوشبو اینجل کی آتشِ شوق کو بھڑکائے دے رہی تھی۔ اس نے اپنا سر پکڑ لیا۔

شہزادی نے کہا۔ "سرویا والوں سے کہنا کہ ان کی بیٹیوں کا ایک قرض ان کے ذمے واجب الادا چلا آ رہا ہے، اب وقت آ گیا ہے کہ وہ یہ قرض اتار دیں۔"

اینجل نے نظریں شہزادی کی طرف اٹھا دیں، بولا۔ "لیکن شہزادی۔"

شہزادی نے بات کاٹ دی۔ بولی۔ "وہ قرض یہ ہے کہ اب تک فاتح ترکوں کو انہوں نے اپنی لڑکیاں دی ہیں لیکن اب وقت آ گیا ہے کہ وہ ترکوں کی لڑکیاں اپنے گھروں میں لے جائیں۔"

اینجل نے شہزادی کے سرخ و سفید رخساروں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "آخر سرویا والوں نے ان سرخ و سفید رخساروں کو ترکوں کے بوڑھے سلطان کے حوالے کیوں کر دیا، ایک ایسا شخص، جس کے جسم سے کافور کی بو آ رہی تھی ان گلاب کے پھولوں جیسے رخساروں کا کس طرح حقدار ٹھہر سکتا تھا۔

شہزادی خفگی سے بولی۔ "تم پھر بہکنے لگے۔ ہوش میں آؤ اینجل اور سوچو کہ تم کس سے مخاطب ہو؟"

اینجل نے کہا۔ "اور یہ پنکھڑیوں جیسے لبِ لعلیں، سرویا والوں نے ان کا بھی کوئی خیال نہ کیا؟"

شہزادی نے ڈپٹ کر کہا۔ "اگر تم نے اپنی بات چیت کا موضوع نہ بدلا تو یقین کرو کہ میں تمہیں یہاں سے اسی وقت نکال باہر کر دوں گی۔"

اینجل اتنا وارفتہ ہو رہا تھا کہ عقل کی مصلحت بینی مغلوب ہو گئی تھی۔ اس نے عالم سرشاری میں کہا۔ "میری یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ شہزادی صاحبہ جب آپ خود سرویا جانے پر آمادہ نہیں تو پھر میں کیوں جا رہا ہوں!"

شہزادی اینجل کی باتوں سے خوف زدہ ہو رہی تھی پوچھا۔ "کیا تم نے میری باتیں سن لیں؟"

اینجل نے جواب دیا۔ "سن لیں لیکن بدقسمتی سے وہ سب یاد نہیں رہا۔"

شہزادی نے ایک بار پھر اپنی سابقہ باتیں دہرا دیں لیکن اینجل شاید پھر نہیں سن سکا تھا۔

شہزادی کھڑی ہو گئی، بولی۔ "میں تالی بجا کر سردار خاتون کو بلاتے لیتی ہوں تا کہ وہ تمہیں بحفاظت باہر پہنچا دے۔"

"ابھی نہیں شہزادی صاحبہ ابھی نہیں!" اینجل بچوں کی طرح گڑگڑانے لگا۔ "میں ابھی یہاں سے نہیں جاؤں گا۔"

شہزادی نے جواب دیا۔ "تب پھر تم ہوش میں رہ کر باتیں کرو میں تمہارا یہ طرزِ تخاطب برداشت نہیں کر سکتی۔"

اینجل نے عاجزی سے کہا۔ "اچھا اب میں خیال رکھوں گا اور احتیاط سے کام لوں گا!"

شہزادی نے اپنا پیغام پھر سے سنا دیا۔ اینجل بغور سنتا رہا اس کے بعد بے ساختہ بول اٹھا۔ "کیسا پیارا پیغام ہے سرویا والوں کے لئے۔ خدا کی قسم میں آپ کا یہ پیغام سرویا والوں کے گھروں پر دستکیں دے دے کر پہنچا دوں گا آپ مطمئن رہیں۔"

"اور میری حکومت سے کہنا۔ شہزادی کو اگر لے جانا چاہتے ہو تو فاتح بن کر آؤ اور باعزت طریقے سے لے جاؤ۔"

اینجل نے کہا۔ "شہزادی صاحبہ! آپ کو ایک اعلان کر دینا چاہیئے!"

"کیسا اعلان؟ کس لئے اور کہاں؟"

اینجل نے جواب دیا۔ "آپ کسی طرح بھی اگر یہ اعلان کرا دیں کہ جو ترکوں کے بادشاہ کو قتل کر دے گا آپ اسے اپنے شوہر کے طور پر قبول کر لیں گی۔"

شہزادی نے ترش روئی سے کہا۔ "اینجل! تمہاری باتیں میرے لئے اب بالکل ناقابل برداشت ہوتی جا رہی ہیں۔"

اینجل نے والہانہ انداز میں کہا۔ "اور شاید وہ شخص میں خود ہوں گا جو ترکوں کے نوجوان بادشاہ کو اپنے ہاتھ سے قتل کر دے گا" پھر شہزادی کی طرف اپنا سیدھا ہاتھ بڑھا دیا۔ "لائیے اپنا ہاتھ لائیے اور مجھ سے یہ وعدہ کیجئے کہ اگر میں ترکوں کے بادشاہ کا کام تمام کر دوں گا تو آپ مجھے اپنی پرستاری میں قبول فرما لیں گی۔"

شہزادی نے کہا۔ "میں نہ تو اس نوع کا کوئی اعلان کروں گی اور نہ کوئی عہد و پیمان، تم خواہ مخواہ بہک رہے ہو۔"

اینجل دیوانہ وار کرسی سے اٹھا اور شہزادی کے قدموں میں بیٹھ گیا۔ بولا۔ "میں زندگی بھر ان قدموں میں رہ سکتا ہوں۔" اس نے شہزادی کا داہنا پیر پکڑ لیا۔ شہزادی نے اسے چھڑا لیا اور کھڑی ہو گئی، پھر کچھ سوچ کر بولی۔ "اینجل! میں ابھی آتی ہوں، تم میرا انتظار کرو۔"

وہ چلی گئی اور اینجل زمین پر بیٹھا اس کی راہ تکنے لگا۔ وہ کافی دیر تک شہزادی کا منتظر رہا لیکن وہ واپس نہیں آئی۔ اسے کیا پتہ تھا کہ شہزادی اس کی دیوانگی سے خوفزدہ ہو کر اپنی خواب گاہ میں چلی گئی تھی، اور وہیں دروازہ بند کر کے پڑ رہی تھی۔ کافی دیر بعد سردار خاتون نے اینجل کو تھپکی دی اور کہا۔ "سرزمین محافظ! وقت پورا ہو چکا، اب میرے ساتھ واپس چلو۔"

اینجل نے پوچھا۔ "لیکن شہزادی کہاں ہے؟"

"اپنی خواب گاہ میں۔"

"لیکن میں ان سے ملے بغیر ہرگز نہ جاؤں گا۔"

"تم پچھتاؤ گے، اس وقت وہ آرام فرما رہی ہیں، انہیں بیدار نہیں کیا جا سکتا۔"

اینجل نے اصرار کیا۔ "کچھ بھی ہو۔ میں ان سے ملے بغیر ایک قدم بھی نہ اٹھاؤں گا، انہوں نے واپس آنے کا وعدہ کیا ہے۔"

سردار خاتون نے کہا۔ "میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے خواہ مخواہ اپنا اور میرا وقت نہ ضائع کرو۔"

اینجل نے بدرجۂ مجبوری کھڑے ہوتے ہوتے کہا۔ "اس وقت چلا تو چلوں گا لیکن تم اپنی شہزادی سے کہہ دینا کہ انہوں نے مجھ سے غلط وعدہ کر کے کچھ اچھا نہیں کیا۔"

"کہہ دوں گی۔" سردار خاتون نے تسلی دی۔

اینجل اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ جب وہ محل سے باہر نکل گیا تو سردار خاتون کی جان میں جان آئی۔

* * *

اینجل نے شاہی خزانے سے سفر خرچ لیا اور اپنے وطن روانہ ہو گیا۔ اسے راستے بھر یہ دکھ دھیمی دھیمی آنچ کی طرح جھلساتا رہا کہ شہزادی نے اس کی قدر نہیں کی اور آخری ملاقات میں اسے دھوکا دیا۔

دوسری طرف شہزادی کو اینجل کی سرشوری بہت پسند آئی لیکن وہ جس مقدس مقام پر رہی تھی وہاں اس قسم کی سرشوری دونوں ہی کے لئے خطرناک ثابت ہو سکتی تھی۔ اس نے اینجل کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ نہ رکھنے کے باوجود دل میں یہ عہد کر لیا تھا کہ اگر اینجل نے واقعی یہ کارنامہ انجام دے دیا تو وہ اسے ضرور قبول کر لے گی۔

اینجل کے دل میں تو آگ لگی تھی۔ اس نے سردیا پہنچ کر باقاعدہ ایک تحریک چلائی اور سردیا کی شہزادی کے بچے کے قتل کا قصہ خوب نمک مرچ لگا کر لوگوں کو سنانا شروع کر دیا۔ لوگ اس کی باتوں اور تقریروں سے بہت متاثر ہوتے، پھر وہ قسطنطنیہ چلا آیا اور یہاں کے مسیحی حکمراں کو بھی خوب خوب ورغلایا اور اسے یقین دلایا کہ ترکوں کی عظیم طاقت پر بھرپور ضرب لگانے کا اس سے بہتر موقع پھر کبھی بھی نہ ملے گا۔ اس نے یہاں بھی بچے کے قتل کا واقعہ بڑے پراثر انداز میں سنایا۔ قسطنطنیہ کے فرماں روا قسطنطین نے کہا۔ "اگر یہ بات ہے تو میں یہ موقع ہرگز اپنے ہاتھ سے نہیں جانے دوں گا۔"

اینجل نے پُرمسرت لہجے میں کہا۔ "اس مہم میں میں کس طرح مفید ثابت ہو سکتا ہوں اس کا فیصلہ آپ لوگ خود فرمائیں گے، مجھے جلد از جلد میری خدمات سے آگاہ فرما دیا جائے تاکہ میں اپنا کام شروع کر دوں۔"

قسطنطین نے کہا "تم ترکوں میں واپس جاؤ، نا تجربے کار نئے سلطان نے تم پر اعتبار کیا ہے اور غالباً اس کا یہ اعتبار ہمیں بہت زیادہ فائدہ پہنچا سکتا ہے۔ کیا تم اس پر تیار ہو کہ نئے سلطان کی ملازمت میں واپس جاؤ اور وہاں میری ہدایات کے منتظر رہو۔"

اینجل بھی یہی چاہتا تھا اس نے قسطنطین کا شکریہ ادا کیا اور وہاں سے اٹھ کر سینٹ ایا صوفیہ چلا گیا۔ یہ مشہور زمانہ گرجا برسہا برس سے زائرین کی توجہ کا مرکز بنا ہوا تھا۔ یہ دیر تک یہاں گھومتا پھرتا رہا۔ یہاں لوگوں نے اس سے ترکوں کے بارے میں بہت سارے سوالات کر ڈالے اور آخر میں پوچھا "کیا ترک یہاں آنے کا ارادہ بھی رکھتے ہیں؟"

اینجل نے جواب دیا "ترک تمہیں ذلیل اور کمزور سمجھتے ہیں، وہ ایک قسطنطنیہ تو کیا پوری مسیحی دنیا کو تباہ و برباد کر دینا چاہتے ہیں۔ کیا تم ان کا مقابلہ کر سکتے ہو؟"

لوگوں نے خوف سے اپنے اپنے کانوں پر ہاتھ رکھ لئے اور خدا کی پناہ مانگنے لگے۔

اینجل سرویا پھر واپس گیا اور وہاں کے حکمران کو یہ خوشخبری سنائی کہ قسطنطین نے عثمانیوں پر تباہ کن ضرب لگانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔

سرویا کے بوڑھے حکمران نے پوچھا "تیرے ذمے بھی کوئی خدمت کی گئی یا نہیں؟"

اینجل نے جواب دیا "مجھے حکم ملا ہے کہ میں ترکوں میں واپس جاؤں اور قسطنطین کی ہدایتوں اور اشاروں پر کام کرتا رہوں۔" پھر ذرا دیر چپ رہ کر بولا "حالانکہ یہ کام بڑے جان جوکھوں کا ہے اور میں کسی وقت بھی قتل کیا جا سکتا ہوں۔"

سرویا کے حکمران نے کہا "میں بھی یہی چاہتا تھا کہ تم اڈریانوپل واپس جاؤ اور ہم سب کے لئے کوئی بڑا کام انجام دو۔ اور پھر یہ کہ میری غمزدہ بیٹی اب بھی وہیں رہ رہی ہے اور اسے ایک ایسے شخص کی کمی ہمیشہ ہی محسوس ہوگی، جو اس کا ہم مذہب اور ہمدرد ہو، اور تم میں یہ دونوں خوبیاں موجود ہیں۔"

اینجل نے تشویشناک لہجے میں کہا "اب میں محض شہزادی کے لئے اڈریانوپل جاؤں گا اور وہاں میں یا تو کوئی بڑا کارنامہ انجام دے دوں گا یا پھر اپنے ہزاروں ساتھیوں کی طرح مُردوں میں دب کر ہمیشہ کے لئے اپنا منہ چھپا لوں گا۔"

اس روز شام کو شاہ سرویا نے اینجل کے اعزاز میں ایک شاندار دعوت دی۔ اس ضیافت کی سب سے زیادہ شاندار یہ بات تھی کہ اس میں اینجل کے علاوہ باہر کے کسی بھی آدمی کو مدعو نہیں کیا گیا تھا۔ کھانے کی لمبی میز کے چاروں طرف سرویا کے حکمران کا خاندان بیٹھ گیا۔ اس میں عورتیں مرد اور بچے سبھی شامل تھے۔ اس موقع پر سرویا کے حکمران نے اینجل کا اہل خاندان سے تعارف کرایا۔ ابھی تعارف جاری ہی تھا کہ ایک نوجوان لڑکی بھاگتی ہوئی آئی اور میز کے گرد رکھی ہوئی کرسیوں میں خالی جگہ تلاش کرنے لگی۔ اینجل کے برابر کی کرسی خالی تھی۔ وہ بے تکلف اسی پر بیٹھ گئی۔ شاہ سرویا نے اس لڑکی کی طرف ہنستے ہوئے اشارہ کیا "اور یہ میری سب سے چھوٹی بیٹی ہیلن ہے نہایت شوخ حد درجہ شریر، یہ خود وقت کی پابند نہیں ہے بلکہ وقت کو اپنا پابند بنانے کی کوشش کرتی ہے یہ میری بیٹی ماریہ سے چار سال چھوٹی ہے، وہی ماریہ جو اس وقت بھی ترکوں میں پھنسی افسوسناک اور پر اذیت زندگی گزار رہی ہے۔"

اینجل تو اسے دیکھ کر پہلی ہی نظر میں چونک گیا تھا۔ یہ بالکل ماریہ تھی، ویسی ہی پیشانی، اسی کی طرح زلفیں، ناک، کان، ہاتھ، پیر چال ڈھال، غرضیکہ کسی بات میں بھی دونوں میں کوئی نمایاں فرق نہیں تھا، بس فرق صرف اتنا تھا کہ ماریہ کو غموں کے دباؤ نے کچھ اداس اور سوگوار بنا دیا تھا۔ اور اس کے برعکس ہیلن میں تیزی، چستی اور پھرتی پائی جاتی تھی، اس کے کانوں میں پڑے ہوئے آویزوں میں دو گول گول قیمتی موتی لٹک رہے تھے اور ان میں اتنی چمک تھی کہ رخساروں کی آب و رنگ کو اس میں دیکھا جا سکتا تھا۔ اسے دیکھ کر اینجل کا دل دھک دھک کرنے لگا۔

ہیلن نے شوخی سے کہا "کیوں جناب آپ وہاں سے اکیلے ہی بھاگ کھڑے ہوئے حالانکہ وہاں ابھی تک میری بہن ماریہ موجود ہیں۔ انہیں یقیناً تمہاری ضرورت ہوگی۔"

اینجل نے جواب دیا "ہیلن تمہارا یہ خیال غلط ہے کہ میں تمہاری قابل عزت بہن ماریہ کو تنہا چھوڑ کر بھاگ کھڑا ہوا ہوں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ میں یہاں ایک خاص مقصد سے آیا ہوں، جس سے تمہارے والد خوب اچھی طرح واقف ہیں۔"

شاہ سرویا نے شرمندگی سے کہا "معزز مہمان! تم اس نادان اور شریر لڑکی کی باتوں کا خیال نہ کرنا۔ ابھی اسے اپنی زبان کے صحیح مصرف کا علم نہیں ہے۔"

اینجل نے ہنستے ہوئے کہا "جناب والا! اب میں اتنا ناسمجھ بھی نہیں کہ شہزادی

ہیلن کی معصومانہ باتوں کا بُرا مان جاؤں!"

ہیلن رُوٹھ گئی اور ہونٹ لٹکا کر بیٹھ گئی۔ سردیا کے حکمران نے مسکراتے ہوئے کہا۔"یہ روٹھتی بھی بہت جلد ہے، یہ اتنی زیادہ حساس اور نازک طبع واقع ہوئی ہے کہ اپنے خلاف ایک لفظ بھی سُننا گوارا نہیں کرتی۔"

ہیلن کھانا کھائے بغیر ہی اٹھ کر چلی گئی، اس کا باپ اسے پکارتا ہی رہ گیا لیکن وہ واپس نہیں آئی۔ اِس واقعے نے کھانے میں بدمزگی پیدا کر دی۔ سردیا کے حکمران نے افسردگی سے کہا۔"حضرات! آپ سب کھانا شروع کر دیں۔ ہیلن بعد میں کھا لے گی، اسے شاید کھانے کی زیادہ اشتہا نہیں ہے۔"

ان سب نے کھانے کا آغاز تو کر دیا لیکن ان میں سے کسی ایک میں بھی پہلی جیسی سرگرمی اور جوش و خروش نہیں پایا جاتا تھا۔

اینجل نے شرمندگی سے کہا۔"افسوس کہ میری وجہ سے شہزادی ہیلن یہاں سے چلی گئیں، مجھ پر تو یہ فرض عائد ہوتا تھا کہ میں انہیں جاتے دیکھ کر روک لیتا اور کھانا کھائے بغیر ہرگز نہ جانے دیتا۔"

شاہ سردیا نے نوالہ منہ میں رکھتے ہوئے حاضرین طعام سے کہا۔"صاحبان کھانا شروع کر دیجئے کیونکہ کھانے کا وقت ہو چکا ہے اور اب صبر کی کوئی گنجائش نہیں رہی۔"

سبھی نے سردیا کے حکمران کی اتباع میں کھانا شروع کر دیا۔

اس کے بعد اینجل ہیلن کی تاک میں رہا، لیکن وہ کہیں نظر نہ آئی جیسے جیسے اس کی واپسی کا دن قریب آ رہا تھا، وہ پریشان ہو رہا تھا اس کا دل نہیں چاہ رہا تھا کہ واپس جائے لیکن جانا بھی بہت ضروری تھا۔ اس نے اکثر ہیلن اور ماریہ کو ایک ساتھ کھڑا کر کے یہ اندازہ لگانا چاہا کہ اسے کون زیادہ اچھی لگتی ہے تو یہی جواب ملا کہ ہیلن کی بات ہی کچھ اور ہے ماریہ کی طرف سے اس کا دل ہٹتا چلا گیا۔ اور انہی خیالوں میں جب اسے ماریہ کا وہ رات والا سلوک یاد آیا، جب وہ اسے تنہا چھوڑ کر اپنی خوابگاہ میں چلی گئی تھی تو ماریہ پر بڑا غصہ آیا اور اس نے یہ فیصلہ کیا کہ کچھ بھی ہو، ماریہ کی اِس بد اخلاقی کی اسے سزا ضرور دی جائے گی۔

واپسی سے ایک دن پہلے سردیا کے حکمران نے اینجل کو شاہی باغیچے میں طلب کیا۔ یہاں وہ ایک بارہ دری میں بیٹھا چند سرکاری کاغذات کا مطالعہ کر رہا تھا۔ اس کے

سامنے ایک وسیع و عریض حوض میں فوارے چھوٹ رہے تھے اور حوض کے تین طرف پھول دار درخت جھوم رہے تھے ان کی شاخیں، مختلف رنگ اور قسم کے پھولوں سے لدی ہوئی تھیں، اور ان میں سے بعض پر چھوٹی چھوٹی چڑیاں پھدک رہی تھیں، پھولوں پر تتلیاں تھرک رہی تھیں اور یہ رنگ برنگی خوشنما تتلیاں جب پھولوں پر بیٹھ جاتیں تو یہ خود بھی پھول ہی معلوم دینے لگتیں۔

اینجل بادشاہ کے روبرو ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔ بادشاہ نے اسے ایک نگاہِ غلط انداز سے دیکھا اور کہا۔"میں ابھی بات کرتا ہوں بس چند سطریں پڑھ لوں۔"

اینجل نے جواب دیا۔"بندہ اس وقت تک مودب کھڑا رہے گا جب تک حضور والا اپنے نہایت اہم اور قیمتی مشغلے سے فارغ نہیں ہو جاتے۔"

بادشاہ نے کہا۔"اگر تم پسند کرو تو حوض کے قریب یا پھول دار درختوں کی روشوں میں چل پھر کر اپنی مشامِ جاں کو ترو تازہ کر لو، میں اپنے کام سے فارغ ہوتے ہی تمہیں بُلا لوں گا۔"

اینجل نے کہا۔"بہتر ہے۔"

اور حوض کے پاس چلا گیا۔ پھر یہاں سے گل پوش روشوں میں داخل ہو گیا۔ خوبصورت تتلیاں اس کے کپڑوں سے ٹکرا ٹکرا کر پھولوں کی طرف جانے لگیں۔ اِدھر اُدھر شاہی خدام موجود تھے۔ ایک لمبی ناک اور چھوٹے کانوں والا گربا خدمت گار اس کے پاس آیا اور پوچھا۔"کیا تم نے بادشاہ سے ملاقات کر لی؟"

اینجل نے جواب دیا۔"ایک بار مل چکا ہوں، دوبارہ پھر ملنا ہے۔ کیوں؟"

خدمت گار نے جواب دیا۔"واپسی میں شہزادی ہیلن سے ضرور مِل لینا۔ وہ یہاں کے صدر دروازے سے ملحقہ سبزہ زار پر تمہارا انتظار کر رہی ہیں۔"

اینجل کی خوشی کی حد نہ رہی۔ اس کے جی میں آئی کہ وہ اسی وقت بھاگ کر ہیلن کے پاس پہنچ جائے لیکن سردیا کے بادشاہ کا خوف غالب آیا اور اس نے پوچھا۔"لیکن خدمت گار تم مجھے ایک بات تو بتاؤ۔"

خدمت گار نے پوچھا۔"وہ کیا؟ پوچھو!"

اینجل نے جواب دیا۔"شہزادی مجھ سے چوری چھپے مل رہی ہے یا اس کی اپنے باپ سے اجازت لے لی ہے؟"

خدمت گار نے کہا۔"یہ سب میں نہیں جانتا، شہزادی سے یہ باتیں ہم لوگ

کس طرح پوچھ سکتے ہیں؟"

اینجل نے کہا "پھر اس طرح اس سے ملنے میں مجھ پر کوئی افتاد تو نہیں نازل ہو گی؟"

خدمت گار نے چڑ کر کہا "میرے ذمے یہ کام تھا کہ شہزادی کا پیغام تم تک پہنچا دوں، سو پہنچا دیا۔ اس کے سوا تمہاری کسی بات کا بھی میرے پاس کوئی جواب نہیں۔"

اینجل نے جلدی جلدی کہا "لیکن سنو تو، جناب ایک بات اور ــ"

خدمت گار نے اس کی بات کاٹ دی، ایک طرف جاتا ہوا بولا "اب میں یہاں نہیں ٹھہر سکتا۔ بادشاہ سلامت اسی طرف تشریف لا رہے ہیں۔ تم شہزادی سے مل ضرور لینا۔"

اینجل نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو واقعی شاہ سرویا اس کے قریب آ چکا تھا۔ وہ سنبھل کر کھڑا ہو گیا۔ بادشاہ کے جوتوں کی آواز قریب سے قریب تر آتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ بادشاہ اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ "ہاں تو اے میرے عزیز!" بادشاہ نے اسے مخاطب کیا۔ "کل تم واپس چلے جاؤ گے؟"

اینجل نے جواب دیا "جی حضورِ والا! ورنہ جیسا حکم ہو۔ خادم اس کی بجا آوری میں فخر و انبساط محسوس کرے گا۔"

بادشاہ نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اسے دباتا ہوا بولا "اینجل! تم جانتے ہو کہ دشمنوں سے جنگیں کئی طرح لڑی جاتی ہیں۔ ایک طریقۂ جنگ تو یہ ہے کہ دشمن کا کھلے میدان میں مردانہ وار مقابلہ کیا جائے دوسرا طریقہ ہے کہ اسے غافل رکھ کر شب خون مار دیا جائے اور تیسرا طریقہ ــ" یہ کہتے کہتے بادشاہ نے اپنے گرد و پیش کا جائزہ لیا اور پوچھا "ہمارے آس پاس کوئی موجود تو نہیں ہے؟" پھر خود ہی جواب دیا "شاید نہیں۔ ہاں تو میں تیسرے طریقے کی بات کر رہا تھا۔ جب دشمن ناقابلِ شکست ہو اور دونوں طریقے ناقابلِ اختیار ہوں تب پھر ہم میں سے کسی ایک جواں مرد کو اپنی جان خطرے میں ڈال کر تیسرے طریقے پر عمل کرنا چاہیئے۔ وہ دشمن کی سب سے بڑی شخصیت کو اعتماد میں لے کر دھوکے سے ہلاک کر دے اور خود فرار ہو کر اپنوں میں آ پہنچ جائے۔"

اتنا کہہ کر بادشاہ اینجل کی صورت دیکھنے لگا۔ وہ اس کی اندرونی کیفیت کا پتہ چلانا چاہتا تھا۔

اینجل نے پوچھا "کیا حضورِ والا یہ چاہتے ہیں کہ میں نوجوان سلطان محمد کو دھوکے

سے ہلاک کر کے سرویا واپس آ جاؤں؟"

"ہاں" بادشاہ نے کہا "اس کے علاوہ میری باتوں کا دوسرا کوئی مطلب نہیں۔ تم شاید نہیں جانتے کہ دشمن کے سب سے بڑے آدمی کے تنہا مار دیئے جانے سے آدھی فتح حاصل ہو جاتی ہے۔"

اینجل خاموش ہو گیا۔ اس کا ذہن تیزی سے مصروفِ عمل تھا۔

بادشاہ نے اسے بہت زیادہ سوچنے بھی نہ دیا۔ بولا "میں نے تجھے اپنا عزیز کہا ہے، کیونکہ میں جانتا ہوں کہ تیرا نسب نامہ بہت اچھا ہے اور تجھ سے رشتہ قائم کر لینے میں عار نہیں محسوس ہو گی۔"

اینجل کو اِن لفظوں کے معنی میں چھپا ہوا سنہرا مستقبل اس طرح نظر آنے لگا جس طرح بادلوں کی اوٹ سے درخشاں چاند دکھائی دے رہا ہو، اس نے رک رک کر پوچھا "کیا حضورِ والا جو کچھ فرما رہے ہیں، میری کامیابی کے بعد اس پر فی الفور عمل کیا جائے گا؟"

بادشاہ نے کہا "بادشاہ سے سوءِ ظنی جرم ہے ناقابلِ معافی جرم۔"

اینجل نے کہا "تب پھر میں آج ہی روانہ ہو جاؤں گا اور اس ناتجربے کار سلطان کا کام تمام کر کے بہت جلد واپس آ جاؤں گا۔"

"نہیں!" بادشاہ نے کہا "تم کل ہی روانہ ہو گے، اپنا کام پورا کر کے جب تم واپس آؤ گے تو سلطان کا خنجر، پیٹی اور اس کا لباس تم اپنے ساتھ لاؤ گے، سلطان کی ان چیزوں کے عوض تمہیں منہ مانگا انعام عطا کر دیا جائے گا!"

اینجل نے بات صاف کر لینی چاہی، بولا "خادم کی خواہش ہے کہ جب میں سلطان کی مذکورہ بالا چیزیں لے کر حاضر ہو جاؤں تو حضورِ والا مجھے اپنی فرزندی میں قبول فرما لیں۔"

بادشاہ نے گرجدار آواز میں پوچھا "تمہارے ذہن میں کس کا نام ہے؟ تم نے کس کو پسند کیا ہے ماریہ کو یا ہیلن کو؟"

اینجل نے ڈرتے ڈرتے جواب دیا "ہے ہے، ہے لن کو!"

بادشاہ نے کہا "تم ہیلن کے بدلے دولت کیوں نہیں مانگ لیتے، جاگیر کیوں نہیں طلب کرتے؟"

"حضورِ والا صرف ہیلن!" وہ بادشاہ کے قدموں میں گھٹنوں کے بل بیٹھ

گیا۔ اور بادشاہ کی پنڈلیوں کو بوسہ دیا۔

بادشاہ نے کہا "اگر ہیلن نے تجھے ناپسند کر دیا تو؟"

اینجل نے کہا۔ "اس معاملے میں ہیلن کی پسند اور مرضی کو اتنا ہی دخل ہونا چاہیئے حضور والا، جتنا دخل شہزادی ماریہ کو بوڑھے سلطان مراد کے قبول کرنے یا نہ کرنے میں تھا۔"

بادشاہ مسکرایا، بولا "تو اب تم خود کو مراد ثانی جتنا بڑا آدمی سمجھنے لگے ہو، خوب خوب! اچھا ابھی میں خود ہیلن سے بھی بات کروں گا تم کل روانگی سے پہلے مجھ سے اس کا جواب لے لینا۔"

اینجل نے بادشاہ کی پنڈلی کو ایک نمود دار بوسہ دیا اور بادشاہ نے اسے پکڑ کر اٹھا لیا، اور کہا "اب تم جا سکتے ہو۔"

جب اینجل جانے لگا تو بادشاہ نے کہا۔ "ہیلن صدر دروازے سے ملحقہ سبزہ زار پر خود بھی موجود ہے تم اس سے بات کر کے جانا اور اندازہ لگانے کی کوشش کرنا کہ کس حد تک وہ تمہاری ہم خیال ہے!"

اینجل کی خوشی کی انتہا نہ رہی، خدا اور قسمت، اس پر شاید دونوں ہی مہربان تھے۔ وہ فرط خوشی میں اس سبزہ زار کی طرف بڑھا جہاں ہیلن اس کا انتظار کر رہی تھی۔

★ ★ ★

کئی خدمت گار خواتین کی نگرانی میں اینجل ہیلن کے پاس پہنچ گیا۔ خریسہ ہیلن اسے دیکھ کر مسکرادی، شوخی سے سوال کیا۔ "کیا تم نے واقعی ینی چری سردار کے پیٹ میں اپنی تلوار کی نوک چبھو دی تھی؟"

اینجل نے جواب دیا۔ "حضور شہزادی صاحبہ جب اپنی بڑی بہن سے ملاقات فرمائیں گی تو وہ میرے اس بیان کی تصدیق فرما دیں گی۔"

ہیلن نے لاپرواہی سے کہا۔ "مجھے یقین نہیں آتا۔"

"یقین نہ کرنے کی کوئی خاص وجہ؟"

ہیلن نے خدمت گار کنیزوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "عورتوں کا محاصرہ تو توڑ نہیں سکے، پھر بہادر مردوں سے تم کیا خاک مقابلہ کرو گے؟"

اینجل ہیلن کے اس لطیف مذاق سے بہت خوش ہوا۔ بولا۔ "میں شہزادی ہیلن

کا شکر گزار ہوں کہ مجھ سے مذاق فرما کر لطف اندوز ہو رہی ہیں۔"

ہیلن نے کہا۔ "تم نے ترکوں کے نوجوان سلطان محمد خان کو دیکھا ہے؟"

اینجل نے جواب دیا۔ "صرف دیکھا ہی نہیں، اس سے بات چیت بھی کی ہے۔ میں نے اسے اتنا ہی قریب سے دیکھا ہے جتنا قریب شہزادی ہیلن کو دیکھ رہا ہوں۔"

ہیلن نے پوچھا۔ "اس کی شکل و صورت کیسی ہے؟"

اینجل نے جواب دیا۔ "اس کی شکل و صورت پوچھ کر کیا کیجئے گا، بہرحال اگر آپ اس کی شکل و صورت جاننا ہی چاہتی ہیں تو سن لیجئے، سلطان کے چہرے پر دونوں سرخ و سپید رخسار اتنے ابھرے ہوتے ہیں کہ دیکھنے والے کی نظر ان پر ہی جم کر رہ جاتی ہے۔ ناک اونچی مگر آگے سے جھکی ہوئی ہے اس کی مونچھیں دونوں رخساروں پر اس طرح اٹھی رہتی ہیں گویا گلاب کی کلی کی دو پتیاں رکھ دی گئی ہوں۔ سلطان کی داڑھی کے بال ذرا سخت ہیں اور طلائی تار کی طرح نظر آتے ہیں۔"

ہیلن نے پوچھا۔ "سلطان کچھ پڑھا لکھا بھی ہے؟"

"پڑھا لکھا؟" اینجل نے جواب دیا۔ "اجی جناب اس نو عمری کے باوجود وہ پانچ زبانیں جانتا ہے۔ عربی، فارسی، عبرانی، لاطینی اور یونانی ان پانچوں زبانوں میں وہ کسی مترجم کی مدد کے بغیر باتیں کرتا ہے۔"

ہیلن نے کہا۔ "خوب، اب تم یہ بتاؤ کہ کیا سلطان ہم عیسائیوں کی متحدہ قوت کا مقابلہ کرلے گا؟"

اینجل نے جواب دیا۔ "شاید نہیں!" اس نے شہزادی کی کیف آور آنکھوں میں اپنا چہرہ دیکھا، بولا۔ "شہزادی! میں اور کچھ تو جانتا نہیں، بس یہ جانتا ہوں کہ اب جب میں ترکوں کے پاس سے واپس آؤں گا تو میرے سامان میں ترکوں کے نوجوان بادشاہ کا خنجر، اس کی پیٹی اور اس کا لباس بھی شامل ہوگا۔ کیونکہ آپ کے والد نے مجھ سے وعدہ کرلیا ہے کہ اس کے بعد میں ہر وقت آپ کی خدمت میں حاضر رہ سکوں گا!"

ہیلن نے جستجو کی، پوچھا۔ "کیا تم ترکوں کے سلطان کی یہ چیزیں چوری کر کے لے آؤ گے؟"

اینجل کا چہرہ غصے اور شرم سے سرخ ہو گیا۔ بولا۔ "بخدا شہزادی صاحبہ! اگر یہی کلمات کسی مرد کی زبان سے نکلتے تو اس وقت میں اس کے دو ٹکڑے کر چکا ہوتا۔ میں ترکوں کے سلطان کا مقابلہ کر کے اسے زیر کرلوں گا، اور اس کے بعد ایک فاتح کی حیثیت سے اس

کی ان چیزوں پر قبضہ کر لوں گا!"

"خوب! خوب!" ہیلن زور زور سے ہنسنے لگی "اے کاش اس جگہ میں خود بھی موجود ہوتی!"

اینجل خوب سمجھ رہا تھا کہ شہزادی اس کا مذاق اڑا رہی ہے اسے غصّہ بھی آرہا تھا لیکن وہ سوائے ضبط اور برداشت کے کر بھی کیا سکتا تھا۔ بولا "آپ اس وقت تک میری باتوں کا یقین نہیں کریں گی جب تک کہ میں یہ غیر معمولی کارنامہ انجام دے کر دوبارہ آپ کی خدمت میں نہ آجاؤں۔"

شہزادی نے اینجل کی مونچھوں کی طرف اشارہ کرتے ہوتے کہا۔ "انہیں تم ترکوں کے سلطان کی طرح اوپر اتنا زیادہ اٹھالو کہ ان کی دونوں نوکیں نچلی پلکوں سے ٹکرانے لگیں!"

اینجل نے خفت سے پوچھا۔ "ان کا فائدہ؟"

ہیلن نے جواب دیا۔ "ان کا فائدہ یہ ہے کہ یہ سلطان کی مونچھوں سے بڑھ جائیں گی۔"

وہ پھر زور زور سے ہنسنے لگی۔ اینجل کو ہیلن سے زیادہ ان عورتوں سے شرم آرہی تھی جو موت کے فرشتوں کی طرح اس کے سر پر سوار تھیں۔ اس نے ہیلن کو خوب اچھی طرح دیکھ لیا۔ اور اس نتیجے پر پہنچا کہ اس کے لئے زندگی کو داؤں پر لگایا جا سکتا ہے۔ اس کی پتلی پتلی مخروطی انگلیاں بتا رہی تھیں کہ شہزادی میں شاعرانہ صلاحیتیں بہت زیادہ پائی جاتی ہیں۔ اس کا چہرہ ایسا تھا کہ کوئی مصوّر اگر دیکھ لیتا تو زندگی بھر اس کی شبیہہ بنا رہتا۔ آنکھیں اتنی پرکشش اور خواب آگیں تھیں کہ ان سے زیادہ پرکشش اور مخمور ہونے کا خیال بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ مدوّر اور بتدریج گولائی میں مختصر ہوتی ہوئی پنڈلیوں پر بال اُگے ہوتے تھے۔ سفید پنڈلیوں پر کالے کالے بال کسی مرد کے پیر دکھائی دیتے تھے اور بظاہر یہ ایک عیب تھا۔ لیکن اینجل کو ان میں بھی حسن ہی کی جھلک دکھائی دی۔

ہیلن نے پوچھا۔ "تم دیکھ کیا رہے ہو؟ اور کیا سوچ رہے ہو؟"

اینجل نے جواب دیا۔ "اس صانع کی کاریگری پر غور کر رہا ہوں جو مادّے اور روح کے امتزاج سے آپ جیسی حسین ترین ہستی کو تخلیق کر دیتا ہے میری عقل حیران ہے کہ آپ کے کس کس عضو کی تعریف کرے، جسم کے کس کس حصّے کے حسن کی ثنا خوانی کرے!"

سر پر مسلط کنیزوں نے اسے جھڑک دیا۔ "فضول باتوں میں اپنا وقت مت

ضائع کر۔ اگر گفتگو کے لئے کوئی موضوع نہیں باقی رہا تو اب یہاں سے چلا جا۔"

ہیلن نے کہا۔ "یہ سپاہی سے زیادہ تو شاعر نظر آتا ہے۔ کیا اس کی پُر لطف باتوں میں تمہیں کوئی مزہ نہیں مل رہا؟"

ایک کنیز نے جواب دیا۔ "یہ اپنی حد سے بڑھ رہا ہے۔"

اینجل نے غصّے میں کہا۔ "ابھی تو تُو جتنی باتیں کرنا چاہے کر لے لیکن جب میں ترکوں کے پاس سے واپس آؤں گا تو اس وقت میں اتنا اختیار ضرور حاصل کر چکوں گا کہ تجھے شہزادی کی ملازمت سے نکال باہر کروں۔"

کنیزیں مسکرانے لگیں۔ ہیلن نے کہا۔ "افسوس کہ میں شہزادی ہوں، اگر شہزادی نہ ہوتی تو تمہارے ساتھ چل کر تمہاری بہادری ضرور دیکھتی۔"

اینجل کو سبھی پر غصّہ آرہا تھا۔ اسے بہت افسوس تھا کہ آخر یہ لوگ اس کی بہادری پر یقین کیوں نہیں رکھتے۔

دوسرے دن جب وہ سردیا سے رخصت ہو رہا تھا تو ہیلن بھی اس سے ملنے آئی۔ اس نے ہیلن سے وفورِ جذبات سے پوچھا۔ "کیوں شہزادی صاحبہ! کبھی آپ اس خاکسار کو یاد بھی فرمائیں گی؟"

ہیلن نے جواب دیا۔ "کیوں نہیں۔ جب بھی کوئی بڑ لولا شیخیاں بگھارے گا مجھے تم فوراً یاد آجاؤ گے۔"

کنیزیں کھلکھلا کر ہنس دیں۔

اس وقت ایک اور کنیز بھاگتی ہوئی آئی اور ہیلن کو مطلع کیا۔ "حضور شہزادی صاحبہ! شہزادہ مائیکل تشریف لا رہے ہیں!"

ہیلن نے جواب دیا۔ "انہیں فوراً حاضر کرو!" پھر اینجل سے کہا۔ "اینجل! تم مائیکل سے مل کر یقیناً بہت خوشی محسوس کرو گے، کیونکہ یہ صاحب بھی بزعمِ خود بہت بہادر ہیں اور میری خاطر دنیا کا مشکل ترین کام انجام دینے کو ہر وقت تیار رہتے ہیں!"

اینجل کا حسد سے بُرا حال ہونے لگا۔ اس کا حلق خشک ہو گیا۔ بمشکل پوچھا۔ "مائیکل شہزادہ ہے؟"

ہیلن نے جواب دیا۔ "ہاں، کیونکہ یہ بھی شاہی خاندان ہی کا ایک فرد ہے۔ گو کہ دور کے رشتے ہی کا سہی!"

اسی دوران چند کنیزوں کی معیت میں شہزادہ مائیکل بھی وہیں پہنچ گیا۔ اینجل

نے اسے کنکھیوں سے دیکھنے کی کوشش کی۔ مونچھیں اس کی بھی بڑی بڑی تھیں اور اس کے سر پر ایک اونچا سا ہیٹ رکھا ہوا تھا، ہاتھ میں بید تھا۔ اس بید کے خول میں گپتی پڑی ہوئی تھی۔

مائیکل اینجل کو دیکھ کر بھڑک گیا۔ ہیلن سے پوچھا۔ "یہ جانور شاہی سبزہ زار میں گھاس چرنے کہاں سے آ گیا؟"

اینجل خود کو معزز مہمان تصور کئے ہوئے تھا، ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ "شہزادے کی نگاہ بہت کمزور محسوس ہوتی ہے اور سندرا فاتر العقل بھی دکھائی دیتے ہیں، اگر ان میں یہ دو نقص نہ ہوتے تو یقیناً ایک اچھا خاصا معزز مہمان انہیں جانور نہ نظر آتا!"

مائیکل بھڑک اٹھا، چیخا۔ "گستاخ، بے ادب۔ تو ہے کون؟ اور یہاں کیوں آیا؟"

اینجل نے جواب دیا۔ "یہ سوال تم شہزادی سے کرو۔ ورنہ یوں میری حیثیت بہت جلد تم پر بھی آشکارا ہو جائے گی۔"

مائیکل نے ذرا قریب ہو کر اینجل کی ناک پکڑ لی اور شوخی سے بولا۔ "ادب سے بات کرو نووارد انسان۔ تم مجھے پہچانو۔ اور جب پہچان لو تو مجھے میری حیثیت کے مطابق مخاطب کرو۔"

اینجل نے مائیکل کی ناک پکڑ لی، بولا۔ "میں اگر چاہوں تو تمہاری یہ ناک میں تمہاری ہتھیلی پر رکھ دوں!"

ہیلن اور اس کی کنیزیں اس جھگڑے میں غیر جانبدار رہیں اور مزے لیتی رہیں۔

مائیکل نے اینجل کو دھکا دے کر پیچھے ہٹا دیا۔ اینجل نے مائیکل کے ایک زوردار تھپڑ رسید کر دیا۔ شدت ضرب سے مائیکل دوہرا ہو گیا۔ اینجل نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ "اور دوں یا اتنا ہی کافی ہے؟"

مائیکل نے بید میں سے گپتی نکال لی لیکن اینجل نے اسے حملہ آور ہونے کا موقع نہیں دیا۔ گپتی والے ہاتھ کی کلائی پر ایک ایسی ضرب رسید کی کہ گپتی چھوٹ کر دور جا گری، جسے اینجل نے اٹھا لیا اور زور زور سے ہنسنے لگا۔

مائیکل نے کھسیاہٹ سے کہا۔ "تم مجھ پر خوب اچھی طرح ہنس لو، لیکن یہ مت بھولو کہ اگر یہ بات بڑھ گئی اور فیصلہ ڈوئل تک پہنچ گیا تو تم چٹکی بجاتے رخصت کر دیئے جاؤ گے کیونکہ آج تک میں نے کسی سے شکست نہیں اٹھائی۔"

اینجل نے جواب دیا۔ "تمہیں شکست دینے کے لئے خدا نے مجھے بھیجا ہے دس پانچ دن خوب اچھی طرح کھا پی لو۔ کیونکہ کچھ پتہ نہیں کہ تم کتنی زندگی لکھا کر لائے ہو۔"

مائیکل نے کہا۔ "یہ موقع مبارزت کا نہیں ہے لیکن میں پھر بھی تمہیں ایک موقع مبارزت کا عطا کر دوں گا بشرطیکہ تم نے خود کو مبارز ثابت کر دیا۔"

اینجل نے مائیکل کی بات کا کوئی جواب ہی نہ دیا۔

ہیلن نے چھیڑا۔ "کیوں جناب آپ خاموش کیوں ہو گئے؟"

اینجل نے جواب دیا۔ "اب میرے پاس بولنے کے لئے کچھ رہا ہی نہیں تو بولوں گا کیا۔ لیکن مائیکل میں جتنی خوبیاں یا اعزاز موجود ہیں، میں ان کا بھی مقابلہ کرنے کو تیار ہوں۔"

مائیکل نے بدستور ترش لہجے میں کہا۔ "تم حد سے بڑھ رہے ہو کوشش کرو کہ تمہاری جو حیثیت ہے اس میں کوئی منفی تغیر نہ پیدا ہو جائے!"

اینجل نے باتوں میں مائیکل کو اڑا دینے کی کوشش کی۔ بولا۔ "میری حیثیت میں جو غیر معمولی تغیر رونما ہونے والا ہے اس کی چکا چوند تمہاری بقیہ نظر کو بھی کھا جائے گی۔"

مائیکل نے ہیلن سے شکایت کی۔ "ہیلن! میں یہ ساری باتیں تم سے کہنا چاہتا تھا، یہ جنگلی معلوم نہیں کہاں سے شہروں کی طرف بھاگ کر آ گیا ہے۔ میں اس کے گلے میں لال فیتہ ڈلوا دوں گا جس سے لوگوں کو اس کی اصل حیثیت معلوم ہو جائے گی۔"

اینجل نے جواب دیا۔ "سر دست یہی ارادہ اپنا بھی ہے۔"

ہیلن نے کہا۔ "اچھا جناب! اب آپ دونوں خاموش ہو جائیں!" پھر اینجل سے کہا۔ "تم مائیکل کو وہ شرط بتا دو جس کی تکمیل کے بعد تم میرے حقدار ہو جاؤ گے!"

اینجل سٹ پٹایا لیکن ہیلن کے اصرار پر شرط کی ساری تفصیل بتانا ہی پڑ گئی۔ آخر میں ہیلن سے شکایتاً کہا۔ "افسوس کہ اس بات کو راز ہی میں رہنا تھا لیکن آپ نے اس کا یوں برملا ذکر کر دیا۔"

مائیکل نے تحقیر آمیز لہجے میں کہا۔ "میں کسی شرط ورط کا پابند نہیں ہوں۔ تو اس شرط کو پوری کر کے واپس آ جا اس وقت میں دیکھ لوں گا کہ تو ہیلن کو کس طرح حاصل کرتا ہے!"

ہیلن اینجل کو ایک طرف لئے چلی گئی اور سرگوشی میں کہا۔ "تم اس کی باتوں سے فکر مند مت ہونا، بھلا کون ایسی لڑکی ہے جو زندگی بھر کے لئے اس مجسمۂ حماقت کو خود پر مسلط کر لے گی!"

اینجل کی تشویش دور ہوگئی، ساری فکرمندی جاتی رہی، ہیلن کا ذرا سا دلاسا اس کے لئے بہت کافی تھا۔

* * *

اینجل اڈریانوپل پہنچا تو معلوم ہوا سلطان محمد ایشیائے کوچک کی شورشیں دبانے میں مشغول ہے، یہ بغاوتیں بھی عیسائیوں کی سازشوں کا ایک حصہ تھیں۔ مسیحی قوتیں نوجوان بادشاہ کو اس کے اپنے ہی ملک کی بغاوتوں میں الجھا کر کمزور کر دینا چاہتی تھیں۔ اور جب انہیں یہ یقین ہو جاتا کہ نوجوان بادشاہ بغاوتیں دبانے میں ناکام رہا ہے تو وہ خود بھی ترکی علاقوں میں داخل ہو جائیں گی اور چاروں طرف سے یلغار کر کے اس فتنے کو ہمیشہ کے لئے پاک کر دیں گی۔

شہزادی ماریہ نے اینجل کو اپنے پاس طلب کر لیا۔ اس دن اس نے بطور خاص سیاہ لباس زیب تن کیا اور دو انگلیوں میں نہایت بیش قیمت انگوٹھیاں پہن لیں۔ اینجل نے بھی شہزادی کے روبرو جانے سے پہلے بہت اچھے کپڑے پہنے اور انہیں خوشبو سے معطر کر دیا۔ وہ شہزادی کے روبرو پہنچتے ہی ادب سے دوزانو ہو گیا۔ یہاں بھی کنیزیں اس کے سر پر مسلط تھیں۔

شہزادی ماریہ نے پوچھا" سرویا والے کیسے ہیں؟"

اینجل نے جواب دیا" کوئی فرق نہیں آیا۔ جیسے پہلے تھے ویسے ہی آج بھی ہیں۔"

شہزادی نے اس بے تکے جواب پر شکایتی انداز میں کہا" اینجل! تمہارا یہ جواب مطمئن کر دینے والا نہیں ہے۔"

اینجل شہزادی کو اس قیامت خیز لباس میں دیکھ کر بہت پریشان ہو گیا۔ اس وقت شہزادی کا ہر عضو اینجل کو دعوت نظارہ دے رہا تھا۔ شہزادی نے بھی قصداً بے نیازی اختیار کر لی تھی۔

اینجل کے ذہن میں ہیلن کروٹیں لے رہی تھی گو کہ اس نے اس کا دل بھی دکھایا تھا۔

شہزادی نے کہا" اینجل! تم کھوئے کھوئے کیوں رہنے لگے ہو؟"

اینجل نے جواب دیا" مجھے یہاں مجبوراً آنا پڑا ہے ورنہ میں تو سرویا ہی میں رہ جاتا۔"

شہزادی نے کنیزوں کو ہاتھ کے اشارے سے چلے جانے کا حکم دیا۔ جب وہ نظروں سے اوجھل ہو گئیں تو شہزادی نے سوال کیا" آخر تم یہ کیوں نہیں بتاتے کہ میرے والد کیسے ہیں میری بہن ہیلن کیسی ہے اور دوسرے بہت سے لوگوں کا کیا حال ہے؟"

اینجل نے جواب دیا" آپ کے والد بڑے اچھے انسان ہیں، اور ہیلن کا تو کوئی جواب ہی نہیں، کتنے ہی امیرزادے اور شہزادے اس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے اس کے در پر ناصیہ فرسائی کرتے ہیں۔"

شہزادی نے شرما کر پوچھا" کبھی مجھے بھی یاد کیا تم نے؟"

اینجل نے جواب دیا" آپ کو یاد کیا خاک کرتا۔ وہاں ہو بہو آپ کی شکل و شباہت کی ایک دوسری لڑکی بھی موجود ہے۔"

شہزادی نے پوچھا" وہ دوسری لڑکی میری بہن ہیلن ہو گی۔ کیونکہ وہ مجھ سے بہت زیادہ مشابہ ہے!"

"بالکل ٹھیک ہے شہزادی صاحبہ! آپ کو بہت یاد کرتی تھی وہ۔ یہاں آپ کے پاس آنے کے لئے بے چین ہے۔"

شہزادی نے پوچھا" اینجل! کیا خیالوں کی دنیا وہاں کے لوگ اب بھی سجاتے ہیں؟ یا سست ہو گئے ہیں؟"

اینجل نے کہا" شہزادی صاحبہ! سچ بات تو یہ ہے کہ سرویا کے لوگ غضب کے بے فکرے ہیں ان پر شادی و غم کا مطلق اثر نہیں ہوتا۔ میں نے انہیں کئی دکھ بھری داستانیں سنائیں لیکن ایسے موقعوں پر وہ روتے نہیں ہنستے ہیں۔"

شہزادی ہاتھ ملنے لگی۔ وہ جو کچھ جاننا چاہتی تھی اینجل اسے بار بار نظرانداز کر رہا تھا۔

شہزادی نے پوچھا" میرا شوہر مر چکا ہے اور میں ابھی جوان ہوں کیا میرے گھر والوں کو اس کا احساس نہیں ہے کہ میری دوسری شادی بھی ہو سکتی ہے؟"

اینجل نے جواب دیا" میں نے ان ذاتی نوعیت کے سوالوں سے ہمیشہ احتراز کیا ہے۔"

شہزادی نے غصے میں کہا" تم دور ہو جاؤ میری نظروں سے کیونکہ اب تم پہلے جیسے اینجل نہیں رہے سرویا جا کر خدا جانے تمہیں ہو کیا گیا ہے۔"

اینجل اٹھ کر چلا گیا۔ لیکن کچھ دور جا کر پھر واپس آ گیا۔ بولا" محترمہ شہزادی صاحبہ!

مجھے معاف فرما دیجئے میں سر دیا سے واپس آکر اپنے ہوش و حواس میں نہیں ہوں معلوم نہیں مجھے کیا ہو گیا ہے ؟"

شہزادی نے پھر جھڑکا "اب تم یہاں ایک لمحے بھی نہیں ٹھہرو گے۔ اسی وقت چلے جاؤ یہاں سے۔ اب میں تم سے ایک بات بھی نہیں کروں گی۔"

اینجل نے نفسیاتی چمکا لگایا "میں آپ کو یہ بتانا بھول ہی گیا کہ آپ کے والد نے میرے سپرد ایک ایسا کام کر دیا ہے جسے بحسن و خوبی انجام دے کر میں آپ کی چھوٹی بہن ہیلن کا مستحق ہو جاؤں گا۔"

"تم جھوٹے ہو، میرا باپ تم سے اس قسم کا وعدہ ہرگز نہیں کر سکتا!"

"آپ دیکھ لیجئے گا۔" اینجل کہنے لگا "میں یہاں آیا ہی ایک خاص مقصد سے ہوں۔"

شہزادی نے کہا۔ "اگر ایسا ہے تو میں بھی دیکھوں گی کہ تو اپنے اس خاص مقصد میں کس طرح کامیابی حاصل کرتا ہے۔"

اینجل نے ڈر کر پوچھا۔ "کیا آپ میرے اس مقصد سے آگاہ ہو گئی ہیں ؟"

شہزادی نے کہا۔ "ہاں، میں جانتی ہوں کہ تم یہاں کیوں آتے ہو، میں سلطان کی واپسی کی منتظر ہوں، پھر دیکھتی ہوں تم اپنے مقصد میں کس طرح کامیابی حاصل کرتے ہو ؟"

اینجل کا مارے ڈر کے بہت برا حال ہو گیا۔ اس نے سوچا اگر شہزادی اس کے ارادے سے واقعی واقف ہو گئی ہے اور اس نے اس کا انکشاف بادشاہ کے روبرو کر دیا تو اس کا حشر کیا ہو گا۔ اس نے شہزادی کی خوشامد کی اور کہا۔ "شہزادی صاحبہ! مجھے ایک بار معاف کر دیجئے اس کے بعد کوئی غلطی نہ کروں گا۔ آپ اطمینان رکھئے۔"

شہزادی بڑبڑاتی رہی۔ "جب تک میں اس محل میں ہوں، اور بادشاہ کی عطا کردہ آسائشوں سے لطف اندوز ہو رہی ہوں میں نمک حرامی کا خیال تک اپنے دل میں نہیں لا سکتی، تم جس سازش کو پرورش کر کے اپنے ساتھ لاتے ہو، میں بادشاہ کے سامنے اس کا پردہ چاک کر کے رہوں گی۔"

اینجل شہزادی کے قدموں میں گر گیا۔ "مجھے معاف کر دیجئے شہزادی صاحبہ! میں اپنے نازیبا طور و طریق پر نادم اور شرمسار ہوں۔"

شہزادی نے اس کی پیشانی پر ایک ٹھوکر رسید کر دی۔ بولی۔ "جاؤ، ہیلن کے پاس

جاؤ، وہ تمہیں تگنی کا ناچ نچائے گی ابھی تم نے اسے سمجھا نہیں ہے اچھی طرح۔"

اینجل کی پیشانی سے خون جاری ہو گیا۔ لیکن شہزادی نے اس کی کوئی پرواہ نہیں کی۔

❖ ❖ ❖

کچھ عرصے بعد نوجوان بادشاہ محمد خان ایشیائے کوچک کی شورشیں دبا کر واپس آ گیا۔ اس نے آتے ہی اینجل کو غیر مسلح کر کے نظر بند کر دیا۔ اینجل کو شبہ گزرا کہ سلطان کی یہ کارروائی یقیناً شہزادی کی ایما پر عمل میں لائی گئی ہے۔ اس وقت اسے شہزادی کے ساتھ ساتھ اپنے آپ پر بھی غصہ آ رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ آخر شہزادی کے روبرو اس نے ہیلن کا نام لیا ہی کیوں، اور جس مقصد کو لے کر وہ یہاں آیا تھا، اس کا اشارتاً ہی سہی، شہزادی کے سامنے ذکر ہی کیوں کیا ؟

لیکن اب تو تیر کمان سے نکل ہی چکا تھا۔ گزرے لمحات اور گزری باتوں کے ماتم سے فائدہ ؟

اسی دوران سلطان محمد کی خدمت میں قسطنطنیہ کا ایک وفد حاضر ہوا، قسطنطنیہ کے فرماں روا قسطنطین سیزدہم نے سلطان کو نوعمر اور ناتجربہ کار سمجھ کر چھیڑ چھاڑ شروع کر دی تھی۔

سلطان محمد نے وفد سے دریافت کیا۔ "آخر تمہارا بادشاہ کیا چاہتا ہے ؟"

وفد کے قائد نے جواب دیا۔ "ہمارے بادشاہ نے سلطان عالی کو مطلع اور متنبہ کیا ہے کہ آپ کے والد مرحوم کے زمانے سے قسطنطنیہ میں اورخان نامی ترک شہزادہ نظر بند ہے اس کے اخراجات آپ کی حکومت برداشت کرتی چلی آ رہی ہے، لیکن اب حالات اور وقت کے پیش نظر وہ رقم ناکافی ٹھہرتی ہے اس لئے ہمارے بادشاہ کا حکم ہے کہ اس میں اضافہ کر دیا جائے۔"

لفظ حکم نے سلطان کے جسم میں آگ لگا دی لیکن اس نے مصلحت اندیشی اختیار کی۔ وفد کے قائد سے پوچھا۔ "اگر اس رقم میں اضافہ نہ کیا جائے تو ؟"

وفد کے قائد نے جواب دیا۔ "تب پھر ہماری حکومت اس امر پر مجبور ہو جائے گی کہ شہزادے کو رہا کر دے تاکہ وہ شہزادہ اپنی گزر بسر کے لئے رقم کا انتظام خود کرے اور ان وسائل کو فراہم کرے جو اس کی شان و شوکت اور پر آسائش زندگی کے لئے ضروری ہوں۔"

سلطان نے کہا "تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ تمہارا بادشاہ ہمارے روبرو ایک آئندہ وارثِ سلطنت کو لا کھڑا کرے گا اور اس طرح وہ ہمیں پریشان اور عاجز کرنے کی کوشش کرے گا۔"

قائد نے جواب دیا "نظر بند شہزادہ اورخان کا طالب ہے اور ہماری حکومت کے خیال میں اس محروم شہزادے کو گزر بسر کے لئے اگر اورخان بخش دیا جاتے تو کوئی معیوب بات نہ ہوگی۔"

سلطان نے کہا "تم لوگ واپس جاؤ اور اپنے بادشاہ سے کہہ دو کہ تمہارا مطالبہ ابھی زیرِ غور ہے ہم اپنا حتمی جواب بہت جلد بھیج دیں گے۔"

قائد نے اصرار کیا "ہماری حکومت کو جلد از جلد جواب مل جانا چاہیئے۔ کیونکہ جتنا زیادہ وقت گزرے گا ہماری حکومت نظر بند شہزادے پر فضول اخراجات سے زیرِ بار ہوتی جائے گی۔"

وفد واپس چلا گیا۔

سلطان نے اس کے جاتے ہی اڈریانوپل میں ایک شاندار قصر کی تیاری شروع کر دی۔ اس سے پہلے سلطان محمد اول نے قسطنطنیہ کے مقابل ایشیائی ساحل پر ایک قلعہ تعمیر کرایا تھا جس کا نام حصن اناطولیہ رکھا تھا، محمد ثانی نے قسطنطنیہ کے مقابل یورپی حصے میں ایک نئے قلعہ کی تعمیر شروع کرا دی۔ یہ قلعہ رومیلیا نامی جگہ پر بن رہا تھا۔ ہزاروں مزدور اور معمار کام پر لگا دیئے گئے۔

قسطنطین کو قلعہ کی تعمیر پر اعتراض ہوا، اس نے سلطان کی خدمت میں ایک وفد اور روانہ کیا۔ اس وفد نے پہلے تو اس کا جواب چاہا کہ سلطان نے ابھی تک قسطنطین کے مطالبے کا کوئی جواب نہیں دیا۔ سلطان نے اپنے وزیر خلیل پاشا کو حکم دیا کہ اس رومی وفد کو اس کے ناجائز مطالبے کا منہ توڑ جواب دے دیا جائے۔

خلیل پاشا کا وہ جواب جو سلطان محمد ثانی کی ایما اور مشورے سے تیار کر رکھا گیا تھا، رومی وفد کے حوالے کر دیا گیا، اس میں خلیل پاشا نے بہت سخت لب ولہجہ اختیار کیا تھا۔

"احمق اور بدبخت رومیو! ہمیں تمہاری چالوں کا پورا علم ہے، اس کے برعکس تمہیں اس خطرے کا کوئی احساس نہیں جو تمہارے سر پر منڈلا رہا ہے۔ تمہیں معلوم ہے کہ محتاط سلطان (مراد ثانی) چل بسا۔ اب اس کا تخت ایک ایسے نوجوان فاتح کے قبضے میں ہے جو کسی بھی پابندی کا روادار نہیں اور جس کے راستے میں کوئی بھی مشکل رکاوٹ نہیں بن سکتی۔ اگر تم اس کے ہاتھ سے بچ نکلے تو اسے خدا کی رحمت سمجھنا اور یقین کر لینا کہ ابھی خدا تمہارے گناہوں کی سزا میں ڈھیل دے رہا ہے تم بے سود اور بالواسطہ دھمکیوں سے ہمیں ڈرانے کی کوشش نہ کرو۔ تم شہزادے اورخان کو رہا کر دو، اسے اورخان کا بادشاہ بنا دو، تم دریا پار سے ہنگری والوں کو اپنی مدد کے لئے بلا لو، تم کو اس کی بھی اجازت ہے کہ ہمارے خلاف مغربی قوموں کو بھی میدانِ جنگ میں لے آؤ، غرض جو چاہو کرو، مگر یقین رکھو کہ نتیجہ اس کے سوا کچھ نہ نکلے گا کہ ہمیں اشتعال دلاؤ گے اور اپنی تباہی اور بربادی کو اور قریب لے آؤ گے۔"

رومی وفد نے سلطان سے شکایتاً کہا "حضورِ والا کے علم میں ہو گا کہ آپ کے جدِ امجد نے یہاں قلعہ تعمیر کرنے کی اجازت طلب کی تھی، جسے مسترد کر دیا گیا تھا۔ اب آپ کسی اجازت اور معاہدے کے بغیر جو یہ قلعہ تعمیر کرا رہے ہیں تو یہ معاہدے کی صریحاً خلاف ورزی ہے۔"

سلطان نے جواب دیا "ابھی تک تمہارے شہر قسطنطنیہ کے خلاف میں کوئی ارادہ نہیں رکھتا اور تمہارے شہر کی حدود اس کی فصیلوں تک ہیں، اس کے بعد جو کچھ ہے تمہاری حکومت کی حدود سے باہر ہے، تم اپنے بادشاہ سے کہہ دینا کہ ماضی میں تم اہلِ ہنگری سے اتحاد کر کے ہمارے ملک پر حملہ آور ہوتے تھے اور فرانسیسی بیڑے نے درۂ دانیال کو روک لیا تھا۔ لیکن میرے والد مراد نور وفوت سے کام لے کر آبنائے باسفورس سے گزر گئے۔ اس وقت میں خود اڈریانوپل میں کمسن تھا۔ اپنے بادشاہ سے پوچھنا کیا وہ اس ماضی کو بھلا چکا ہے، جب سلطان کانپ رہے تھے اور تم لوگ ان کی عزت چھیننے کے درپے تھے!"

وفد کے قائد نے سوال کیا "لیکن حضورِ والا! ان تمام باتوں کا قلعہ کی تعمیر سے کیا تعلق ہے؟"

"بالکل ہے" سلطان نے طیش میں کہا "اس جنگ میں وارسا کے میدان میں جب میرے والد نے فتح حاصل کی تھی تو اسی وقت یہ قسم کھائی تھی کہ باسفورس کے مغربی ساحل پر قلعہ ضرور تعمیر کراؤں گا اور یہ میرا فرض ہے کہ میں اپنے والد کی قسم پوری کروں۔"

قائد نے دلیری سے عرض کیا۔ "لیکن حضورِ والا کو یہ بھی علم ہوگا کہ اس کے ناخوشگوار نتائج بھی نکل سکتے ہیں!"

سلطان نے مشتعل ہو کر جواب دیا۔ "بے شک ناخوشگوار نتائج نکل سکتے ہیں لیکن کس کے خلاف؟ کس کے حق میں؟ یہ فیصلہ وقت کرے گا۔ میں تمہاری حکومت کو یہ حق نہیں دے سکتا کہ جس خطے کا میں مالک ہوں وہ وہاں میرے اعمال پر پابندیاں عائد کرے۔ یہ خطہ میرا ہے۔ باسفورس کے ایشیائی ساحل پر ترک آباد ہیں اور اس یورپی ساحل کو رومیوں نے خود ہی خالی کر رکھا ہے، یہاں قلعہ تعمیر ہو کر ہی رہے گا۔"

وفد کے قائد نے پوچھا۔ "کیا یہ سلطان والا کا قطعی اور آخری جواب ہے؟"

"ہاں قطعی بھی اور آخری بھی۔ تم لوگ واپس جاؤ اور اپنے بادشاہ سے کہہ دو کہ موجودہ عثمانی سلطان اپنے پیش روؤں سے بالکل مختلف ہے۔ کہنا میرے عزائم میرے اپنے پیش روؤں کی خواہشات سے بھی آگے ہیں، میں وہ سب کچھ پورا کر دینا چاہتا ہوں جو میرے آباؤاجداد کے ارادوں میں بھی نہ تھا۔"

وفد نے واپسی کے لئے حرکت کی۔ پوچھا۔ "کیا ہم لوگ جا سکتے ہیں؟"

سلطان نے جواب دیا۔ "ہاں اب تم لوگ جا سکتے ہو، تمہیں بہ حفاظت جانے کی اجازت دی جاتی ہے لیکن جاتے جاتے یہ بھی سنتے جاؤ کہ اگر میرے پاس اس سلسلے میں پھر کوئی سفیر آیا تو وہ کھال کھینچے جانے کا مستحق قرار دیا جائے گا۔"

وفد چلا گیا۔ قلعہ کی تعمیر کا کام ہوتا رہا۔ عیسائی اس تعمیر کو بادلِ نخواستہ گوارا کئے رہے۔ یہ قلعہ تین ماہ میں تیار ہو گیا۔ دوسری طرف اڈریانوپل کا قصر بھی تیار ہو چکا تھا۔ بادشاہ نے اس قصر کا نام جہاں نما اور قلعہ کا نام حصن رومیلیا رکھا۔ قلعہ کی شکل مثلث تھی اور اس کے ہر گوشے پر نہایت مضبوط اور مستحکم برج بنوائے گئے تھے اس کی دیواریں بائیس فٹ چوڑی تھیں لیکن برجوں کی چوڑائی تیس فٹ رکھی گئی تھی۔

سلطان نے قلعہ کی تعمیر کے بعد یہاں فوج بٹھا دی اور اسے حکم دیا کہ وہ اپنے گھوڑوں اور خچروں کو آس پاس کی چراگاہوں میں چرائیں اور اگر کوئی مقامی شخص مزاحم ہونے کی کوشش کرے تو اسے سزا دی جائے اس کے ساتھ ہی سلطان نے یہ حکم بھی دیا کہ ساحل سے گزرنے والے جہازوں سے محصول وصول کیا جائے۔ وینس کے ایک جہاز نے سلطان کا حکم ماننے سے انکار کر دیا تو اسے توپ زنی کر کے سمندر کی تہہ میں

بٹھا دیا گیا۔

★ ★ ★

سلطان نے اینجل کو اس وقت طلب کیا جب وہ یہ سمجھ بیٹھا تھا کہ شاید سلطان نے اسے فراموش کر دیا ہے۔ لیکن جب سلطان کے آدمی نے اسے یہ بتایا کہ "تمہیں سلطان یاد فرما رہے ہیں۔" تو اس کی آدھی جان نکل گئی۔ اس نے خوفزدہ انداز میں پوچھا۔ "میرے بھائی! جب تم سلطان کے پاس سے چلے تھے اس وقت اس کے چہرے پر کیسی کیفیت پائی جاتی تھی؟"

سلطانی خدمت گار نے جواب دیا۔ "کس میں اتنی ہمت ہے کہ سلطان کے چہرے کو غور سے دیکھ سکے!"

اینجل چکرایا ہوا تھا، بولا۔ "تم ٹھیک ہی کہتے ہو میرے بھائی کس میں اتنی ہمت ہے کہ سلطان کو نظر بھر کے دیکھ سکے۔ لیکن تم یہ ضرور بتا سکو گے کہ اس وقت سلطان کا لب و لہجہ کیسا تھا؟ میرا مطلب یہ ہے کہ سلطان کے لہجے میں عام سی کیفیت پائی جاتی تھی یا اس میں ناراضی اور غصہ بھی شامل تھا؟"

خدمت گار نے جھنجھلا کر کہا۔ "اب زیادہ باتیں مت بنا۔ میں نہیں جانتا کہ سلطان کے لب و لہجے میں غصہ تھا یا نہیں تھا!"

اینجل بوجھل قدموں سے چل پڑا۔ "خدا خیر کرے۔ معلوم نہیں کیوں میں واپس آ گیا، سرویا میں بڑی پرسکون زندگی گزار سکتا تھا!"

خدمت گار نے طنزاً کہا۔ "جب آدمی کو اس کی شامت دھکا دیتی ہے تو اسے یہی دن دیکھنا پڑتا ہے۔"

اینجل نے تشویشناک اور وہم زدہ لہجے میں کہا۔ "تو اس کا یہ مطلب ہے کہ کوئی نہ کوئی خطرے کی بات ہے ضرور۔ یا میرے خدا میری جان بچا۔ میں بالکل بے قصور اور سلطان کا جاں نثار اور وفادار ہوں!"

جب وہ سلطان کے سامنے پہنچا تو دیکھا، سلطان کچھ افسردہ بیٹھا ہے۔ اینجل کی حالت اس وقت اور زیادہ غیر ہو گئی جب اچانک دو خدمت گاروں نے اس کی دونوں طرف کی بغلوں میں ہاتھ ڈال کر مضبوطی سے قابو میں کر لیا۔ ان حالات میں اسے یقین ہو گیا کہ اس کی زندگی کے دن پورے ہو چکے ہیں۔ اسی وقت سلطان کے اشارے پر ایک

اور شخص آموجود ہوا اور وہ سلطان کے سامنے بائیں طرف کھڑا ہو گیا۔ سلطان نے اُ
شخص سے کہا۔ "تم اس نابکار سے پوچھو کہ اس نے سردیا میں اپنے شب و روز کس طرح
گزارے ہیں؟"

اس شخص نے سلطان کا سوال دہرایا۔ اینجل تھر تھر کانپنے لگا۔ دہشت سے اُ
کی زبان گنگ ہو گئی تھی۔ سلطان نے درشت لہجے میں کہا۔ "اس سے جواب لیا جائے۔"

سلطانی نمائندے نے سختی سے کہا۔ "جواب کیوں نہیں دیتا ظل ہما نہیں چاہ
کہ تو کسی صفائی کے بغیر ہی سزا پا جائے۔"

اینجل نے گڑگڑاتے ہوئے کہا۔ "حضور والا! سردیا والوں نے میری اتنی ضیا
کیں اتنی دعوتیں کیں کہ میں دعوتیں اڑانے کے علاوہ کچھ کر ہی نہ سکا۔"

سلطان نے کہا۔ "اس سے پوچھو یہ قسطنطنیہ کیوں گیا تھا کیا وہاں بھی
دعوتیں اڑاتا رہا؟"

نمائندے نے سلطان کا سوال دہرایا۔ اینجل کے رہے سہے حواس بھی رخصت ہ
گئے وہ دونوں خدمت گاروں کے بازوؤں میں کسی شرابی کی طرح جھول گیا۔ بے اختیار
"سلطانِ معظم رحم! حضور والا رحم!"

سلطان نے پوچھا۔ "رحم کیوں؟ کس بات پر رحم؟ کس جرم پر رحم؟"

اینجل کی پھر ہمت بندھی، بولا۔ "حضورِ والا کو معلوم ہونا چاہئے کہ میرے بعض
عزیز اور احباب قسطنطنیہ میں بھی ہیں اور وہاں مجھے سینٹ ایا صوفیہ کی زیارت کو جاتے
جانا تھا۔"

سلطان نے اپنے نمائندے کے ذریعہ سوال کیا۔ "تیری ساری باتیں مشتبہ ہیں
ہر بات، تیرا ہر جواب شک آلودہ ہے اور کیا تو نے یہ مثل نہیں سنی کہ ایک جھوٹ کی پر
داری کے لئے لاتعداد جھوٹ بولنا پڑتے ہیں۔"

اینجل کی کچھ سمجھ میں نہ آرہا تھا کہ آخر یہ معاملہ کیا ہے؟ کیا سلطان کو سب کچھ
ہو چکا ہے؟ اور اگر معلوم ہوا ہے تو اس معلومات کا ذریعہ کیا ہے؟"

سلطان نے کسی کو حکم دیا۔ "اسے حاضر کیا جائے!"

اور ذرا دیر بعد دو خدمت گار ایک اور شخص کو اپنے بازوؤں میں جکڑے
ہوئے سلطان کے سامنے آکھڑے ہوئے۔ اینجل نے اس شخص کو پہلی ہی نظر میں پہچان
لیا۔ یہ مائیکل تھا۔

سلطان نے مائیکل کو حکم دیا۔ "یہ بدبخت جس منصوبے کے ماتحت یہاں آیا ہے
اسے بیان کیا جائے۔"

مائیکل نے نرفردہ سب کچھ بتانا شروع کر دیا جسے پورا کر کے اینجل ہیلن کو حاصل
کر لیتا۔ اس نے اپنی راہ کے اس بھاری پتھر کو دور کرنے کی یہ ترکیب سوچی کہ سلطان سے
مل کر اینجل کا سارا منصوبہ اس کے گوش گزار کر دیا۔

مائیکل نے کیا کچھ کہا، اینجل پوری طرح نہیں سن سکا کیونکہ خوف اور دہشت سے
دل اتنی زور زور سے دھڑکا کہ بعد میں ڈوبتا چلا گیا آنکھوں کے آگے بے وقت کی سیاہی
دوڑتی چلی گئی اور اینجل بالکل بے جان سا ہو کر دونوں خدمت گاروں کے بازوؤں میں
جھولنے لگا۔ گردن ایک طرف جھک گئی اور وہ اپنے ہوش و حواس کھو دینے کی وجہ سے
سلطانی رعب و دبدبے اور عتاب سے نجات پا گیا۔

* * *

قسطنطین نے بھی تمام مسیحی دنیا کو اپنی مدد کے لئے آواز دی ابھی تک مسیحی دنیا
دو حصوں میں تقسیم تھی۔ ایک حصہ چرچ آف روم کے زیر اثر تھا اور یہ پوری مغربی دنیا پر
حاوی تھا، دوسرا حصہ چرچ آف گریک کے دائرہ اثر میں تھا، یہ قسطنطین کے ماتحت تھا اور اس
کا مشرقی حصوں میں اثر و نفوذ تھا، قسطنطین نے نہایت دانشمندی اور ایثار کا ثبوت دیتے
ہوئے روما کے پوپ کو لکھا۔ "جناب والا! اب وقت آگیا ہے کہ ہم اپنے مذہبی اختلافات مٹا
دیں اور سب متحد اور متفق ہو کر مسلمانوں کا مقابلہ کریں، میں بخوشی آپ کے عقائد کو تسلیم
کرتا ہوں اور آئندہ قسطنطنیہ کا گرجا بھی آپ ہی کے ماتحت ہوگا۔"

اس پیش کش اور جذبۂ ایثار نے وہ کام کیا جو بڑی بڑی تدبیریں بھی نہ کر
سکتی تھیں۔ پوپ نے خوش ہو کر پورے براعظم یورپ میں جہاد کا اعلان کر دیا۔ وینس اور
جینوا کی بحری اور بری فوجیں قسطنطنیہ کی طرف چل پڑیں اسپین کی شمالی ریاست ارگون اور
سسلی کے فوجی دستے بھی قسطنطین کی مدد کے لئے حرکت میں آگئے۔

ادھر ہنگری سے اربان نامی ایک شخص سلطان محمد کی خدمت میں حاضر ہوا۔
یہ اپنے اہلِ وطن اور ہم قوموں کی ناقدری کا شکار تھا۔ اس نے سلطان کے پاس آکر اسلام قبول
کر لیا اور بتایا کہ وہ سلطان کے لئے بہترین دور مار توپیں تیار کر سکتا ہے پہلے تو سلطان
نے اچھی طرح اس کا منصوبہ سمجھتا رہا اس کے بعد اس نے حکم دے دیا کہ توپیں تیار کی

جاتیں۔ اربان توپوں کی تیاری میں مشغول ہو گیا۔

اینجل کو حیرت اس بات پر تھی کہ سلطان نے اسے فوراً ہی قتل کیوں نہ کرا دیا دوران اس کے پہرے داروں نے بتایا کہ سلطان بطور خاص توپیں تیار کرا رہا ہے اور ا میں سے کسی ایک توپ میں اینجل کو ڈال کر قسطنطنیہ کے اندر پھینک دیا جائے گا۔ اینجل خوفناک سزا کا حال سن کر نیم مردہ ہو گیا اور روتے روتے آنسو بھی خشک ہو گئے۔ اب نہ تو ماریہ یاد آ رہی تھی اور نہ ہیلن۔ اسے دونوں سے نفرت ہو گئی تھی۔

سلطان محمد اپنی فوجوں کے ساتھ قسطنطنیہ کی فصیل کے نیچے پہنچ گیا اور ا کا خشکی کی طرف سے محاصرہ کر لیا۔ قسطنطنیہ والوں نے بھی فصیل کے برجوں پر توپیں چ دیں اور ان پر بے شمار آدمی متعین کر دیئے۔ بحیرۂ مارمورہ میں سلطان کے جہازوں قسطنطنیہ کی مدد کے لئے آنے والے بحری جہازوں کا راستہ روک رکھا تھا۔ اسی دو جنیوا کے پانچ بحری جہازوں نے سلطان کی بحری ناکہ بندی کو توڑ دیا اور سامان رسد و آ لے کر خلیج باسفورس سے شاخ زریں میں داخل ہو گئے۔ سلطان یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ ساحل سمندر پر اپنے دستے کے ساتھ بے چینی سے ادھر ادھر گھوڑے دوڑاتا پھر رہا اسے اپنی بحریہ کی ناکہ بندی کے ٹوٹ جانے کا بڑا ملال ہوا ان جہازوں کے بعد پانچ ج اور نمودار ہوتے اور سلطان نے اپنے امیر البحر کو حکم بھیجا کہ ان جہازوں کو ہرگز نہ نکلنے دیا

ترکی بحریہ حرکت میں آ گئی اور اس نے دشمن کے جہازوں کو محاصرے میں

ترک بحری سپاہ دشمن کے جہازوں پر چڑھنے کی کوشش کرنے لگی اور دشمن انہیں د لگا۔ قسطنطنیہ کی فصیل پر چڑھے ہوئے عیسائی بھی اس کشمکش کو دلچسپی سے دیکھ تھے۔ ترکوں کے جہاز بہت چھوٹے چھوٹے تھے اور غنیم کے جہاز بہت بڑے بڑے ترکوں کے جہازوں کے بیچ میں گھرے ہوئے دشمن کے جہاز یوں لگ رہے تھے گ نے دیوؤں کو محاصرے میں لے رکھا ہے۔ پھر اچانک یہ تماشا دیکھنے میں آیا، دشمن کے ترکی بحریہ کی ناکہ بندی توڑ کر تیزی سے شاخ زریں میں داخل ہو گئے۔ شاخ زریں کنارے سے دوسرے کنارے تک ایک موٹی فولادی زنجیر پڑی ہوئی تھی۔ قسطنط والوں نے اس زنجیر کو ڈھیل دی اور ان کے امدادی جہاز شاخ زریں میں محفوظ ہو ان کے پیچھے پیچھے ترکی جہاز بھی آ گئے۔ لیکن ان کے آتے ہی زنجیر کھینچ کر دیوار کی ط کر دی گئی جس سے ترکی شاخ زریں میں نہیں داخل ہو سکے۔ اس ناکامی نے سلطا بے قابو کر دیا اس نے اسی وقت اپنے امیر البحر کو طلب کیا۔ اور اس کی مکموں اور گھ

سے پٹائی کر دی۔ اس مرمت نے یہ اثر ضرور دکھایا کہ اس کے بعد کوئی جہاز ترکوں کی بحری ناکہ بندی کو نہیں توڑ سکا۔

سلطان محاصرہ کئے پڑا تھا۔ اینجل نظر بند تھا۔ سلطان کی دوری نے اینجل کو قدرے سکون بخشا۔ شہزادی ماریہ کو اینجل کے زیر عتاب آنے کا علم ہو چکا تھا۔ وہ اپنے ہم قوم کو کسی بھی طرح بچا لینا چاہتی تھی، اس نے شاہی پہرے داروں کو رشوتیں دے کر اینجل سے ملنے اور مل کر کوئی منصوبہ بنانے کی سازش کی۔ رات کی تاریکی میں جبکہ لوگ خواب خرگوش کے مزے لیتے ہیں، شہزادی مردانے لباس میں اینجل کے پاس جا پہنچی اینجل پہلی نظر میں اسے پہچان نہیں سکا۔ وہ سمجھا کوئی ترکی شہزادہ اس کی جان لینے آ پہنچا ہے۔ وہ شہزادی کو دیکھتے ہی گڑگڑایا "معزز شہزادے! میں بالکل بے گناہ ہوں، آپ یقین کریں میری خطا بس اتنی سی ہے کہ میں سرویا کے بادشاہ کی بیٹی ہیلن سے محبت کرنے لگا ہوں اور یہ میری خوش قسمتی کہ وہ بھی مجھے پسند کرتی ہے اور یہ کمبخت مائیکل، جس نے ایک سازش تیار کر کے مجھے گرفتار کرا دیا ہے، دراصل میرا رقیب ہے اور چاہتا ہے کہ میں ہیلن اور اس کے درمیان سے دور ہو جاؤں، اب آپ ہی غور فرمائیں کہ میں کس حد تک گناہگار یا مجرم ہوں"

شہزادی ماریہ کو اس انکشاف سے ذہنی اذیت پہنچی۔ وہ کچھ دیر کھڑی بس دیکھتی رہی، اینجل کے ہوش و حواس پر موت کی دہشت دھند کی طرح چھائی ہوئی تھی وہ آنکھیں رکھتا تھا لیکن ان کی بصارت ناقابل اطمینان تھی۔

ایک پہرے دار نے اینجل کو جھڑکا "تو یہ کیا بے سروپا تقریر کر رہا ہے اور کس کے سامنے کر رہا ہے، ہوش و حواس میں رہ کر کام کی باتیں کر لے کیونکہ وقت بہت کم ہے"

اینجل نے بے بسی سے جواب دیا "افسوس کہ میری عقل کام نہیں کر رہی، شہزادے کا مجھ سے تعارف کرا دیا جاتے اور غایت ملاقات بتا دی جاتے"

شہزادی نے اس کی پریشانی دور کر دی بولی "اینجل میں ہوں ماریہ۔ مجھے پہچاننے کی کوشش کرو"

اینجل کو اپنی سماعت پر یقین نہیں آیا۔ وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے شہزادی کو دیکھنے لگا، اسے فوراً ہی اپنی اس غلطی کا احساس بھی ہوا کہ اس نے ہیلن کا ذکر خواہ مخواہ کر دیا۔

شہزادی نے پوچھا "اینجل! تم سچ سچ بتا دو کہ تم پر جو الزام لگایا گیا ہے

وہ کس حد تک صحیح یا غلط ہے؟"

اینجل کو جو کچھ کہنا تھا وہ پہلے ہی کہہ چکا تھا، اس نے مختصراً کہا "مجھ پر بہتان باندھا گیا ہے تہمت لگائی گئی ہے، میں بے گناہ ہوں"

شہزادی نے افسوس سے کہا "لیکن تم اپنی بے گناہی ثابت نہیں کر سکتے"

اینجل نے جواب دیا "ہاں یہ بات بھی ہے!"

شہزادی نے کہا "اگر تم واقعی بے گناہ ہو تو ایک بار پھر تم سلطان کو اپنی بے گناہی کا یقین دلانے کی کوشش کرو، کیونکہ سچ میں بڑا اثر ہوتا ہے اور یہ نکلتا ہے"

اینجل نے خوشامد کی "شہزادی صاحبہ! کیا اس معاملے میں آپ میری کوئی مدد نہیں کر سکتیں؟"

شہزادی نے جواب دیا "سلطان نو عمر ضرور ہے لیکن اس کے ارادوں میں فولاد کی سی سختی ہے، اگر اس نے تمہارے بارے میں کوئی فیصلہ کر لیا ہے تو تم یقین کر لو کہ اسے بدلا نہیں جا سکے گا"

اینجل نے روتے ہوئے کہا "تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ میں قتل کر دیا جاؤں گا"

اسی وقت ایک خوفناک دھماکے نے سب کو دہلا دیا۔

شہزادی نے گھبرا کر پوچھا "یہ دھماکہ کیسا ہے؟"

پہرے دار نے جواب دیا "اربان نامی ہنگری کے ایک کاریگر نے سلطان کے لئے توپ بنائی ہے۔ یہ شاید اسی کا تجربہ کیا گیا ہے"

شہزادی نے پوچھا "یہ تجربہ یہاں سے کتنی دور کیا گیا ہے؟"

پہرے دار نے جواب دیا "جہاں تک میرے علم کا تعلق ہے یہاں سے تقریباً میل دور یہ تجربہ کیا گیا ہے اور اس توپ سے تقریباً چھ سو پونڈ کا سنگی گولہ پھینکا گیا جو اسپان کے اندازے کے مطابق ایک میل کے فاصلے پر گرا ہو گا"

شہزادی نے کہا "اگر یہ ساری باتیں درست ہیں تو ہمیں یہ بات تسلیم کر لینی چاہیے کہ اب قسطنطنیہ زیادہ دنوں کا مہمان نہیں ہے!"

اینجل اوندھے منہ گرا رو رہا تھا۔ بولا "اور اگر یہ درست ہے کہ توپ تیار ہو چکی ہے تو اب میں بھی بس چند دنوں کا مہمان ہوں کیونکہ میں نے سن رکھا ہے کہ مجھے توپ

دہانے میں رکھ کر اڑا دیا جائے گا اور قسطنطنیہ والوں پر میرے خون کا چھڑکاؤ ہو جائے گا اور میرے اعضائے جسمانی کے ریزے ریزے ہوا میں بکھر جائیں گے"

شہزادی نے ہنس کر پوچھا "یہ تجھے کس نے بتا دیا کہ تو توپ میں رکھ کر اڑا دیا جائے گا؟"

اینجل نے جواب دیا "انہی پہرے داروں میں سے کسی نے بتایا تھا"

شہزادی نے افسوس کا اظہار کیا "اینجل! مجھے افسوس ہے کہ میں تجھے اتنا بزدل نہیں سمجھتی تھی"

اینجل نے کہا "میں بزدل نہیں ہوں شہزادی صاحبہ! بلکہ اپنی بے گناہی کی موت مرنے کا قبل از وقت افسوس ہو رہا ہے"

"اگر تم خود کو واقعی بے گناہ سمجھتے ہو تو تمہیں مطمئن ہو جانا چاہیئے، بالکل مسیح کی طرح، جو چپ چاپ صلیب پر چڑھ گئے تھے"

اینجل نے کسی حد تک اطمینان کا اظہار کیا بولا "میں صبر و شکر سے جان دینے کی کوشش کروں گا"

شہزادی نے واپس جاتے ہوئے کہا "میں کوشش کروں گی کہ تم بچ جاؤ لیکن قبل از وقت اس کا وعدہ نہیں کر سکتی"

شہزادی نے جاتے جاتے پہرے دار سے کہا "تم اس کا اس وقت تک خیال رکھو گے جب تک سلطان کوئی قطعی فیصلہ نہ صادر فرما دیں"

پہرے دار کیا بولتا، اسے تو اس ملاقات ہی کے بدلے کافی انعام مل چکا تھا۔

❖ ❖ ❖

سلطان گھنٹوں قسطنطنیہ کی فصیلوں کا نقشہ سامنے بچھائے اس کے کمزور حصوں کی جستجو میں لگا رہتا۔ اس کی نیند حرام ہو گئی تھی اور کھانے پینے کا بھی ہوش نہ رہا تھا۔

سلطان جنگ کے ہر پہلو پر نظریں رکھے ہوئے تھا۔ وہ ان ممکنہ سازشوں سے بھی چوکنا تھا جو اس موقع پر عمل میں لائی جا سکتی تھیں سلطان کو اس واقعے کی بھی اطلاع مل گئی کہ شہزادی سرویا اپنے ہم قوم اینجل کو رہائی دینے میں کوشاں ہے، شہزادی نے اینجل سے کیا باتیں کیں اور اینجل نے کیا کچھ کہا سُنا۔ اسے سب کچھ معلوم ہو چکا تھا لیکن اس میں اسے کوئی ایسی بات نہیں ملی جس کو بنیاد بنا کر وہ ان دونوں کے خلاف کوئی کارروائی کرتا۔

انہی حالات میں اس کے مخبروں نے یہ خبر بھی گوش گزار کی کہ اس کے وزیر خلیل پاشا سے دشمنوں کے گہرے تعلقات رہ چکے ہیں اس لئے اس نازک وقت پر اس سے ہوشیار اور محتاط رہا جائے۔ سلطان نے خلیل پاشا کے روزمرہ کی کڑی نگرانی کی اور اسے ان میں کوئی بات بھی مشتبہ نظر نہیں آئی ادھر خلیل پاشا بھی غافل نہیں تھا، ہر وقت سلطان کی طرف سے چوکنا رہتا تھا۔

نصف رات گزر چکی تھی، اوّل نصف شب کے پہرے دار آرام کرنے جا رہے تھے اور ان کی جگہ بقیہ نصف شب کے پہرے دار لے رہے تھے سلطان اس وقت بھی جاگ رہا تھا۔ اس کی خواب گاہ میں اس وقت بھی روشنی ہو رہی تھی۔ سلطان نے خلافِ توقع تالی بجائی۔ تالی کی آواز پر ایک پہرے دار حاضر ہو گیا۔ سلطان کی آنکھیں بوجھل ہو رہی تھیں اس نے تھکی تھکی نظروں سے پہرے دار کی طرف دیکھا تو وہ کانپ گیا۔ سلطان نے کرخت لہجے میں حکم دیا۔ "خلیل پاشا کو حاضر کیا جائے۔"

پہرے دار پریشان ہو کر خواب گاہ سے نکلا اور خلیل پاشا کے گھر پہنچ گیا۔ وہ بھی اس وقت سونے کی تیاری کر رہا تھا، سلطان کے فرمانِ طلبی نے خلیل پاشا کے ہوش و حواس اڑا دیئے۔ اس نے پہرے دار سے پوچھا۔ "میرے عزیز دوست! خدا تمہاری عمر دراز کرے ذرا یہ تو بتاؤ اس وقت سلطان کی مزاجی حالت کیسی ہے؟"

پہرے دار نے جواب دیا۔ "حضورِ والا! ان کے لہجے میں کچھ درشتی پائی جاتی تھی!"

خلیل پاشا کا دل دھڑکنے لگا۔ پوچھا۔ "سلطان کے پاس اور کون کون ہے؟"

پہرے دار نے جواب دیا۔ "سلطان اپنی خواب گاہ میں تنہا ہیں۔"

خلیل پاشا جو بات جاننا چاہتا تھا وہ ابھی تک نہیں جان سکا تھا۔ پوچھا۔ "سلطا[ن] کے پاس اوّل شام سے کون کون آیا اور سلطان کے پاس کتنی کتنی دیر تک ٹھہرا رہا؟"

"جناب والا!" پہرے دار نے تنگ آ کر جواب دیا۔ "میرا پہرہ نصف شب کے بع[د] شروع ہوتا ہے اور میں ابھی ابھی پہرے پر آیا ہوں آپ کے سوال کا جواب مجھ سے پہ[لے] والا پہرے دار ہی دے سکتا ہے!"

خلیل پاشا اس وہم میں تھا کہ پہرے دار جانتا سب کچھ ہے لیکن شاید بتا[نا] نہیں چاہتا۔ اس نے کہا۔ "تم یہیں ٹھہرو، میں اپنے بیوی بچوں سے مل کر ابھی آتا ہو[ں]"

خلیل پاشا اندر گیا تو اس کی بیوی نے کہا۔ "آج مجھے سلطان کی سرزمین میں سا[...] مادرینے بلایا تھا۔ وہ چاہتی ہیں کہ ان کے ایک ہم قوم اور ہم وطن کو موجودہ بادشاہ کے

عتاب سے بچا لیا جائے۔"

خلیل پاشا نے افسوس سے جواب دیا۔ "خانم! سلطان نے مجھے بے موقع طلب کیا اور میں نہیں جانتا کہ میں وہاں سے زندہ واپس آ سکوں گا یا نہیں، یہ وقت ایسا نہیں ہے کہ میں کسی مسیحی کی سلطان کے روبرو سفارش کروں۔"

بیوی ڈر گئی۔ بولی۔ "اگر ایسا ہے تو میں آپ کو نہیں جانے دوں گی۔"

خلیل پاشا نے جواب دیا۔ "تو گویا تم یہ چاہتی ہو کہ میں حکم عدولی کر کے سلطان کے عائد کردہ جرم کو تسلیم کر لوں۔ اس وقت میرا غلط ایک قدم بھی اگر اٹھا تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ میں تباہ و برباد کر دیا جاؤں گا۔" پھر خلیل پاشا نے اپنی بیوی سے کہا۔ "کیا سارے بچے سو گئے؟"

"ہاں، سبھی سو گئے!"

خلیل پاشا اٹھ کر بچوں کی خواب گاہ میں داخل ہو گیا۔ اور باری باری ہر ایک کے سرہانے پہنچا اور انہیں کھڑے رہ کر کچھ دیر تک نہایت محبت اور شفقت سے دیکھتا رہا۔ اس کے بعد نہایت آہستہ سے کہا۔ "میرے بچو! خدا حافظ۔ تم سو رہے ہو، شاید کل صبح جب تمہاری آنکھ کھلے گی تو تم خود کو یتیم دیکھو گے، کیونکہ سلطان کی بے وقت طلبی کا ایک ہی مطلب ہے اور وہ مطلب یہ ہے کہ سلطان کو تمہارے باپ کے دشمنوں نے ضرور ورغلایا ہے اور سلطان اس وقت مجھ سے کچھ ایسے سوالات کرے گا جن کے جواب پر ہی میں قتل کر دیا جاؤں گا اور تم سب ایک ہی دن میں یتیم ہو جاؤ گے۔"

خلیل پاشا کی ان باتوں کا جواب کون دیتا کیونکہ بچے تو سو رہے تھے۔

خلیل پاشا نے باری باری جھک کر ان کی پیشانیوں کو بوسہ دیا اور خواب گاہ سے نکلنے لگا تو دیکھا اس کے پیچھے ہی اس کی بیوی بھی موجود ہے۔ خلیل پاشا نے پوچھا۔ "تم یہاں کیا لینے آ گئی تھیں؟"

بیوی نے تشویشناک آواز میں پوچھا۔ "تم ان سوتے ہوئے بچوں سے ابھی کیا کہہ رہے تھے؟"

خلیل پاشا نے جواب دیا۔ "میں نے جو کچھ کہا تم نے سن لیا ہے پھر فضول سوالوں کا مطلب؟"

بیوی نے کہا۔ "وہی تو میں جاننا چاہتی ہوں کہ تم سلطان کے پاس جا رہے ہو یا کسی جلاد کے پاس؟"

خلیل پاشا نے بیوی کو جھڑک دیا۔ "دیواریں بھی کان رکھتی ہیں تم ایسی باتیں مت کرو۔"

بیوی روہانسی ہو رہی تھی، بولی۔ "میں اپنی یا بچوں کی موت سے نہیں ڈرتی کیونکہ جب تم ہی نہ رہو گے تو میرا یا ان بچوں کا زندہ رہنا بھی فضول ہے، اگر تمہیں یہ یقین ہے کہ تم زندہ نہیں لوٹو گے تو یہ رہا خنجر، اس سے تم ہم سب کا کام تمام کر دو، اور پھر نہایت اطمینان سے سلطان کے روبرو حاضر ہو جاؤ۔"

خلیل پاشا نے بیوی کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ پوچھا۔ "گھر میں کتنی اشرفیاں موجود ہوں گی؟"

بیوی نے حیرت سے سوال کیا۔ "اشرفیاں کا کیا کرو گے؟"

خلیل پاشا نے کہا۔ "انہیں ایک کشتی میں لے آؤ، انہیں نذرانے کے طور پر سلطان کی خدمت میں پیش کرنا ہے اس طرح ممکن ہے سلطان ہمیں معاف کر دے۔"

★ ★ ★

بیوی نے سسکیاں بھرنا شروع کر دیں اور اپنا سر خلیل پاشا کے کاندھے پر رکھ کر رونے لگی۔ ذرا سی دیر میں آنسوؤں نے خلیل پاشا کے شانے کو تر کر دیا۔

خلیل پاشا نے اشرفیوں والی کشتی ایک خادم کے سر پر رکھی اور شاہی پہرے دار کے ساتھ سلطانی خواب گاہ کی طرف روانہ ہو گیا۔

سلطان خواب گاہ کے دروازے تک خلیل پاشا کی پیشوائی کو پہنچا۔ خلیل پاشا نے نہایت ادب کے ساتھ مراسم شاہانہ ادا کئے اور خادم کے سر سے اشرفیوں کی کشتی لے کر سلطان کی خدمت میں پیش کر دی۔

سلطان نے اشرفیوں کو خشمگیں نظروں سے دیکھا اور سوال کیا۔ "اشرفیاں لانے کا مطلب؟ کیا میں نے تم سے اشرفیاں طلب کی تھیں؟" پھر اپنے پہرے دار کو جھڑکا۔ "تو نے خلیل پاشا کو کیا پیغام دیا تھا؟"

پہرے دار نے عرض کیا۔ "ناچیز نے عرض کیا تھا کہ حضور والا نے وزیر اعظم کو اسی وقت طلب فرمایا ہے!"

سلطان نے خلیل پاشا سے کہا۔ "کیا اس پہرے دار نے یہی کہا تھا؟"

خلیل پاشا سلطان کے اضطراب اور بے چینی کو دیکھ کر اپنی زندگی سے مایوس ہو چکا تھا اس نے عرض کیا۔ "ناچیز نے اگر اشرفیاں لانے میں کسی غلطی کا ارتکاب کیا ہے تو یہ اپنی نادانستہ غلطی پر معافی کا خواستگار ہے۔"

سلطان نے درشت لہجے میں کہا۔ "خلیل پاشا! میں نے تمہیں جو کچھ دے دیا اسے واپس لینے کی میں کوئی خواہش نہیں رکھتا میں تاجر نہیں، ایک سلطان ہوں۔" پھر کچھ دیر رک کر کہا۔ "میں ایک نہایت قیمتی تحفہ لینا چاہتا ہوں۔"

خلیل پاشا نے عرض کیا۔ "حضور ارشاد تو فرمائیں، یہ ناچیز اپنی جان تک نذر کرنے کو تیار ہے۔"

سلطان نے قسطنطنیہ کے نقشے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "میں قسطنطنیہ چاہتا ہوں، یہ قسطنطنیہ۔"

خلیل پاشا نے ادب سے عرض کیا۔ "پوری رومی سلطنت حضور والا کے زیر نگیں آ چکی ہے بس یہی ایک شہر باقی رہ گیا ہے، سو یہ بھی آج ہی کل میں سلطان کے قبضے میں آ جائے گا۔"

سلطان نے کہا۔ "خلیل پاشا! ادھر آؤ میرے ساتھ۔"

خلیل پاشا سلطان کے ساتھ اس کے بستر تک چلا گیا سلطان نے اپنے تکیے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "خلیل! تم میرے اس تکیے کو غور سے دیکھو، اس پر تمہیں کہیں بھی کوئی شکن یا دباؤ نہیں ملے گا، یہ اس لئے کہ میں نے ابھی تک اس پر اپنا سر رکھا ہی نہیں۔ ہاں میں کبھی تکیے کو اٹھا کر ادھر رکھ دیتا ہوں اور کبھی ادھر رکھ دیتا ہوں، کبھی ادھر بیٹھ گیا کبھی ادھر ٹہلنے لگا۔ میری نیند اڑ چکی ہے۔" پھر معلوم نہیں کیوں، اس نے خلیل پاشا کو نصیحت کی۔ "خلیل پاشا! میں تمہیں نصیحت کرتا ہوں کہ رومیوں کی سیم و زر کی ترغیب سے بچو، جنگی قوت میں ہم ان پر فائق ہیں، اللہ تعالیٰ کے فضل اور رسول مقبول ﷺ کی برکات سے ہم بہت جلد قسطنطنیہ کے مالک بن جائیں گے۔"

خلیل پاشا نے صدائے آمین بلند کی۔

سلطان نے مزید کہا۔ "میں اکثر بھیس بدل کر بازاروں اور اپنے فوجیوں میں نکل

جاتا ہوں اور ان کی ہمت اور حوصلے کا اندازہ لگایا کرتا ہوں، میں ان کی باتیں سُن کر اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ میرے آدمیوں کے حوصلے بہت بلند ہیں۔ بالکل میری ہی طرح۔ اتنے یکساں حوصلوں کو شکست نہیں دی جا سکتی، اور خلیل پاشا! ہم یہ جنگ دفاعی نہیں جارحانہ لڑ رہے ہیں جارحانہ جنگیں کم ہاری گئی ہیں۔"

"حضورِ والا بجا فرماتے ہیں!"

سلطان نے کہا۔ "تم یہ بھی جانتے ہو کہ آج جو مسیحی قوتیں ہم سے برسرِ پیکار ہیں، کل تک ان میں کی کئی ہماری دوست رہ چکی ہیں۔"

"حضورِ والا کا ایک ایک لفظ سچائی سے لبریز ہے۔"

لیکن اب یہ ہمارے دوست نہیں رہے، میدانِ جنگ میں ہم دوستی کی غرض سے مصافحہ کرنے نہیں آتے ہیں، بلکہ اب ہماری ہتھیلیوں کے بجائے تلواریں ٹکرائیں گی۔"

خلیل پاشا نے سرِ نیاز جھکا دیا۔ بولا۔ "حضورِ والا کا یہ نکتہ بھی ناچیز کے دل و دماغ میں خوب اچھی طرح جاگزیں ہے۔"

سلطان نے کہا۔ "تب پھر تم جاؤ اور اپنے فکر و تدبر کی جملہ قوتیں اس امر میں لگا دو کہ قسطنطنیہ کی تسخیر میں کن کن تدابیر کو روبہ عمل لایا جا سکتا ہے اور ہم اپنے دشمنوں کو کم سے کم وقت اور زیادہ سے زیادہ جوش و خروش سے کس طرح شکست دے سکتے ہیں؟"

خلیل پاشا اُلٹے قدموں سلطان کی خواب گاہ سے باہر نکلا اور اپنے بیوی بچوں کی طرف روانہ ہو گیا۔

صبح جب ترکی فوج قسطنطنیہ کی فصیلوں کی طرف بڑھی تو اس کے پاس لکڑی کے ہزاروں برج موجود تھے ان برجوں کے نیچے پہیے لگے تھے اور یہ کئی کئی منزلہ تھے ان کی بلندی فصیل کے مطابق تھی اور ہر برج میں سیڑھیاں بھی موجود تھیں۔ ان برجوں کی ہر منزل میں تیر انداز اور شمشیر زن بیٹھے ہوتے تھے۔ ان برجوں کو دھکیلتے ہوئے فصیل کے قریب پہنچا دیا گیا اور برجوں میں بیٹھے ہوئے ترک فوجیوں نے دشمنوں کی بے پناہ تیر اندازی کی پرواہ کئے بغیر اپنی سیڑھیوں کو قسطنطنیہ کی فصیل پر رکھ دیا، عیسائیوں نے ان سیڑھیوں میں آگ لگا دی اور برجوں پر روغن نفت اور رال کے شعلہ زن تیر برسانے لگے، برجوں میں آگ لگ گئی اور ترک سپاہ کو اپنی جان بچانا مشکل ہو گیا۔ سلطان نے اپنی میدانی فوج کو حکم دیا کہ فصیل پر جو سر بھی دکھائی دے اسے تیر سے چھید دیا جائے لیکن برجوں میں لگی ہوئی آگ کے شعلوں اور دھوئیں کے بادلوں نے ترکوں اور عیسائیوں کے درمیان حائل ہو کر

سلطان کے فرمان کو بے اثر بنا دیا۔ فصیلوں اور ترکوں کے درمیان چوڑی اور گہری خندقیں الگ حائل تھیں اور انہیں عبور کر کے فصیل کے نیچے پہنچ جانا تقریباً ناممکن تھا خندقوں کو پاٹ کر دوسری طرف پہنچنے کی کوشش میں ہزاروں ترکوں کی جانیں ضائع گئیں۔

حصن رومیلیا کے برجوں سے سلطان کی توپیں گولہ باری کرنے میں مصروف تھیں اور ان سے فصیلوں میں جگہ جگہ شگاف بھی پڑ رہے تھے لیکن دن بھر کی گولہ باری کے شگافوں کو رات کی تاریکی میں عیسائی پھر سے بھر دیتے تھے۔ عیسائی ترکوں کی کوششوں کو ناکام ہوتے دیکھ کر ہنستے مسکراتے تھے۔ انہیں اپنے دوستوں اور حلیفوں سے اتنی امداد مل چکی تھی کہ اگر سلطان سال بھر اپنا محاصرہ جاری رکھتا تو انہیں کوئی پریشانی نہ ہوتی۔

سلطان نے ایک بار پھر نقشۂ جنگ کو اپنے سامنے بچھایا اور فیصلہ کن تدابیر پر غور کرنے لگا۔

★ ★ ★

خشکی کی طرف سے حملوں کی ساری کوشش ناکام ہو گئیں سلطان نے اپنے بحری بیڑے کو شاخ زریں میں داخل کرنے کی کوشش کی لیکن عیسائیوں نے اسے بھی ناکام بنا دیا سلطان اس مہم پر بہت زیادہ وقت نہیں ضائع کرنا چاہتا تھا، اس نے انتہائی غور و فکر کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ اگر کسی طرح اس کا بحری بیڑا شاخِ زریں میں داخل ہو کر شمال کی طرف سے قسطنطنیہ پر دباؤ ڈالے تو یہ مہم بہت جلدی سر کی جا سکتی ہے کیونکہ اس طرح مدافعین کی قوت دو حصوں میں تقسیم ہو جاتی اور یہ صورتِ حال ان کے لئے ناقابلِ برداشت ہو سکتی تھی۔

سلطان خاموشی سے ایک بحری جہاز میں بیٹھ کر باسفورس کے اُس حصے میں پہنچ گیا جو آگے جا کر بحرِ اسود میں تبدیل ہو جاتی تھی۔ یہاں اس کے سامنے اونچی نیچی پہاڑیوں جیسا خشکی کا ایک ایسا حصہ موجود تھا جس کے ذریعے وہ دوسری طرف پہنچ کر شاخِ زریں میں داخل ہو سکتا تھا اور یہ خشکی کا ایسا حصہ تھا جس پر مدافعین نے اس لئے کوئی خاص توجہ نہ دی تھی کہ اگر یہاں ترک پہنچ بھی جاتے تو خشکی کے فوراً بعد شاخِ زریں وہی کردار ادا کرتی جو فصیل کے نیچے خندقیں انجام دے رہی تھیں اور خندقوں کا پاٹ دینا تو پھر بھی آسان تھا لیکن شاخِ زریں کو پاٹنا ناممکن تھا۔

سلطان اپنے معتبر آدمیوں کے ساتھ خشکی پر اُتر گیا اور دیر تک اِدھر اُدھر گھوم

پھر کر راستے کی ناہمواری اور نشیب و فراز کا جائزہ لیتا رہا۔ اس نے اندازہ لگایا کہ پہاڑیوں کے اس پار شاخِ زریں میں داخل ہونے کے لئے اس کے بحری جہازوں کو دس میل کا فاصلہ طے کرنا تھا لیکن سوال تو یہ تھا کہ اس کے بحری جہاز خشکی کا یہ دس میل کا سفر کس طرح کر سکتے تھے۔ اس نے خشکی پر کھڑے جنگلات کا بھی اچھی طرح جائزہ لیا اور بستی میں موجود ہزاروں مویشیوں پر بھی نظریں ڈالیں۔ بستی کے لوگوں نے سلطان کو پہچان لیا تھا، وہ نیازمندانہ سلطان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور درخواست کی کہ اس جنگ میں انہیں کسی قسم کا نقصان نہ پہنچایا جائے۔

سلطان نے جواب دیا۔ "یہ اس وقت ممکن ہے کہ تم لوگ بھی ہمارے کاموں میں دخل اندازی نہ کرو اور ہمیں اخلاقی اور مادی مدد دو۔"

بستی والوں نے پوچھا۔ "ہم سلطان کی کیا مدد کر سکتے ہیں۔؟"

سلطان نے جواب دیا۔ "اخلاقی مدد تو یہ ہے کہ تم لوگ اس جنگ میں بے تعلق رہو اور مادی مدد یہ ہے کہ ہمیں تم سے لکڑیاں کاٹنے کے آلات اور مویشیوں کی ایک بہت بڑی تعداد درکار ہوگی۔ ہم تمہیں ان کی قیمت ادا کریں گے اور تمہارا فرض یہ ہوگا کہ ہمارا حکم ملتے ہی اپنے مویشی ہمارے حوالے کر دو۔"

بستی والوں نے سلطان سے وعدہ کر لیا کہ وہ سلطان کی ہر خواہش کا احترام کریں گے اور مذکورہ حکم پر بروقت عمل کیا جائے گا۔ اس کے بعد سلطان جنگلات کے درختوں کو شمار کرتا رہا اور ادھر سے مطمئن ہو کر وہ اپنے بحری جہاز میں چلا گیا، اس نے بحیرۂ مارمورہ میں مقیم اپنی جہازوں کے ملاحوں کو حکم دیا کہ "حکم ملتے ہی انہیں ایک پراسرار سمت میں روانہ ہو جانا ہے۔!"

ان جہازوں پر فوجیوں کی ایک بہت بڑی تعداد کو بٹھا دیا گیا۔

یہاں سے وہ اپنے قصر گیا اور وہاں اپنے عزیزوں اور رشتے داروں سے اس طرح ملا، گویا اب وہ واپس نہیں آئے گا۔ اس نے اپنی سوتیلی ماں سرویا کی شہزادی سے بھی ملاقات کی اور اسے اس بات پر سرزنش کی کہ اسے ایک ایسے شخص سے چوری چھپے نہیں ملنا چاہئے جو شاہی معتوب ہے اور جس کے خلاف ایک خطرناک جرم ثابت ہو چکا ہے۔

شہزادی نے ذرا دلیری سے اینجل کی وکالت کی، بولی۔ "میں سلطان سے درخواست کروں گی کہ وہ اینجل کو قبل از وقت مجرم نہ قرار دیں کیونکہ اینجل رو رو کر اپنی بے گناہی کا یقین دلاتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ سب کچھ رقابت اور حسد میں کیا گیا ہے۔"

سلطان کی تیوریوں پر بل پڑ گئے، بولا۔ "آنسوؤں کا سیلاب کسی کو بے گناہ تو نہیں قرار دے سکتا۔ حضرت یعقوبؑ کے جن مکار بیٹوں نے اپنے بھائی یوسفؑ کو کنوئیں میں گرایا تھا۔ ان سب نے رو رو کر ہی اپنے باپ کو یہ یقین دلانے کی کوشش کی تھی کہ یوسفؑ کو بھیڑیا کھا گیا اور پھر تاریخِ عالم میں بے شمار ایسے واقعات موجود ہیں جن میں مکر کے آنسوؤں کے سہارے بھیانک ترین کھیل کھیلے گئے ہیں۔"

شہزادی لاجواب ہو گئی، آبدیدہ ہو کر بولی۔ "پھر بھی سزائے موت سے پہلے اگر سختی سے تحقیقات کر لی جائے تو میرے خیال میں یہ ایک دانشمندانہ ہی نہیں عادلانہ اور فراخ دلانہ اقدام ہوگا۔"

سلطان نے کہا۔ "میں نے ابھی تک اس کے قتل کا فرمان نہیں صادر کیا، اس کی وجہ یہی ہے کہ میں جب تک قسطنطنیہ کی مہم سے فارغ نہیں ہو جاتا، اینجل کو کوئی سزا نہیں دی جائے گی، قسطنطنیہ اب چند دنوں کا مہمان ہے۔ اس چند دنوں کے مہمان کے ساتھ ہی اینجل بھی ہمارا چند روزہ مہمان ہے۔ قسطنطنیہ تو ایک مسئلہ ہے ایک مہم ہے لیکن اینجل نہ تو کوئی مسئلہ ہے اور نہ کوئی مہم، اس لئے اس پر قبل از وقت غور کر کے میں اپنا قیمتی وقت نہیں ضائع کرنا چاہتا۔"

شہزادی نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ "فصیلوں کی طرف سے قسطنطنیہ کی تسخیر ناممکن ہوتی جا رہی ہے۔ اس لئے کیا سلطان عالی مقام یہ بتانا پسند فرمائیں گے کہ اس ناقابلِ تسخیر شہر کی تسخیر کے لئے اب کن تدابیر پر عمل کیا جائے گا؟"

سلطان نے ترشی سے جواب دیا۔ "یہ سب کچھ جاننا تمہارے لئے ضروری نہیں ہے اور آئندہ تم مجھ سے اس نوع کا کوئی اور سوال کرنے کی جرأت کبھی نہ کرنا۔"

یہاں سے نکل کر سلطان خلیل پاشا کے پاس پہنچ گیا، اس وقت سلطان کے چہرے پر پہلی جیسی تشویش اور فکرمندی نہیں تھی، چہرے پر ایک عجیب سی طمانیت چھائی ہوئی تھی۔

خلیل پاشا نے ادب سے عرض کیا۔ "اس ناچیز کے لئے حضور والا کا کوئی نیا حکم۔؟"

سلطان نے جواب دیا۔ "خلیل پاشا! میں بہت جلد ایک نامعلوم مہم پر روانہ ہو جاؤں گا تم اور میرے دوسرے فوجی ان فصیلوں پر بدستور دباؤ ڈالتے رہیں گے خبردار جو اس میں تساہل یا کوتاہی سے کام لیا گیا۔"

خلیل پاشا نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ "حضور والا کس مہم پر روانہ ہونے والے ہیں کیا کچھ ارشاد فرمانا گوارا کر فرمائیں گے؟"

سلطان کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا، اس نے پُرجوش لہجے میں کہا "خلیل پاشا! اگر مجھے یہ معلوم ہو جائے کہ میرے کسی آئندہ منصوبے سے میری داڑھی کا کوئی بال واقف ہو گیا ہے تو بخدا میں اسے نوچ کر پھینک دوں گا۔"

خلیل پاشا ڈر کر خاموش ہو گیا۔

سلطان اسی دن اسی جہازوں میں فوج بٹھا کر باسفورس سے بحرِ اسود کی طرف روانہ ہو گیا۔

* * *

سلطان باسفورس سے خشکی کے اس حصے میں اتر گیا، جس کا وہ کچھ دن پہلے جائزہ لے گیا تھا، اس نے جنوب کی پہاڑیوں سے اتر کر شاخ زریں کے مقابل توپیں نصب کرا کے فوجی دستہ بٹھا دیا اور اسے حکم دیا کہ شاخ زریں کے دہانے سے جیسے ہی کوئی مسیحی بحری جہاز حرکت کرے اور مغرب کی طرف بڑھنے لگے نہایت سفاکی اور بے دردی سے تباہ و برباد کر دیا جائے۔ اس طرح اس نے جگہ جگہ پہاڑیوں کی بلندیوں پر بستی والوں کے لئے توپیں نصب کرا دیں اور اس پر متعینہ فوجوں کو حکم دیا گیا کہ بستی والے جیسے ہی کسی شرارت پر آمادہ ہوں انہیں فوراً تباہ و برباد کر دیا جائے۔ اس کے بعد سلطان کے بے شمار آدمی جنگلوں میں گھس گئے اور درختوں کا صفایا کرنے لگے، آدمیوں کی ایک بہت بڑی تعداد راستوں کو ہموار کرنے میں لگی ہوئی تھی اور ساحل سے اوپر تک کی ناہمواریوں کو پاٹ پاٹ کر سطح کرنے میں لگے ہوئے تھے۔ جب ان کی سطح برابر ہو گئی اور ساحل سے اوپر تک ایک وسیع و عریض پھسلواں تیار ہو گئی تو سلطان کے حکم سے اس پھسلواں شاہراہ پر اوپر تک لکڑیوں کے رولے بچھا دیئے گئے۔ یہی کام پہاڑی کے اس پار بھی کیا گیا اور شاخ زریں تک دس میل کا فاصلہ ایک کشادہ ہموار شاہراہ سے ملا دیا گیا اور اس شاہراہ پر بھی لکڑی کے رولے بچھا دیئے گئے۔ بستی کے لوگ اور دُور شاخ زریں کے دوسرے کنارے سے مسیحی یہ عجیب و غریب عمل دیکھ رہے تھے اور ان کی سمجھ میں یہ نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کچھ سلطان کیوں کر رہا ہے؟

جب دس میل کی شاہراہ ہموار کر دی گئی اور ان پر لکڑی کے رولے بچھائے جا چکے تو سلطان نے ہزاروں جانوروں کی چربیاں پگھلا کر ان رولوں کو تر کر دیا پھر حکم دیا کہ اسی جہازوں کو آگے پیچھے ان رولوں پر چڑھا دیا جائے۔ اس دن انسانی طاقت نے اتنا حیرت انگیز کارنامہ انجام دیا کہ آج تک عقل محوِ تماشائے لب بام نظر آتی ہے۔ ان

جہازوں کو انسانی دیوزادوں کی مدد سے پہاڑی پر چڑھا کر دوسری طرف اتار دیا گیا اس دن ہوا بھی موافق تھی۔ جہازوں کے بادبان کھول دیئے گئے، انسانی طاقت اور ہوا کے دباؤ نے جہاز کو چربیوں کی چکنائی زدہ رولوں پر دوڑانا شروع کر دیا اور دس میل کا فاصلہ طے کر کے یہ جہاز شاخ زریں کے ساحل پر پہنچ گئے۔ اس دن جب یہ کارنامہ انجام دیا جا رہا تھا جہازوں کو دھکیل کر آگے بڑھانے والے جنگجوؤں نے جوش و خروش میں طرح طرح کے نعرے بھی لگاتے اور حوصلہ بڑھانے والے گیت بھی گاتے۔ شاخ زریں کے مشرقی دہانے پر موجود مسیحی بیڑہ یہ مناظر دیکھتا رہا اور مسلمانوں کا شور و غل سنتا رہا لیکن فوراً ہی یہ نہیں سمجھ سکا کہ اس کوشش کا مقصد کیا ہے، لیکن جب سلطان کے جہاز شاخ زریں کے ساحل پر پہنچ کر پانی میں اتارے جانے لگے تب ان کی سمجھ میں سلطان کا اصل منصوبہ آیا، انہوں نے ساحل سے حرکت کی اور سلطانی جہازوں سے برسرِ پیکار ہونے کا ارادہ کیا لیکن ساحل پر موجود سلطانی توپ خانے ان کے عزائم خاک میں ملا دیتے۔

شاخ زریں کے سامنے والی فصیل پر موجود عیسائیوں نے جب یہ دیکھا کہ اب سلطانی بیڑہ شمالی سمت سے بھی حملہ آور ہونے والا ہے تو ان کی ہمتیں جواب دے گئیں۔ یہ ۲۷ مئی ۱۴۵۳ء کی بات ہے، سلطان نے اپنے عساکر میں اعلان کرا دیا کہ ۲۹ مئی کی صبح سے فیصلہ کن حملہ کر دیا جائے گا۔

۲۸ مئی کی صبح، قسطنطنیہ کے ایک دروازے سے چند آدمی نمودار ہوتے ان کے گھوڑوں کا رخ ترک لشکر کی طرف تھا اور جو شخص سب سے آگے تھا اس کے ہاتھ میں سفید جھنڈا تھا۔ سلطان سمجھ گیا کہ یہ صلح کا وفد ہے۔ اس نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا "آنے والوں کو گزند نہ پہنچایا جائے"۔

دھوپ کی کمزور شعاعوں میں ان کے سفید لباس بہت اچھے لگ رہے تھے اور ان کی داڑھیاں ہوا میں لہرا رہی تھیں۔ ان لوگوں نے ترکوں کے لشکر کے قریب پہنچ کر پکار کر کہا۔ "ہم ترکوں کے سلطان کے پاس امن و صلح کا پیغام لے کر حاضر ہوتے ہیں"۔ سلطان نے اپنے گھوڑے کو ذرا آگے بڑھایا، اس کے ساتھ ہی محافظ دستے نے بھی حرکت کی، سلطان نے ان کے قریب پہنچ کر گھوڑے کی لگام کھینچ کر اسے روکنا چاہا تو اس کا سرکش گھوڑا الف ہو گیا، سلطان نے اسی حالت میں بلند آواز میں پوچھا "کیسی صلح؟ کیسا امن؟ اب اس کا وقت گزر چکا!"

عیسائیوں کے وفد کا قائد گویا ہوا "قسطنطنیہ اس امن و صلح کے عوض سلطان

کا منہ مانگا خراج ادا کرنے کو تیار ہے۔ اس کی درخواست ہے کہ سلطان ایک بار قسطنطین کو
معاف کردے وہ اس معافی کے بدلے سلطان کی ماتحتی اور باجگذاری قبول کرنے پر آمادہ
ہے۔"

سلطان نے پھر وہی الفاظ دُہراتے "میں قسطنطنیہ کو فتح کئے بغیر ہرگز واپس نہ
جاؤں گا، ہاں تمہارا قسطنطین اگر پسند کرے تو اسے جان کی امان دی جا سکتی ہے اور وہ جنوبی
یونان پر بدستور حکمران رکھا جا سکتا ہے۔"

وفد مایوس ہو کر واپس چلا گیا۔

توپوں نے گولا باری شروع کر دی، اب قسطنطنیہ کی فصیلوں پر شمال اور جنوب
دونوں ہی طرف سے گولا باری ہو رہی تھی۔

وفد کے جواب نے قسطنطین کو بالکل مایوس کر دیا۔ اس نے امراء، عمائدین سلطنت
اور اپنے اعزا سے سینٹ ایا صوفیہ میں جمع ہو جانے کی خواہش کی۔ لوگوں کا ایک بہت بڑا ہجوم
عالم یاس میں اس مقدس مقام کے لئے روانہ ہوگیا۔ جو ان کے خیال میں ان کی آخری پناہ گاہ
تھی۔ قسطنطنیہ کا آخری مسیحی فرماں روا اپنے گھوڑے کو آہستہ آہستہ چلاتا ہوا ایا صوفیہ کے
دروازے پر پہنچا اور احتراماً گھوڑے سے اتر پڑا، اس کے ہمرکاب خدمت گار نے پھرتی سے
نیچے اُتر کر بادشاہ کے گھوڑے کی لگام تھام لی۔ قسطنطین باوقار انداز میں ایا صوفیہ کی دہلیز پر
پہنچ گیا۔ اس نے تاج شاہی اتار کر ہاتھ میں لے لیا۔

اندرون کی روشنی میں بھی شمعیں روشن کر دی گئی تھیں اور ان کی لو ہوا سے لہرا
رہی تھی۔ وہ منقش اور متبرک پردوں کے پاس سے گزرتا ہوا مقدس میز تک پہنچ گیا، حاضرین
نے کسی قدر سستی سے قسطنطین کا احترام کیا۔ اسقف اعظم نے اسے اپنے برابر بیٹھنے کی
جگہ دے دی۔ مقدس میز پر زرتار کپڑا بچھا تھا اور اس پر کڑھی ہوئی سنہری تصویریں جگمگا
رہی تھیں۔ قربان گاہ کے اوپر حضرت مریمؑ کی تصویر تھی ان کے جسم پر گہرے نیلے رنگ کا لبادہ
تھا۔ حضرت مریمؑ کے اوپر ایک دھندلے چہرے کے مدھم سے نقوش ابھر رہے تھے
یہ حضرت مسیح کی شبیہہ تھی۔ ان کے اوپر فرشتوں کی تصویریں تھیں جو اپنے بازوؤں کو پھیلائے
ہوئے تھے۔

پورے مجمع کی مجموعی کیفیت سے ایسا لگتا تھا گویا یہ سارے آدمی کسی کی موت کے
سوگ میں یکجا ہو گئے ہیں۔ ان کی آنکھوں سے حسرت و غم اور مایوسی جھلک رہی تھی، اور
چہروں پر ایک ایسی اداسی طاری تھی، جسے [illegible] کہا جا سکتا ہے۔ وہ ایک دوسرے کو اس انداز

دیکھ رہے تھے گویا وہ اُن کے دکھ کو ہلکا کرنے کے لئے تسلی آمیز کلمات ادا کرے گا لیکن
ہی دکھ اور ایک ہی غم کا ہر کوئی شکار تھا۔

ایا صوفیہ میں دیر تک آہ و بکا کے درمیان دشمنوں کی پسپائی اور ناکامی کی دعائیں
جاتی رہیں۔ اسی دن شام کو یونانی امرا اور اتحادیوں کے بہترین بہادروں کو شاہی محل
مدعو کیا گیا۔ یہ ان کی آخری مجلس مشاورت تھی۔ قسطنطین نے اپنی پرجوش تقریر سے افسردہ
مایوس دلوں میں گرمی پیدا کرنے کی کوشش کی، لیکن اس کے سامعین خود اس کے چہرے
کی اپنی ہی جیسی مایوسی اور ہراس دیکھ رہے تھے۔ تقریر کے بعد وہ سب آپس میں
ملنے لگے۔ اُن کی آنکھوں سے آنسو اور ہونٹوں سے آہیں نکل رہی تھیں۔ اس کے بعد
قسطنطین نے اپنے ساتھیوں سے کہا "میں ان سب سے معافی اور معذرت چاہتا ہوں جنہیں
میں نے دانستہ یا نادانستگی میں کسی قسم کی اذیت پہنچائی ہو" محل سے نکل کر وہ گھوڑے
پر سوار ہوا اور فصیلوں کی نگرانی کے لئے چلا گیا۔

۲۹ مئی ۱۴۵۳ء کی صبح سلطان کے حکم کے بموجب دونوں طرف سے حملے کا
آغاز کر دیا گیا۔ توپیں گولے اگلنے لگیں اور فصیلوں میں شگاف پڑنے لگے۔ سلطان عصائے
شاہی لئے فوجیوں کی ہمتیں بڑھا رہا تھا۔ مسلمان دیوانہ وار فصیلوں سے ملی ہوئی خندقوں
کو عبور کرنے کی کوشش میں دفن ہوتے جا رہے تھے۔ لیکن وہ ہمت ہارنے کا نام نہ لیتے
اس دوران سلطان کی توپوں نے فصیلوں کو جگہ جگہ سے منہدم کرنا شروع کر دیا، فصیل
کا ملبہ خندقوں میں گرا، جس سے خندق خود بخود پٹتی چلی گئی، مسلمان ان حصوں
کے نیچے پہنچ گئے عیسائی ان منہدم شدہ حصوں میں دیوار کی طرح کھڑے ہو گئے
اور غیر معمولی مدافعتی قوت سے مسلمانوں کے سیلاب کو روک دیا، اس کشمکش میں حسن
ینی چری اپنے تیس ساتھیوں کے ہمراہ فصیل پر چڑھنے لگا۔ عیسائیوں نے پتھراؤ کر
کے ان میں کے اٹھارہ آدمیوں کو گرا دیا لیکن خود حسن اپنے بارہ ساتھیوں کو لے کر فصیل پر چڑھ
گیا۔ ابھی وہ فصیل پر اچھی طرح کھڑا بھی نہ ہوا تھا کہ عیسائیوں نے اسے فصیل سے نیچے
دھکیل دیا، وہ نیچے گر کے ایک بار پھر اٹھا، اور گھٹنوں کے بل اٹھنے کی کوشش کی لیکن اسی
وقت فصیل کے اوپر سے پتھروں اور اینٹوں کی بارش کر دی گئی اور حسن ینی چری اس میں ہمیشہ
کے لئے دفن ہو گیا۔

سلطان، حسن ینی چری کی ہمت و شجاعت کا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا
اس نے عصائے شاہی کو بلند کرتے ہوئے اعلان کیا "آج کے معارکے کا ہیرو حسن ینی چری

ہے اور یہ اگر زندہ رہتا تو ہمارے انعام کا مستحق ٹھہرتا۔" سلطان نے اپنے ایک خدمت گار کو حکم دیا۔ "تم اسی وقت ہمارے پیر و مرشد کے پاس جاؤ اور ان سے کہو، خدا کی بارگاہ میں سجدہ ریز ہو کر فتح کی دعا کریں۔"

میدان کارزار سے دور، ترک کے سپاہیوں کے عقب میں، جہاں ان کے خیموں کی قطاریں دور تک پھیلی چلی گئی تھیں، یہیں شاہی خیمے کے قریب سلطان کے پیر و مرشد کا خیمہ تھا، سلطانی خدمت گار جب خیمے کے دروازے پر پہنچا تو پیر مرشد کے ایک داسنے سختی سے کہا۔ "تم اندر نہیں جا سکتے، کیونکہ پیر مرشد کا حکم ہے کہ اس وقت کسی کو بھی اندر نہ جانے دیا جائے۔"

شاہی خدمت گار نے اکڑ کر جواب دیا۔ "میں سلطان کے حکم سے پیر مرشد کے پاس آیا ہوں تم مجھے اندر جانے سے نہیں روک سکتے۔" اس نے خیمے کے پہرے دار کو دھکا دیا اور خیمے کے اندر داخل ہو گیا۔ وہاں پیر مرشد سجدے میں پڑے گریہ و زاری میں مشغول تھے۔

شاہی خدمت گار نے ادب سے عرض کیا۔ "پیر مرشد! سلطان کا پیغام!"

پیر مرشد نے سجدے سے سر اٹھایا تو ان کی داڑھی آنسوؤں سے تر نظر آئی۔

"سلطان کا پیغام؟ عرض کرو۔"

خدمت گار نے عرض کیا۔ "شہر کی تسخیر کی دعا۔"

پیر مرشد نے جواب دیا۔ "قسطنطنیہ کا بادشاہ ہلاک ہوا، شہر فتح ہو گیا تم سلطان کے پاس واپس جاؤ۔"

خدمت گار یہ بشارت لے کر فوراً ہی خیمے سے باہر نکلا اور سلطان کی طرف چل پڑا۔

* * *

مسلمان ٹوٹی ہوئی فصیلوں کی راہ سے شہر میں داخل ہو گئے۔ فصیل کے عیسائیوں نے نیچے اتر کر انہیں روکنے کی کوشش کی تو مسلمان فصیلوں پر چڑھ کر شہر میں اتر گئے، عیسائیوں کی دفاعی قوت جواب دیتی جا رہی تھی۔ عام عیسائیوں میں قسطنطین بھی گھس کر اور بے جگری سے حملہ آور ہو کر مسلمانوں کو روک دینے کی کوشش کی، کسی طرف سے ایک سنسناتا ہوا تیر ٹھیک بادشاہ کے سینے کی طرف آیا اور بائیں طرف، پسلی کی دیوار کو چھید کر دل میں اتر گیا، بادشاہ تیورا کر گر گیا، شدت کرب سے اس کی آنکھیں بند ہو گئیں اور پیشانی پر شکنیں پڑ گئیں، اس کے آس پاس جنگ جو عیسائیوں کو پتہ بھی نہ چل سکا کہ بہت سی

لاشوں کے درمیان اُن کا بادشاہ بھی پڑا سسک رہا ہے۔ کچھ دیر بعد قسطنطین نے آنکھیں کھول دیں اور بمشکل اپنے شاہی لباس کو جسم سے اتار دیا اور کسی معمولی سپاہی کا لباس پہن لیا کیونکہ وہ نہیں چاہتا تھا کہ ترک اس کی لاش کو پہچان کر بے حرمتی کریں۔ اس کی بے قراری کا یہ عالم تھا کہ اسے اب بھی خود کے پہچانے جانے کا دھڑکا لگا تھا، اس نے کپکپاتی آواز میں کہا۔ "کیا یہاں کوئی عیسائی نہیں ہے جو میرے سر کو تن سے جدا کر دے، کیونکہ میں جیتے جی مسلمانوں کی قید میں جانا پسند نہیں کرتا۔"

لیکن وہاں کوئی بھی عیسائی موجود نہیں تھا، جو بادشاہ کے حکم کی تعمیل کرتا۔ کچھ دیر بعد عام مسلمان سپاہی بھی وہاں پہنچ گئے اور ان میں سے کسی ایک نے بادشاہ کو معمولی سپاہی سمجھ کر، زندگی کے آثار کے پیش نظر ایک ہی وار میں اسے ختم کر دیا۔

ترکوں کا سیلاب جب جنوبی حصوں سے داخل ہو کر شہر میں داخل ہوا تو شہر کے شمالی حصوں سے داخل ہو جانے والوں کا سیلاب ان کے استقبال کو موجود تھا، شاخ زریں کے اتنی جہازوں کے فوجی ان سے پہلے ہی شہر میں داخل ہو چکے تھے اور شمالی فصیل پر فتح کا پرچم لہرا رہا تھا۔

عیسائیوں نے راہ فرار اختیار کی اور وہ محلوں اور گھروں کے بجائے عبادت گاہوں میں پناہ لینے لگے۔

سلطان کا خدمت گار جب پیر مرشد کے پاس سے سلطان کے قریب پہنچا تو اس نے بھی اپنی آنکھوں سے سلطانی پرچم کو لہراتے ہوئے دیکھ لیا، اس نے فرط جوش میں کہا۔ "قسطنطنیہ کی تسخیر فوج سے نہیں، دعا سے ہوئی ہے۔"

چاروں طرف سے سلطان کو فتح مندی کی مبارکبادیں ملنے لگیں۔ سلطان کے چہرے پر اب بھی بے اطمینانی پائی جاتی تھی۔ خلیل پاشا نے ادب سے پوچھا۔ "حضور والا کو اب تو خوش ہو جانا چاہیے، کیونکہ خدا نے قسطنطین کے اقبال کو خاک میں ملا دیا ہے۔"

سلطان نے جواب دیا۔ "مجھے اس وقت تک اپنی فتح کا یقین نہیں آئے گا جب تک میں قسطنطین کی لاش خود اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لوں گا۔"

اس کے بعد سلطان نے لاشوں کے ڈھیر میں قسطنطین کی لاش کی تلاش کا کام شروع کرا دیا۔

کافی دیر بعد دو ینی چری ایک معمولی سپاہی کی لاش کو اٹھا کر سلطان کے پاس لاتے اور عرض کیا۔ "حضور والا! مسیحی فرماں روا کی لاش حاضر ہے۔ ملاحظہ فرمائیں۔" سلطان

نے اس لاش کو غور سے دیکھا، جس کا سر ایک ینی چری کی کلائی سے نیچے لٹک رہا تھا، ہاتھ پر اس کی ٹانگیں لٹکی ہوئی تھیں اور ایک تیر اس کی بائیں پسلی کے اندر پھنسا ہوا تھا۔

سلطان نے پوچھا "تم دونوں نے اسے کس طرح پہچان لیا کہ یہ معمولی سپاہی کے لباس میں بادشاہ کی لاش ہے؟"

ایک ینی چری نے مرنے والے بادشاہ کے جوتوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "ان جوتوں سے، جن پر دو طلائی عقاب بنے ہوئے تھے، ایسے جوتے بادشاہ کے سوا کوئی اور نہیں پہن سکتا"

سلطان نے معزز عیسائیوں کو طلب کیا اور قسطنطین کی لاش کو پہچاننے کا کہا، عیسائیوں نے روتے ہوئے تصدیق کر دی، کہ ہاں یہ ان کے بادشاہ کی ہی لاش ہے، اسی وقت سجدے میں گر گیا اور دیر تک خدا کا شکر ادا کرتا رہا یہ ۲۹ مئی ۱۴۵۳ء جمعہ کا دن تھا، ایا صوفیہ کے دروازے اندر سے بند کر لیئے گئے تھے، سلطان کے حکم سے دروازوں پر کلہاڑیوں کی بارش کر دی گئی۔ اور ذرا سی دیر بعد یہ لوگ ایا صوفیہ میں داخل ہو گئے۔ وہاں پناہ گزیں شہریوں کو رسیوں سے جکڑ دیا گیا، سلطان گھوڑے کو دوڑاتا ہوا گھوڑ دوڑ کے میدان میں پہنچ گیا۔ اس کے دائیں بائیں اور پیچھے اس کے وزراء اور محافظ تھے۔ گھوڑ دوڑ کے میدان میں گھوڑوں کی رفتار سست کر دی گئی اور سلطان میدان کے چاروں طرف بنی ہوئی عظیم الشان عمارتوں کو دیکھنے لگا، یہاں تین ستون سانپوں کی طرح بل کھائے کبر و نخوت کے انداز میں کھڑے تھے یہ ستون اژدھوں کی شکل میں بنائے گئے تھے، ان کے منہ نیچے کی طرف تھے۔ سلطان نے گھوڑے سے اتر کر اپنی جنگی کلہاڑی کی ایک ہی ضرب سے ایک اژدھے کے جبڑے کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ یہاں سے وہ ایا صوفیہ کی طرف روانہ ہو گیا۔ وہ ایا صوفیہ کے مرکزی دروازے پر گھوڑے سے اتر پڑا۔ یہاں اس نے ایک مسلمان سپاہی کو ایا صوفیہ کے ایک چبوترے سے سنگ مرمر کی سل اکھاڑتے دیکھا، سلطان غصے سے آگے بڑھا اور اپنے عصائے شاہی کی ایک ہی ضرب سے اسے ڈھیر کر دیا۔

سلطان دیر تک ایا صوفیہ میں گھومتا رہا۔ وہ اپنے محافظوں اور سپاہیوں کو مختلف احکام بھی دیتا جا رہا تھا۔ ان احکام کے زیر اثر گرجے کا سامان پرستش ہٹا دیا گیا، صلیبیں گرا دی گئیں اور در و دیوار پر بنی ہوئی آسمانی شبیہیں ہٹا دی گئیں، ان امور سے فارغ ہونے کے بعد سلطان نے شاہی مؤذن کو حکم دیا کہ ایا صوفیہ کے سب سے اونچے برج پر چڑھ کر اذان دی جائے۔ مؤذن نے اسی وقت تثلیث کے بلند بالا برج سے خدائے لاشریک کی وحدانیت اور رسول مقبولؐ کی نبوت کا اعلان کرتے ہوئے مسلمانوں کو نماز کے لئے جمع ہو جانے کی دعوت دی۔ سلطان نے عام مقتدیوں کی صف میں کھڑے ہو کر نماز شکرانہ اور نماز ظہر ادا کی۔ اس کو یہ فتح ۵۳ دن کے محاصرے کے بعد ۱۴۵۳ء میں حاصل ہوئی تھی۔ اس محاصرے کا آغاز ۶ اپریل سے ہوا اور ۲۹ مئی کو اختتام کو پہنچا، اس طرح مورخ جبن نے سقوط قسطنطنیہ سے اپنی مشہور تاریخی اصطلاح ازمنہ وسطیٰ (MIDDLE AGES) کے لئے ۲۹ مئی ۱۴۵۳ء کو آخری حد قرار دیا جس کا آغاز ۴۷۶ء میں بربریوں کے ہاتھوں روما الکبریٰ کے زوال سے ہوا تھا۔

ایا صوفیہ سے فارغ ہو کر سلطان اس عظیم الشان شاہی محل کی طرف گیا جو اس وقت تک یکے بعد دیگرے قسطنطین اعظم کے تاج جانشینوں کی رہائش گاہ رہ چکا تھا، اس وقت وہ ویران ہو چکا تھا اور اس کی شاہانہ شان و شوکت خود سلطان کے ہاتھوں چند گھنٹے قبل چھینی جا چکی تھی۔ اس کی ویرانی کا سلطان کے دل پر بڑا اثر ہوا، اس کی زبان سے فارسی کا ایک شعر نکل گیا۔

پردہ داری می کند بر قصر قیصر عنکبوت
بوم نوبت می زند بر گنبد افراسیاب

(تار عنکبوت قیصر کے محل کی پردہ پوشی کر رہے ہیں اور افراسیاب کے مقبرے کے گنبد کے نیچے بیٹھا ہوا الو نوبت بجا رہا ہے)

بائیس سالہ سلطان نے قسطنطنیہ کا نام بدل کر اسلامبول رکھ دیا جو بعد میں استنبول ہو گیا۔

فتح قسطنطنیہ کی طرف سے فراغت پا کر سلطان نے یونانی گرجے کا انتظام سابق اسقف ہی کے سپرد کر دیا اور خود اڈریانوپل واپس گیا۔ یہاں اینجل کو فتح قسطنطنیہ کا حال معلوم ہی ہو چکا تھا اور اب وہ اپنی زندگی کے دن گن رہا تھا۔ اسے یقین تھا کہ اس مہم کی کامیابی تک وہ ضرور زندہ رہے گا۔ اس کے بعد سلطان اڈریانوپل واپس آ کر اس کی موت کا فرمان صادر کر دے گا۔ اس دوران وہ شہزادی ماریہ سے بھی نہیں مل سکا، امید کی ساری کرنیں زائل ہو چکی تھیں۔ مایوسی اور غم نے اس کی صحت کو تباہ کر کے رکھ دیا تھا۔ سلطان نے قصر جہاں نما کے اس حصے میں، جس کے سامنے ایک وسیع و عریض اکھاڑہ سا بنا ہوا تھا اینجل کو طلب کر لیا۔ زرد رو اور تباہ حال اینجل جب سلطان کے روبرو پہنچا۔ اس وقت

سلطان کے آس پاس امرا اور معززین کی اچھی خاصی تعداد موجود تھی۔ یہیں سلطان کے سامنے ایک اور شخص بھی کھڑا ہوا تھا۔ یہ شخص اینجل سے زیادہ لاغر اور عمر رسیدہ دکھائی دیتا تھا۔ اینجل کو بھی اس شخص کے برابر ہی جا کر کھڑا کر دیا گیا۔ رعبِ سلطان سے وہ دربار کو اچھی طرح دیکھ بھی نہ سکتا تھا۔

سلطان نے اینجل سے پوچھا "اینجل! تم اس شخص کو پہچانتا ہے؟"

اور سلطان نے اینجل کے قریب ہی کھڑے ہوتے دوسرے شخص کی طرف اشارہ کیا اینجل نے اس پر سرسری نظر ڈال کر جواب دیا "جی نہیں حضورِ والا!"

سلطان نے کہا "یہ مائیکل ہے تیرا رقیب، تو اسے نہیں پہچانتا؟"

اینجل نے مائیکل کو گھبرا کر دیکھا اور اس وقت تو اس کی حیرت اپنے عروج پر پہنچ گئی جب اس نے مائیکل کی جگہ ایک منحنی غبار سا مائیکل کا ہیولا دیکھا وہ اینجل سے زیادہ تباہ و برباد ہو چکا تھا۔

سلطان نے ان دونوں کو مخاطب کیا "تم دونوں کا اپنی سزاؤں کے بارے میں کیا خیال ہے یعنی میں تمہیں کیا سزا دے سکتا ہوں؟"

مائیکل نے جواب دیا "میں نے تو حضورِ والا کو ایک ایسے خطرے سے قبل از وقت ہی مطلع کر دیا تھا کہ اگر میں چشم پوشی، تساہل یا لاتعلقی سے کام لیتا تو شاید سلطنتِ ترکیہ میں کوئی غیر معمولی سانحہ رونما ہو چکا ہوتا۔"

سلطان نے اینجل کی طرف دیکھا، اس نے اٹک اٹک کر جواب دیا "حضورِ والا! میں اپنی موت کا انتظار کر رہا ہوں۔"

سلطان نے مائیکل کو دوبارہ مخاطب کیا "میں تیرے جواب سے مطمئن نہیں ہوا۔" مائیکل نے مسکرانے کی کوشش کی اور اس کوشش میں کسی مردے کا چہرہ حاضرین کی نظروں میں پھر گیا اس نے کہا "حضورِ والا! میں اپنی خدمت کے صلے میں انعام و اکرام کی امید لگائے بیٹھا تھا اور حضورِ والا سزا کی بات کر رہے ہیں۔"

سلطان نے ترشی سے کہا "تو نے ایک لڑکی کی محبت اور اینجل کی رقابت میں یہاں تک آنے کی زحمت گوارا کی ہے تو اینجل کو اپنی راہ سے ہٹانے کے لئے یہ خطرناک کھیل کھیل بیٹھا ہے۔ اس لئے میں تجھے بھی بے گناہ نہیں سمجھتا، تو نے اپنے ایک ہم وطن سے غداری کی ہے اور یہ جرم ناقابلِ معافی ہے۔"

مائیکل سلطان کے قدموں میں گر گیا "شاہوں کے شاہ رحم۔"

سلطان نے پوچھا "تو فنِ سپاہ گری جانتا ہے؟"

"خوب اچھی طرح۔"

سلطان اینجل کو اچانک مخاطب کیا "اینجل! تو مائیکل سے مقابلہ کرے گا، میں یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ چھل فریب اور عیاری مکاری کے علاوہ تم دونوں میں سے کس میں اتنی قوت ہے کہ وہ محض اپنی قوتِ بازو سے ہیلن کو حاصل کر لے۔"

اینجل فوراً آمادہ ہو گیا لیکن مائیکل نے پہلو تہی اختیار کی، بولا "میں نے ایک عرصے سے تلوار چھوئی بھی نہیں۔ اس لئے فی الحال اس مقابلے کو ملتوی فرما دیا جائے۔"

سلطان نے کہا "ایسا نہیں ہو سکتا۔"

چند امرا نے بھی فوری مقابلے پر اصرار کیا۔ آخر بدرجۂ مجبوری دونوں کو ایک ایک تلوار تھما کر اکھاڑے میں اتار دیا گیا، دونوں نحیف و نزار اور زندگیوں سے بیزار تھے۔ انہوں نے شاید یہ سوچ لیا تھا کہ اپنی اپنی زندگی کی اس سب سے بڑی اور قیمتی بازی میں انہیں غیر معمولی جرات و شجاعت کے جوہر دکھانا ہیں۔ مائیکل ایک شہزادہ تھا اور اینجل ایک عام سا معمولی لیکن فنِ سپاہ گری کا ماہر تھا۔

سلطان کے اشارے پر مقابلہ شروع ہو گیا۔ دونوں ہی بہت جلدی تھک بھی گئے ان دونوں میں سے کسی ایک کے بھی زیر ہونے کا منظر دیکھ کر امرا اور دوسرے درباری بھی تالیاں بجا بجا کر خوشی کا اظہار کر رہے تھے۔ تقریباً نصف گھنٹے کے مقابلے میں اینجل نے مائیکل کو زیر کر لیا اور اس کے سینے میں تلوار کی نوک پیوست ہو گئی۔ مائیکل چیخ مار کر گر گیا۔

اینجل نے فرطِ جوش میں اپنی خون آلود تلوار فضا میں بلند کی اور نعرہ لگایا "لوگو! ادھر میری طرف دیکھو، میں اینجل ہوں، میں نے اپنے بد باطن اور بدطینت حریف کو زیر کر لیا ہے اور اس کے صلے میں، میں سلطان معظم سے رحم کی درخواست کرنے میں حق بجانب قرار دیا جاؤں گا شاید۔"

سلطان نے نفرت سے جواب دیا "نہیں، تو اپنی جیت کے صلے میں رحم کی درخواست بالکل نہیں کر سکتا۔ آخر تو نے یہ کس طرح باور کر لیا کہ میں تجھے معاف بھی کر سکتا ہوں۔ اپنے ایک ایسے دشمن کو جو ایک لڑکی کی خاطر اپنے آقا، اپنے ولی نعمت کو قتل کر دینا چاہتا تھا۔"

سلطان کے اشارے پر شاہی خدام دم توڑتے ہوئے مائیکل کو اٹھانے گئے۔ سلطان نے دربار برخاست کر دیا اور اینجل کے لئے حکم دیا "اسے کل دوبارہ بغرض فیصلہ پیش کیا جائے۔" شاہی خدمت گاروں نے اینجل کو دونوں طرف سے جکڑ لیا اور کھینچتے ہوئے زندان میں ڈال آئے۔ اس وقت اینجل کے حواس خمسہ رخصت ہو چکے تھے، ہچکیوں سے دم

کھینچ رہا تھا۔ زنداں کی وہ رات بڑی بھاری نکلی۔ بڑی کوشش کی کہ دوسرے دن آنے والا ہے اس کا ہمت اور حوصلے سے استقبال کرے لیکن وہ اپنی اس کوشش میں ناکام رہا۔ رات کے پچھلے پہر نیند نے ذرا غلبہ کیا تو اس میں اسے اپنے سر پر جلاد کی شمشیر نظر آتی رہی۔

دوسرے دن فجر کی نماز کے فوراً بعد ہی سلطان نے اینجل کو طلب کر لیا۔ اس وقت سلطان بالکل تنہا تھا، سلطان اسی وقت نماز سے فارغ ہوا تھا۔ شاہی خدمت گاروں کو چلے جانے کا حکم دیا گیا۔ جب اس تخلیے میں سلطان اور اینجل کے علاوہ تیسرا کوئی نہ رہا سلطان نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔ اس نے ایک گٹھری کی طرف اشارہ کرتے ہوتے کہا۔ "اینجل اٹھا لو اور اسی وقت اڈریانوپل کی حدود سے نکل جاؤ۔"

اینجل یہ جاننا چاہتا تھا کہ آخر اس گٹھری میں ہے کیا، لیکن سلطان نے اس کا موقع ہی نہ دیا، اس نے مزید کہا۔ "تو نے ہمارا نمک کھایا ہے تیری خدمات بھی ہیں۔ اگر میں تیرے قتل کا حکم صادر کر دیتا تو ہم دونوں میں کوئی فرق باقی نہ رہتا۔ لیکن میں سلطان ہوں، صاحبِ اختیار ہوں۔ میں قسطنطنیہ کا فاتح سلطان محمد، اپنے ایک ادنیٰ خدمت گار کی نادانی اور کم عقلی کے جواب میں خود بھی تو نادانی اور کم عقلی کا مظاہرہ نہیں کر سکتا۔" اس کے بعد بار پھر گٹھری کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ گٹھری سنبھال اور اسی وقت اڈریانوپل کی حدود سے نکل جا، سرویا کے بادشاہ سے مل کر میری طرف سے کہہ دے کہ سلطان نے کہا ہے تیری شرط پوری کر دی گئی ہے اب وہ ہیلن کو تجھ سے وابستہ کر دے۔"

سلطان کی باتوں کا مطلب اینجل کی سمجھ میں نہ آیا۔ اس نے گٹھری سنبھالی، کھڑا سلطان کی خلافِ توقع عفو و درگزر نے اینجل کے دل کو گداز کر دیا تھا، اس نے ڈبڈبائی آنکھوں سے سلطان کی طرف دیکھا، سلطان نے اپنا منہ دوسری طرف کر لیا تھا اینجل ادب سے جھک کر سلطان کو الوداعی سلام کیا اور باہر نکل گیا۔

اس کے جاتے ہی سلطان نے تالی بجا کر خدمت گاروں کو طلب کیا اور انہیں حکم دیا۔ "اینجل کو بحفاظت اڈریانوپل کے باہر چھوڑ دیا جائے۔"

اس حکم کی حرف بہ حرف تعمیل کی گئی اور اینجل کو اڈریانوپل کی حدود سے باہر نکال دیا گیا۔ گٹھری کا معمہ اسے پریشان کئے ہوتے تھا، اس نے موقع پاتے ہی ایک درخت کے سائے میں دم لیا اور گٹھری کو کھول کر اس کا جائزہ لیا۔ اس میں سلطان کا خنجر، پیٹی، لباس رکھا ہوا تھا، اس سامان کے ساتھ ہی ایک پرچہ بھی رکھا تھا۔

"یہ ہے وہ سامان، جو تجھے ہیلن کے لئے درکار تھا۔ جا اسے شاہ سرویا کی خدمت میں پیش کر دے اور اس سے اپنی ہیلن حاصل کر لے اگر بادشاہ ہیچر میچر کرے تو اس سے کہہ دینا کہ میں عنقریب سرویا بھی پہنچ رہا ہوں اور خدا بدعہدوں اور عہد و پیمان سے پھر جانے والوں کو معاف نہیں کرتا۔"

اینجل کی خوشی کی کوئی حد نہ رہی اور وہ سلطان کی فراخ دلی کا دل ہی دل میں قصیدہ پڑھنے لگا۔

★ ★ ★

شاہِ سرویا نے اینجل سے سلطان کی نشانیاں لے لیں اور مائیکل کی بابت دریافت کیا، اور جب اسے مائیکل کی دردناک موت کا علم ہوا تو اس کے غم و غصہ کی حد نہ رہی، اس نے کہا۔ "مائیکل میری بہن کا بیٹا تھا، میں اپنی بہن کے بیٹے کے قاتل سے اپنی ہیلن کو کس طرح وابستہ کر سکتا ہوں اور پھر اس صورت میں کہ تجھے سلطان کی جو نشانیاں مردانہ وار لانا تھیں انہیں تو نے دریوزہ گری سے حاصل کیا ہے پھر تو ہیلن کا حقدار کس طرح ٹھہرا۔"

اینجل شاہ سرویا سے بحث تو نہیں کر سکتا تھا اس نے چپکے سے سلطان کا پرچہ اپنے بادشاہ کی طرف بڑھا دیا۔ بادشاہ نے پرچہ پڑھ کر اینجل کو ڈانٹنا شروع کر دیا۔ "وہ سرویا کا رخ کرے گا، اگر اس نے ایسی غلطی کی تو اسے مزہ چکھا دیا جائے گا اور جہاں تک میری بیٹی ہیلن کا تعلق ہے۔ اسے ہنگری کے ایک شہزادے سے منسوب کیا جا چکا ہے اب تو اس کی صورت تک نہیں دیکھ سکتا۔"

اینجل کے دل کو ایک دھکا سا لگا۔ سرویا کے بادشاہ نے اسے اسی وقت نکلوا دیا۔ اس مایوسی کے عالم میں ذرا سی دیر کے لئے شہزادی ماریہ کا خیال بھی آیا۔ لیکن اس خیال کے ساتھ ہی اس کے سارے جسم میں خوف اور کپکپی کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔ اڈریانوپل کی واپسی اور شہزادی ماریہ تک رسائی۔ اس کی دانست میں یہ ایک شاہراہ تھی، جو اسے موت کے دروازے تک پہنچا دیتی۔ اس دروازے کے اس پار نہ تو ماریہ تھی اور نہ ہیلن، وہاں کیا تھا یا کیا ہے؟ اس کا جواب نہ تو ماضی میں کسی نے دیا ہے اور نہ مستقبل میں دیا جا سکتا ہے۔

اینجل ناکام و نامراد ہی رہا لیکن سلطان کی یہ پیشین گوئی کہ۔ "خدا بدعہدوں اور عہد و پیمان سے پھر جانے والوں کو معاف نہیں کرتا۔" پوری ہو گئی کیونکہ دس سال کے اندر ہی سرویا کو سلطان کی مملکت میں شامل کر لیا گیا۔ ★

رشتوں کی صلیب

ہارون اور منیزہ خوش و خرم زندگی گزارنے لگے۔ عامر بھی بہت خوش تھا۔ شروع
رع میں منیزہ نے اپنی کارکردگی کی مثال قائم کر دی۔ عامر کو اپنے ہاتھوں سے غسل دینا،
ن ستھرا رکھنا اور کھانے پینے کا خاص خیال رکھنا، یہ سب اس کے روزمرہ میں داخل تھا
ن کو سونے سے پہلے وہ عامر کو دلچسپ حکایتیں سناتی رہتی، عامر کسی بات پر روٹھتا تو
ہ سو جتن کر کے منا لیتی۔ ہارون کا باپ یہ سب بڑی دلچسپی اور شوق سے دیکھ رہا تھا۔
ہ کی ہر بات اچھی لگتی تھی مگر ایک بات وجہ نزاع تھی۔ وہ مال و زر اور درہم و دینار کو
نہی قبضے میں رکھنا چاہتا تھا اور یہ بات منیزہ کو ناپسند تھی کہ اس کے ہوتے ہوئے یہ
ھا آدمی اس کے گھر کا مالک و مختار بنا بیٹھا رہے۔ وہ ہارون کے باپ کو ہر طرف سے
خل کر دینا چاہتی تھی۔ اس نے عامر کو اس بُری طرح اپنے قبضے میں کیا تھا کہ اب وہ
کے پاس جاتے ہوئے گھبرانے لگا تھا۔ دادا کو یہ بات ناگوار گزر رہی تھی لیکن اس کے
بعد اسے منیزہ سے کوئی شکایت نہیں تھی، کیونکہ اس نے ابھی تک مال و زر اور درہم و دینار
وئی سروکار نہیں رکھا تھا۔

ہارون خراسان واپس جانا چاہتا تھا لیکن جانے سے پہلے چند خطرات اُسے
زدہ کر رہے تھے۔ وہ اپنے بہنوئی کی طرف سے مطمئن نہیں تھا اور ہمیشہ یہ خدشہ محسوس
رہتا تھا کہ وہ کسی وقت بھی حملہ کر سکتا ہے۔ حملے کی نوعیت کیا ہوگی؟ یہ نہیں جانتا تھا
نے اپنے باپ کو بھی بار بار یہی سمجھایا کہ وہ اپنے داماد سے ہوشیار رہے اور منیزہ کو بھی
ر کیا کہ اس کے بہنوئی سے چوکنا رہے لیکن منیزہ جواب میں کہتی کہ اب ڈرنے کی کوئی بات
ا، شادی تو ہو چکی۔ ہاں اگر شادی نہ ہوئی ہوتی تو خوف کی بات تھی۔

ہارون نے سمجھایا۔ ”منیزہ! وہ چوٹ کھائے ہوئے سانپ کی طرح اپنی ناکامی کا
بدلہ لینے کی کوشش کرے گا۔“

منیزہ نے بات ہنسی میں اڑادی۔"وہ کیا بدلہ لے گا۔ اب تو وہ منہ دکھانے کے قابل بھی نہیں رہا۔"

کچھ دنوں بعد منیزہ کا باپ بھی آگیا۔ اس کا خیال تھا کہ ہارون کا سب کچھ اس کی بیٹی منیزہ کے قبضے میں ہوگا لیکن یہاں اپنی بیٹی کو اپنے شوہر کے باپ کا دست نگر دیکھ کر افسوس ہوا اور اپنی بیٹی کی حماقت پر غصہ بھی آیا۔ اس کا خیال تھا کہ بیٹی نے گھر کی ہر چیز اپنے قبضے میں کرلی ہوگی لیکن یہاں یہ دیکھ کر پریشان اور فکر مند ہوگیا کہ منیزہ کی حیثیت ثانوی رہ گئی تھی اور اس گھر میں جو کچھ بھی تھا ہارون کے باپ کا تھا۔

ہارون کے باپ نے منیزہ کے باپ کو خشمگیں نظروں سے دیکھا کیونکہ اس نے منیزہ کے باپ کی آنکھوں اور چہرے کے تاثرات میں خطرات محسوس کرلیے تھے جو منیزہ کے باپ کے دل و دماغ میں پرورش پارہے تھے۔ اس نے اپنے مہمان کا استقبال خوش دلی سے نہیں کیا منیزہ کے باپ نے بھی اس کدورت کو محسوس کرلیا۔ اس نے زمانہ سازی سے کام لیا۔ بولا۔

"شاید یہ شادی کبھی نہ ہوتی اگر مجھے یہ نہ معلوم ہوگیا ہوتا کہ تو نے اپنے بیٹے کو منیزہ سے شادی کرنے کی اجازت دے دی ہے، کیونکہ مجھ کو ہارون سے کبھی کوئی شکایت ہی نہیں رہی۔"

ہارون کے باپ نے جواب دیا۔"ہاں، میں نے یہ سوچ کر یہ رشتہ قبول کرلیا کہ ہمیں نوجوانوں کے جذبات اور احساسات کا خیال رکھنا ہی چاہیئے۔"

منیزہ اپنے باپ کے ساتھ برتی جانے والی سرد مہری کو بُری طرح محسوس کررہی تھی۔ رات کو ایک ہی دسترخوان پر سب ایک ساتھ بیٹھے۔ ہارون نے کھانے کے دوران منیزہ کے باپ سے کہا۔"کچھ دنوں بعد میں خراسان واپس چلا جاؤں گا، میری سلطنت میں آپ بھی یہیں منیزہ کے پاس آجایئے، دل بہلا رہے گا۔"

لیکن منیزہ کے باپ نے ابھی جواب دیا بھی نہ تھا کہ ہارون کا باپ بول اٹھا۔"گھر تو بس اپنا ہی ہوتا ہے، اگر مجھ سے کوئی یہ کہے کہ اپنے گھر کو چھوڑ کر میرے ساتھ رہ لو تو میں صاف انکار کردوں گا۔"

منیزہ کے باپ نے اپنے گال پر طمانچہ سا محسوس کیا، ہاتھ کا نوالہ منہ تک نہ لے جا سکا، بولا۔"اپنا گھر کسے نہیں اچھا لگتا لیکن تو نے جس طرح اور جس موقع پر اپنے گھر کی تعریف کی ہے میرے لئے یہ تعریف گالی بن گئی ہے۔ اب تو ہم دونوں ایک ساتھ کہیں بھی نہیں رہ سکتے۔"

ہارون کے باپ نے غیر جذباتی لہجے میں کہا۔"خدا کے فضل سے تو سمجھ دار انسان ہے، بیٹی کے گھر کو اپنا گھر سمجھنا بھی نہیں چاہیئے۔"

ہارون باپ کی باتوں پر کڑھتا جارہا تھا۔ وہ کھانا بھول گیا، بولا۔"بابا جان! یہ آپ کیسی باتیں کررہے ہیں؟ منیزہ کا باپ ہمارا مہمان ہے اور مہمانوں کی دل آزاری گناہ ہے۔"

باپ نے جواب دیا۔"ہارون! میں نے کسی کی بھی دل آزاری نہیں کی۔ میں نے ایک بات کہہ دی ہے۔ یوں بھی مشہور ہے الحق مُر، (سچائی کڑوی ہوتی ہے)۔"

منیزہ کھانا چھوڑ کر اٹھ گئی۔ بولی۔"بابا جان! آپ کل ہی یہاں سے چلے جایئے۔ یہ مہمانوں کے لیے تنگ ہے۔"

ہارون کے باپ نے غصے میں کہا۔"مہمانوں کے لیے نہیں، منصوبہ بازوں کے لئے کہو! میں تیرے باپ کے ارادوں سے اچھی طرح واقف ہوں اور جب تک میں زندہ ہوں یہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوسکتا۔"

منیزہ کے باپ نے جواب دیا۔"میرا کوئی مقصد نہیں، میں اپنی بیٹی کو خوش و خرم دیکھنا چاہتا ہوں، اگر میں لالچی ہوتا تو اس وقت تک اپنی بیٹی کی ہارون سے شادی ہی نہ کرتا جب تک میں اس کو الگ رہنے پر آمادہ نہ کرلیتا لیکن میں نے ایسا نہیں کیا۔" پھر ہاتھ ایک کپڑے سے پونچھتے ہوئے بولا۔"افسوس کہ میں یہاں آکر بہت شرمندہ ہوا۔ میں انسانی طبع اور خود غرضی کی خباثتوں پر ذرا سا بھی غور کرلیتا تو شاید اس شرمندگی اور ذلت سے محفوظ رہتا۔"

ہارون کے باپ نے غصے میں کپکپاتے ہوئے کہا۔"خوب۔ یعنی میں خود غرض لالچی ہوں۔ میرے ہی گھر میں میری برائی کرنا یہ تو کوئی تجھی سے ...."

ہارون دونوں کی تلخ کلامی سے دل برداشتہ ہورہا تھا۔ باپ کی بات کاٹتا ہوا بولا۔"بابا جان! ویسے یہ بڑی زیادتی کی بات ہے۔ آپ نے واقعی اپنے مہمان کی دل آزاری کی ہے، آپ کو اپنے مہمان سے معذرت کرنا چاہیئے۔"

باپ بیٹے پر برس پڑا۔"تو چپ رہ۔ معذرت کا مطلب ہے معافی مانگ لوں؟ ایسا نہیں ہوسکتا، قیامت تک ایسا نہیں ہوسکتا اور اب میرا فیصلہ بھی سن لے۔ تو نے منیزہ سے شادی کی ہے، اس لیے یہ منیزہ کا گھر ہے۔ منیزہ کا باپ یہاں نہ تو رہ سکتا ہے اور نہ ہی وہ مہمان بن کر آسکتا ہے۔ اس گھر میں میری مرضی کے خلاف کچھ بھی نہ ہوگا۔"

منیزہ کا باپ تلملا کر چیخا۔"جی کھول کے اہانتیں کرلے جتنا چاہے بول لے، لیکن یہ نہ بھول، کبھی کے دن بڑے کبھی کی راتیں۔ کوئی ایسا وقت بھی آسکتا ہے جب میں تجھے

تیری اہانتوں کا جواب دے سکوں۔"

منیزہ نے اپنے باپ کو سمجھایا۔ "بابا جان! میں شرمندہ ہوں، اگر مجھے یہ معلوم ہوتا کہ شادی کے بعد بھی کہ دونوں نہ ملیں گی اور آپ کو میری وجہ سے یوں ذلیل و خوار ہونا پڑے گا تو میں شادی ہی نہ کرتی۔"

ہارون کو اپنے باپ پر غصہ آ رہا تھا، بولا۔ "بابا جان! ہماری مہمان نوازی تو مشہور ہے، آپ ذرا تحمل سے کام لیجئے۔ اس گھر میں آپ ہی کا حکم چلے گا لیکن آپ اپنے حکم کو عدل و انصاف کے دائرے میں چلائیے۔"

باپ نے ایک بار پھر بیٹے کو ڈانٹ دیا۔ "مجھے تیرے مشوروں کی کوئی ضرورت نہیں ہارون! تو خاموش رہ ورنہ میں تیرے خلاف بھی جنگ کا اعلان کر دوں گا۔"

منیزہ کو رونا آ گیا۔ وہ ان سب کو چھوڑ کر ایک کمرے میں چلی گئی اور وہاں رونے لگی۔

ہارون کے باپ نے عامر کو گود میں اٹھا لیا اور اسے لے کر باہر چلا گیا، اس کے ہاتھ میں چند کھجوریں دے دیں، عامر خوش ہو گیا۔ ہارون کے باپ نے عامر سے پوچھا۔ "بیٹے عامر! میں کیسا ہوں؟"

عامر نے فوراً جواب دیا۔ "بہت اچھے۔ سب سے اچھے۔"

باپ نے سرگوشی میں دوسرا سوال کیا۔ "اور یہ دوسرا بوڑھا جو منیزہ کا باپ ہے، تجھے کیسا لگا؟"

عامر نے فی الفور جواب دیا۔ "برا۔ آپ سے لڑتا جو ہے۔"

دادا نے پوتے کی پشت تھپتھپائی اور تیسرا سوال کیا۔ "تیری یہ نئی ماں کیسی ہے؟"

عامر نے جواب دیا۔ "اچھی۔ بہت اچھی۔"

اور وہ رونے لگا۔ بے اختیار پھوٹ پھوٹ کر۔ ہارون کے باپ کو شبہ گزرا کہ شاید منیزہ کا سلوک عامر کے ساتھ اچھا نہیں ہے اس لیے عامر منیزہ سے متعلق سوالات پر رونے لگا۔ اس نے بچے کی پیٹھ تھپتھپائی اور تسلی دیتا ہوا بولا۔ "میرے بچے عامر! تم مت گھبرا، اگر منیزہ نے تجھ کو ستایا ہے تو اس کو اس کی سزا دی جائے گی۔"

عامر نے برا مان کر جواب دیا۔ "دادا جان! آپ معلوم نہیں کیا سوچ رہے ہیں۔ میں تو اس لیے رو رہا ہوں کہ کہیں میری یہ ماں بھی مجھ سے روٹھ کر نہ چلی جائے۔"

دادا اس جواب پر چونک پڑا، اسے اپنے سارے منصوبے درہم برہم ہوتے نظر

آئے، بولا۔ "میرے معصوم ناسمجھ بیٹے! تو ان چالاکیوں اور عیاریوں کو ابھی نہیں محسوس کر سکتا جو منیزہ کی محبت کے پیچھے کارفرما ہے لیکن تو ذرا اور بڑا ہو لے تو میں ان سب کی اچھی طرح نشان دہی کر سکوں گا۔"

منیزہ کے باپ نے ہارون کے باپ کو عامر سے باتیں کرتے دیکھا تو بیٹی کو سمجھایا۔ "منیزہ! تو ہوشیار رہ، یہ عیار انسان اپنے پوتے کو معلوم نہیں کیا سکھا پڑھا رہا ہے۔ میرا خیال ہے اس گھر میں کوئی بھی ایسا نہیں جس پر تو اعتبار کرے۔ عامر میں زیادہ سر کھپانے کی ضرورت نہیں ہے۔"

منیزہ نے برا مان کر جواب دیا۔ "بابا جان! میں آپ کی یہ بات کبھی نہیں مانوں گی، میں عامر کو چاہتی ہوں، از حد، بہت زیادہ اور یہ ناممکن ہے کہ عامر محبت کا جواب محبت سے نہ دے۔"

باپ نے افسوس سے کہا۔ "میری یہ بات ابھی تیری سمجھ میں نہیں آئے گی۔ تو یہ کیوں نہیں سوچتی کہ عامر تیرا بیٹا نہیں ہے، تو اس کے ساتھ کچھ بھی کر لے، اس کا کوئی بھی خیال نہیں کرے گا۔ ہاں اگر تیری اپنی اولاد ہو گی تو تو اس پر پوری طرح اعتبار کر سکے گی۔ تو اپنی محبتیں، اپنی ممتا، اپنی خدمت اپنی اولاد کے لیے محفوظ رکھ۔"

لیکن باپ کی نصیحتیں بے اثر رہیں اور وہ اپنے دل سے عامر کی محبت نہیں نکال سکی۔

کچھ دیر بعد جب دادا کا ورغلایا ہوا عامر منیزہ کے پاس آیا تو اس کے دل میں منیزہ کی محبت کا طوفان برپا تھا، آج اس وقت اس کو منیزہ بہت اچھی لگ رہی تھی۔ اسی طرح منیزہ بھی آج عامر کو زیادہ حسین، زیادہ معصوم اور زیادہ پرکشش محسوس کر رہی تھی۔ اس نے بے اختیار عامر کو گود میں اٹھا لیا اور بھینچ بھینچ کر پیار کرنے لگی۔ عامر بھی منیزہ کی گود میں پیوست ہوتا چلا گیا۔

* * *

ہارون خراسان چلا گیا، وہاں وہ شورشوں اور ہنگاموں میں یوں الجھا رہا کہ گھر کا ہوش ہی نہ رہا۔ کبھی کبھی اپنی خیریت سے منیزہ کو مطلع کر دیا کرتا۔ دوسری طرف منیزہ کا باپ آذربائیجان گیا ہوا تھا۔ وہاں اس نے چند ایسے کارنامے دکھائے کہ خلافت کی طرف سے انعام و اکرام کی بوچھاڑ کر دی گئی۔ یہیں ہارون کا بہنوئی بھی تھا۔ اس لیے منیزہ کے باپ

سے بڑی شکایتیں کیں اور کہا۔ "تو اگر یہ سمجھتا ہے کہ منیزہ ہارون کے پاس خوش رہے گی تو یہ تیری غلط فہمی یا خوش فہمی ہے۔ منیزہ سب سے زیادہ آزردہ اور ناخوش اسی گھر میں رہے گی کیونکہ اس گھر میں ہارون کا ایک بچہ پہلی بیوی کا بھی رہتا ہے۔ تیری بیٹی اسی لڑکے کی وجہ سے ذلیل و خوار ہوتی رہے گی۔"

منیزہ کے باپ نے ازراہِ شکایت جواب دیا۔ "میرا خیال ہے تو ٹھیک کہتا ہے۔ میں نے تیرے ساتھ بڑی ناانصافی کی، اگر میں ایسا نہ کرتا تو منیزہ آج تیری بیوی ہوتی اور میں یوں ذلیل و خوار نہ ہو رہا ہوتا۔"

بہنوئی نے کہا۔ "ایک بات میری بھی یاد رکھ، وہ یہ کہ ایک سازش کے زیرِ اثر تیری بیٹی ہمیشہ اولاد سے محروم رکھی جائے گی۔"

منیزہ کا باپ چونک کر بولا۔ "یعنی یہ بات، تجھ کو یہ بات کس نے بتائی؟"

بہنوئی نے جواب دیا۔ "مجھ کو یہ بات کون اور کیوں بتلائے گا مجھے تو خود بخود یہ باتیں معلوم ہو گئیں۔"

منیزہ کے باپ نے اصرار کیا۔ "اچھا ذرا اس کی وضاحت کر دے کہ منیزہ بے اولاد کیوں رہے گی اور یہ کہ اس کے خلاف اگر اس قسم کی محاذ آرائی ہو رہی ہے کہ میری منیزہ کو لاولد رکھا جائے تو اس کا سبب کیا ہوگا؟"

بہنوئی نے اِدھر اُدھر دیکھ کر سرگوشی میں کہا۔ "اگر تو اجازت دے تو گفتنی اور ناگفتنی کھل کر کہہ ڈالوں۔"

منیزہ کا باپ ہارون کے بہنوئی کی باتوں سے بہت زیادہ پریشان ہو گیا تھا اس نے بمشکل دریافت کیا۔ کیا ایسا ممکن ہے کہ تو کسی رشتے کے احترام یا لحاظ کے بغیر ہر بات صاف صاف بتا دے؟"

"کیوں نہیں، کیوں نہیں۔" ہارون کے بہنوئی نے جواب دیا۔ "جناب والا! ہارون اور اس کے گرد و پیش رہنے والوں نے ہارون کو یہ مشورہ دے رکھا ہے کہ منیزہ کو بے اولاد رکھا جائے۔ اس سے ہارون کو یہ فائدہ رہے گا کہ اس کے بیٹے عامر کو ہمیشہ منیزہ کی محبت حاصل رہے گی۔"

منیزہ کے باپ نے دل ہی دل میں شادی کی مدت کا حساب لگایا تو معلوم ہوا کہ شادی کو ڈھائی سال گزر چکے ہیں مگر منیزہ اولاد سے محروم ہے۔ اس کو ہارون کے بہنوئی کی باتوں پر پورا پورا یقین آ گیا اور وہ غصے اور نفرت کی آگ میں جھلسنے لگا۔ آہستہ سے بولا۔ "تو یہ

بات ہے۔ سازش، لیکن میں اس سازش کو ناکام بنا دوں گا۔ اور دیکھوں گا کہ میری منیزہ اولاد سے کس طرح محروم رکھی جاتی ہے۔"

اس کے بعد اس نے اپنی بیٹی کو ایک خط لکھا جس میں اشاروں کنایوں میں یہ معلوم کرنے کی کوشش کی تھی کہ شادی کے ڈھائی سال بعد بھی وہ اولاد سے محروم کیوں ہے؟ اس نے منیزہ کو ہدایت کی کہ وہ چند ماہ بعد حمص پہنچ رہا ہے، اس لیے وہ بھی حمص پہنچ جائے تاکہ چند نہایت ضروری باتیں کی جا سکیں۔ اس خط میں یہ بھی لکھ دیا کہ اس کو اچانک ایسی سازش کا پتہ چلا ہے جو منیزہ کے خلاف شادی سے پہلے ہی تیار کر لی گئی تھی اور یہ اسی سازش کا اثر ہے کہ منیزہ ڈھائی سال بعد بھی بے اولاد ہے۔

منیزہ کو جب یہ خط ملا تو وہ پریشان ہو گئی۔ منیزہ اپنے دل میں اولاد کی شدید خواہش محسوس کر رہی تھی۔ لیکن وہ مجبور تھی۔ اس کو اپنی اولاد کی ضرورت یوں اور زیادہ محسوس ہونے لگی تھی کہ عامر کو اس کا دادا بُری طرح ورغلاتا رہتا تھا۔ دادا کی پوری کوشش یہ تھی کہ عامر کا دل منیزہ کی محبت سے خالی اور محروم رکھے۔ اس نے سو سو طرح سے یہی باور کرا دیا کہ منیزہ اس کی اپنی ماں نہیں ہے اور اب تک وہ جس محبت کا اظہار کر رہی ہے محض بناوٹی ہے۔ وہ اس طرح اپنی محبت کا فریب دے کر اس فکر میں ہے کہ کسی طرح عامر کے اس مال و زر درہم و دینار پر قبضہ کر لے جو اس کو اپنے باپ سے ورثے میں ملنے والا ہے۔ اس نے عامر کو یہ سبق بھی پڑھایا کہ عقل مند لوگ دولت اور درہم و دینار کے معاملے میں کسی پر اعتبار نہیں کرتے۔

جب اٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے یہی سبق دیئے گئے تو عامر کے دل میں بھی ذرا سا فرق آ گیا، اب وہ منیزہ کے طرزِ عمل میں اس کے تصنع، عیاری اور فریب کو تلاش کرتا رہتا اور اس کا سا ذہن ان میں سے کوئی نہ کوئی شے منیزہ میں پا لیا کرتا تھا۔

ہارون خراسان میں رہ تو رہا تھا مگر گھر کی طرف سے بہت فکر مند تھا۔ یہاں اس کو اچانک اپنے بہنوئی کا خیال آ گیا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کا بہنوئی زخمی سانپ کی طرح ہے جو کسی وقت بھی حملہ کر سکتا ہے، چنانچہ اس نے منیزہ کو خط لکھ دیا اور اس میں بطورِ خاص یہ ہدایت کی کہ اس کی عدم موجودگی میں اگر بہنوئی آئے تو منیزہ اس کے سامنے نہ جائے اور نہ اور نہ ہی اس سے کسی قسم کی بات کرے۔ کیونکہ وہ اچھا آدمی نہیں ہے۔

اس خط کے ساتھ ہی دوسرا خط اپنے باپ کو لکھا اور باپ کو صاف صاف لکھ دیا کہ اسے اس کے بہنوئی کی طرف سے ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے کیونکہ اس نے یہ دھمکی دے رکھی

ہے کہ وہ کسی نہ کسی طرح میرے خاندان پر حملہ آور ہو سکتا ہے۔ اس خط میں ذرا سا تذکرہ عامر کے لئے بھی تھا جس میں ہارون نے اپنے بیٹے کو ہدایت کی تھی کہ وہ اپنے دادا کا خاص خیال رکھے اس بڑھاپے میں ان کی دل جوئی بے حد ضروری ہے۔

اس خط کی آخری سطروں نے منیزہ کو بڑا دکھ دیا۔ وہ خود کو اکیلا اور تنہا محسوس کر رہی تھی۔ اس نے سوچا کہ میں جس عامر پر اپنی محبتیں نچھاور کرتی رہی، اس کو ہارون یہ ہدایت دے رہا ہے کہ وہ اپنے دادا کا خاص خیال رکھے، کیونکہ بڑھاپے میں دادا کی دل جوئی بے حد ضروری ہے۔ منیزہ نے سوچا، وہ خود جس تنہائی اور اکیلے پن کے کرب سے دوچار ہے کیا اس میں کسی کی محبت اور دل جوئی کی ضرورت ہی نہیں؟

اس نے چڑ کر ہارون کو لکھ دیا۔

"ہارون! میں چند ماہ کے لیے حمص جا رہی ہوں۔ کیونکہ وہاں میرا باپ آذر بائیجان سے پہنچ رہا ہے۔ میں حمص تنہا جا رہی ہوں کیونکہ عامر کا اپنے دادا کے پاس رہنا بہت ضروری ہے میرا بھی یہی خیال ہے کہ عامر کو اپنے دادا کا بہت خیال رکھنا چاہیئے کیونکہ اس بڑھاپے میں ان کی دل جوئی بے حد ضروری ہے۔

ہارون! میں نے تیرے بیٹے کو اب تک جو پیار دیا ہے اور اس کا جتنا خیال رکھا ہے تو اس سے اچھی طرح واقف ہے۔ میرے اس پیار اور خیال کی روشنی میں تیرا فرض تو یہ تھا کہ عامر کو لکھتا کہ وہ میرا خاص خیال رکھے اور مجھے اکیلا نہ محسوس ہونے دے لیکن تو نے بھی مجھ کو نظر انداز کر دیا۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کس کا شکوہ کس سے کروں؟ بہر حال میں حمص جا رہی ہوں، اور رہ گئی یہ بات کہ تیرے بہنوئی کے سامنے نہ جاؤں اور اس سے باتیں نہ کروں، تو یہ سب فضول باتیں ہیں۔ اگر تو یہ سب نہ بھی لکھتا، میں تب بھی یہی کچھ کرتی۔

ہارون! میں بہت اداس ہوں اور یہ اداسی اس طرح دور ہو سکتی ہے کہ یا تو تو خود چلا آ یا پھر مجھے اپنے پاس ہی بلا لے اور ایک تیسری صورت بھی ہے۔ وہ یہ کہ عامر کی طرح مجھے بھی ایک بیٹا دے دے کیونکہ میں اب اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ اپنے بیٹے ہی کو بیٹا کہہ سکتی ہوں، اسی پر ناز کر سکتی ہوں اور اسی سے امیدیں وابستہ کر سکتی ہوں۔ میرے بیٹے کو تیرا باپ ورغلا نہیں سکے گا اور میرا بیٹا ہی مال و زر اور درہم و دینار کو جبراً تقسیم کرا سکے گا جس پر تیرا باپ سانپ کی طرح بیٹھ گیا ہے۔ اس وقت میری سب سے بڑی ضرورت ایک بیٹا ہے جس کو میں حاصل کر کے رہوں گی۔ آ، چلا آ، تا کہ میں تجھ سے ایک بیٹا، کم از کم ایک بیٹا حاصل کر سکوں۔"

خراسان میں جب یہ خط ہارون کو ملا تو اس کو شبہ گزرا کہ منیزہ کو اولاد سے محروم رکھنے کی سازش سے کسی نے مطلع ضرور کر دیا ہے ورنہ وہ اس طرح ایک بیٹے کی خواہش نہ کرتی وہ اپنے بہنوئی سے بہت زیادہ خوفزدہ تھا اور اس کو یقین تھا کہ منیزہ کچھ بھی لکھے لیکن اس راز کا افشا اس کے بہنوئی نے ہی کیا ہو گا۔

ہارون کی خواہش تھی کہ جب تک وہ خود دمشق نہ پہنچ جائے منیزہ دمشق نہ چھوڑے وہ اسے حمص خود پہنچانا چاہتا تھا اور منیزہ کے ساتھ حمص میں وہ خود بھی رہنا چاہتا تھا کیونکہ اس کو قطعی یقین نہیں تھا کہ اس کا بہنوئی اس کی عدم موجودگی میں حمص پہنچے اور منیزہ اور اس کا باپ دونوں ہی اسے اپنے گھر میں داخل نہ ہونے دیں۔ اس نے بعجلت منیزہ کو لکھ دیا کہ جب تک میں واپس نہ آؤں، وہ دمشق نہ چھوڑے اور اگر حمص جانا ہی چاہتی ہے تو عامر کو اپنے ساتھ لیتی جائے۔

یہ خط ابھی راستے ہی میں تھا کہ منیزہ نے سفر کی تیاریاں مکمل کر لیں، عامر منیزہ کی لاتعلقی اور بے پروائی سے پریشان ہو رہا تھا۔ اس نے کئی بار کوشش کی کہ منیزہ سے باتیں کرے لیکن منیزہ نے سرد مہری سے اس کو خاموش کر دیا۔ اس زبردست تبدیلی کو ہارون کا باپ بھی محسوس کر چکا تھا۔

ہارون کے باپ کو بھی پتہ نہ تھا کہ منیزہ کہاں جا رہی ہے۔ منیزہ نے بستر اور ضروری سامان باندھ کر ایک طرف رکھ دیا اور دروازے پر کھڑے ہو کر کسی کا انتظار کرنے لگی۔ عامر دور کھڑا بہ حسرت و یاس یہ منظر دیکھ رہا تھا

ہارون کا باپ بھی یہ سب دیکھ رہا تھا مگر بہو سے کچھ پوچھنے کی ہمت نہیں کر پا رہا تھا۔

شام کو مغرب کی نماز کے بعد منیزہ چپ چاپ اپنے کمرے میں جا کر پڑ رہی۔ عامر بڑی دیر تک اپنے بستر پر پڑا کروٹیں بدلتا رہا لیکن نیند نہیں آ رہی تھی۔ وہ یہ جاننے کے لیے بے چین تھا کہ اس کی نئی ماں کہاں جا رہی ہے اور اس کو اپنے ساتھ لے جاتے گی یا نہیں۔ ہارون کا باپ خوش تھا کہ اس کے گھر سے وبا نکلی جا رہی تھی۔

رات کے اندھیرے میں عامر چپکے سے اٹھا اور منیزہ کے دروازے پر دہلیز سے لگ کر بیٹھ رہا۔ دروازہ اندر سے بند تھا اور عامر میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ دستک دے کر کھلوا لیتا۔ اس رات منیزہ کو بھی عامر کی یاد بہت ستا رہی تھی، اس کو وہ ننھا عامر بری طرح یاد آ رہا تھا جو کئی سال پہلے شادی سے قبل اس کی یاد میں بھٹک گیا تھا اس کی آنکھیں بھر آئیں اور دل ہی دل میں وہ ہارون کے باپ کو برا بھلا کہنے لگی جس نے ان

دونوں کے درمیان ایک خلیج حائل کر دی تھی۔

عامر دہلیز پر بیٹھے بیٹھے اونگھ گیا۔ ہارون کا باپ خراٹے لے رہا تھا۔ رات کے سناٹے میں منیزہ کو کمرے کے دروازے پر کسی چیز کے گرنے کی آواز سنائی دی۔ وہ تیزی سے اٹھی اور کمرے کا دروازہ کھول کر جیسے ہی باہر نکلی کسی چیز سے ٹھوکر کھا کر خود بھی گر گئی منیزہ کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ "کون ہے؟"

جواب میں عامر کی آواز سنائی دی۔ "ماں! میں ہوں عامر۔"

منیزہ نے حیرت سے پوچھا۔ "عامر! مگر تم یہاں کیا کر رہا ہے؟"

عامر نے جواب دیا۔ "ماں! میں آپ کے پاس آیا تھا مگر کمرے کا دروازہ بند دیکھ کر دہلیز پر ہی بیٹھ گیا تھا کہ آنکھ لگ گئی اور میں بیٹھے بیٹھے گر گیا۔"

منیزہ نے عامر کو سینے سے لگا لیا۔ "یہاں دہلیز پر بیٹھنے کی کیا ضرورت تھی۔ آواز نہ دی تو دستک دے لیتا۔"

منیزہ اس کو کمرے میں لے چلی گئی۔ اس نے شمع کی روشنی میں عامر کے چہرے پر خشک آنسوؤں کے نشانات دیکھے۔ شوخی سے پوچھا۔ "کیا تو رو رہا تھا؟"

عامر کی آنکھیں ایک بار پھر چھلکنے لگیں بولا۔ "آپ کہاں جا رہی ہیں؟"

منیزہ نے جواب دیا۔ "اپنے باپ کے پاس حمص۔ کیوں؟ تو نے یہ سوال کیوں کیا؟"

عامر نے پوچھا۔ "کیا آپ تنہا جا رہی ہیں؟"

اس نے جواب دیا۔ "ہاں۔ کیونکہ میں حمص سے اکیلی ہی آئی تھی۔"

عامر نے دیکھا منیزہ یہ جواب دیتے دیتے کپکپا گئی تھی اور اس کی نظریں خلا میں گڑ کر رہ گئی تھیں۔ عامر نے پوچھا۔ "میں کس کے پاس رہوں گا؟"

منیزہ نے جواب دیا۔ "اپنے دادا کے پاس، کیونکہ میں بہر حال تیرے لئے غیر ہو

عامر نے خوشامد کی۔ "آپ مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلیے، یہاں نہیں رہوں گا۔ میں دادا کی بات نہیں مانوں گا۔"

منیزہ نے عامر کو پیار بھری نظروں سے دیکھا تو دیکھتی ہی رہ گئی۔ وہ عامر کی بات رد نہیں کر سکتی تھی مگر ہارون کے باپ کی باتیں سنتے سنتے اس کا دل پک گیا تھا بولی۔ "عامر تو ضد نہ کر اور اپنے دادا کے پاس رہ۔ میں جلدی ہی واپس آجاؤں گی۔"

عامر اس سے چمٹ گیا۔ "میں آپ کے ساتھ ہی جاؤں گا۔ آپ کے بعد یہ گھر

اچھا نہیں لگے گا۔"

اسی وقت خوابیدہ حالت میں عامر کا دادا کمرے میں داخل ہوا اور جماہی لیتے ہوئے کہا۔ "عامر! تو یہاں کیوں آیا تھا؟ چل، زیادہ رات تک جاگنا اچھی بات نہیں۔"

عامر نے جواب دیا۔ "دادا جان! آپ جائیے اور آرام کیجئے میں یہیں اسی کمرے میں رہوں گا۔"

دادا نے انگڑائی لیتے ہوئے ذرا سختی سے کہا۔ "عامر تو خوب جانتا ہے کہ اس دنیا میں تیرے دو ہی غمخوار ہیں، ایک تیرا باپ ہارون اور دوسرا میں خود ان دو کے علاوہ میں کسی اور کو نہیں جانتا۔"

عامر نے کہا۔ "آپ سب کا ارشاد سر آنکھوں پر۔"

دادا نے پوچھا۔ "میں نے اب تک جو کچھ بھی تجھے بتایا اور سمجھایا ہے اس کی آہستہ آہستہ تصدیق ہوتی چلی جائے گی۔ اس وقت بھی تو نے یہی بات محسوس کی ہو گی کہ تو تو منیزہ کے پاس رہنے اور اس کے ساتھ جانے کی ضد کر رہا ہے لیکن منیزہ تجھے اپنے ساتھ لے جانا نہیں چاہتی۔ بیٹے! حقیقی ماں کی تو بات ہی کچھ اور ہوتی ہے۔"

منیزہ دل مسوس کر رہ گئی، بولی۔ "بابا جان! آپ ایسی باتیں نہ کیجئے جس سے عامر کا مستقبل ہی تباہ ہو جائے۔ آپ عامر کو جو کچھ محسوس کرانا چاہتے ہیں اس سے کئی آدمی تباہ و برباد ہو جائیں گے۔ میں عامر کی دشمن ہرگز نہیں، حالانکہ آپ اس معصوم کو یہی باور کرا رہے ہیں۔"

ہارون کے باپ نے تیوریاں بدل کر جواب دیا۔ "میں کچھ بھی باور نہیں کرا رہا عامر تجھ کو وہی سمجھے گا جو تو اپنے طرزِ عمل سے ثابت کرے گی۔ تو حریص ہے اور تو نے میرے بیٹے کے درہم و دینار دیکھ کر اس سے شادی کر لی۔ اب اگر تو عامر کو نظر انداز کرے گی اور عامر کے اصرار کے باوجود حمص اکیلی ہی چلی جائے گی تو اس کا مطلب کیا ہو گا؟ اس سے میں یا عامر کس نتیجے پر پہنچیں گے۔ یہی نا کہ تجھ کو کوئی دلچسپی نہیں۔ تو اپنی خواہشات کی غلام ہے....."

منیزہ رونے لگی، بات کاٹ کر بولی۔ "بس بس، اب میں آپ کی مزید باتیں نہیں سن سکوں گی۔ میں عامر کو اپنے ساتھ اس لیے نہیں لے جانا چاہتی کہ آپ اس کی مخالفت کریں گے۔ میں اپنے ساتھ لے جانے کا اعلان کر کے عین روانگی کے وقت اس ندامت سے نہیں دوچار ہونا چاہتی جو عامر کو جبراً روک کر آپ میرے چہرے پر مل دیں گے۔"

ہارون کے باپ کو ایک دم اتنا غصہ چڑھ گیا کہ وہ اپنے ہوش و حواس ہی میں نہ رہا۔ اس نے عامر کو منیزہ کے ہاتھوں سے چھین کر اپنی گود میں لے لیا۔ بولا "عامر! ادھر آ، میرے ساتھ چل، میں تجھ کو اور زیادہ ذلیل نہیں ہونے دوں گا۔" پھر منیزہ کو بطورِ خاص حکم دیا "اور لڑکی! تو حمص اس طرح جا رہی ہے کہ ابھی تک مجھ سے حمص جانے کی اجازت تک نہیں لی، تو اپنی مرضی سے جا رہی ہے اس لیئے تو اس وقت تک حمص میں رہ جب تک ہارون خراسان سے واپس نہ آجاتے۔"

منیزہ نے رقّت سے جواب دیا "آپ تو واپسی کی بات کر بھی رہے ہیں لیکن ایمانداری کی بات تو یہ ہے کہ میں اب واپسی کا کوئی ارادہ ہی نہیں رکھتی۔ اس جہنم میں میں دوبارہ نہیں واپس آؤں گی۔"

عامر کا دادا تلملا کر رہ گیا۔ اس نے عامر کو گود میں اٹھا لیا اور یہ جا وہ جا! بڑبڑاتا اور برا بھلا کہتا ہوا وہ فوراً ہی وہاں سے دفعان ہو گیا۔

کئی دن بعد منیزہ اس طرح حمص روانہ ہو گئی کہ اس کا ایک بڈھا سی دورانِ سفر اس کا سرپرست تھا اور وہ غم زدہ اور افسردہ منیزہ کو تسلیاں دینے میں مشغول رہا۔ وہ بار بار یہی کہہ رہا تھا کہ اس کے ساتھ یہ جو کچھ بھی ہو رہا ہے مشیّتِ ایزدی کے مطابق ہے، اس لیے منیزہ کو شکایت نہیں کرنا چاہیئے۔

حمص میں وہ اپنے گھر میں اتر گئی، یہاں اس کے چند رشتے داروں نے خوش آمدید کہی۔ اس کے باپ کی رشتے کی ایک بہن اور اس کے شوہر نے منیزہ کو محبت اور عزت سے اتارا اور اس کی خاطر مدارات میں لگ گئے منیزہ کو رہ رہ کر دمشق، عامر اور ہارون کی یاد ستاتی رہتی۔ دمشق جہاں اس کا اپنا کوئی نہ تھا۔ عامر جس پر اسے کوئی اختیار حاصل نہ تھا اور ہارون جو اس سے بہت دور خراسان میں بیٹھا تھا۔ وہ حمص کی فضا میں چھائے ہوتے بادلوں کو بڑی حسرت سے تکتی رہتی۔ ان کالے کالے اور بھورے باسرمئی بادلوں میں بڑا کیف تھا لیکن منیزہ کا زخمی اور غم زدہ دل اس کیف کو محسوس کرنے سے قاصر تھا۔ وہ شام سے ذرا پہلے جب دروازے یا چھت سے مویشیوں کے گلّے آبادی میں داخل ہوتے دیکھتی تو معلوم نہیں کیوں یہ سوچنے لگتی کہ یہی تمام مناظر اس کا شوہر ہارون بھی خراسان میں ہر شام دیکھتا رہتا ہوگا۔

ایک دن علی الصبح اس کا باپ بھی آذربائیجان سے آ گیا۔ باپ کے ساتھ ہارون کا بہنوئی بھی آیا تھا۔ اس کی نظریں منیزہ پر جو پڑیں تو وہ مسکرانے لگا اور اشاروں اشاروں میں مافی الضمیر سمجھانے لگا۔ اس نے منیزہ کو پُر شوق نظروں سے دیکھا اور عاجزی سے سوال کیا۔ "منیزہ! کیا بات ہے تو پریشان کیوں ہے؟ کیا ہارون کے باپ نے تجھ کو نکال دیا؟"

منیزہ نے ضبطِ غم کی بڑی کوشش کی لیکن برداشت نہ کر سکی اور آنکھوں کے گوشے بھیگنے لگے۔ "نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں، میں خود ہی چلی آئی، ہارون کا باپ مجھ کو نکالتا کیوں؟"

بہنوئی نے طنزاً پوچھا۔ "عامر کہاں ہے؟"

منیزہ نے چھری کی طرح جواب دیا۔ "دمشق میں اپنے دادا کے پاس۔"

بہنوئی نے شرارتاً پوچھا۔ "وہ تیرے ساتھ کیوں نہیں آیا؟"

اس نے جواب دیا۔ "وہ تو میرے ساتھ آنے کے لیے ضد کر رہا تھا لیکن میں نے یہ سوچ کر اس کو اپنے ساتھ نہیں لیا کہ اس کا دادا تنہائی سے اکتا جاتا اور وہ اپنے پوتے سے بڑی محبت کرتا ہے۔"

بہنوئی کو اس کی باتوں پر یقین نہیں آیا، بولا۔ "منیزہ! تو جو چاہے کہہ لے لیکن میں تیری باتوں پر یقین نہیں کر سکتا۔ ہارون کا باپ بڑا ہی موذی ہے۔ حرص و طمع کا پیکر، اگر تجھے یہ بات ابھی تک نہیں معلوم تھی تو آج مجھ سے میری زبان سے سن لے۔"

منیزہ دم بخود کسی معصوم تماشائی کی طرح نندوئی کی صورت دیکھتی اور باتیں سنتی رہی۔

ہارون کا بہنوئی کہتا رہا۔ "منیزہ! سادہ لوح اور بھولی بھالی لڑکی! بخدا جب بھی میں تجھ کو دیکھتا ہوں، یہی سوچتا رہ جاتا ہوں کہ مقدر بھی کوئی چیز ہے، تقدیر بھی کوئی شے ہے....."

لیکن اسی وقت منیزہ کا باپ بھی آ گیا۔ اس نے ہارون کے بہنوئی سے پوچھا۔ "کہیں میری بیٹی کو ورغلا تو نہیں رہا؟" پھر منیزہ سے پوچھا۔ "بیٹی! کیا بات ہے؟ تو ملول کیوں ہے؟"

منیزہ نے جواب دیا۔ "پدرِ بزرگوار! کوئی ایک سبب اداسی کا ہو تو بیان بھی کر دوں، میں ہارون سے شادی کر کے مصیبتوں کا جو دروازہ کھول چکی ہوں، اس کو بند کرنے کی قدرت نہیں رکھتی۔"

باپ نے معنی خیز لہجے میں پوچھا۔ "کیا مطلب؟"

ہارون کا بہنوئی بول اٹھا۔ "مطلب کیا ہے؟ وہی مطلب ہے جس سے ہم دونوں ہی واقف ہیں۔ اس گھر میں اگر ہارون کا باپ نہ ہوتا تو گھر سرتاپا جنت ہوتا لیکن اب وہ گھر....."

منیزہ رونے لگی، بولی۔ "میں اس بڈھے کو ایسا نہیں سمجھتی تھی۔ اس نے حد کر دی۔"

منیزہ کے باپ نے اصرار کیا۔ "پھر بھی ہوا کیا؟ کچھ تو بتا؟ میں اس ذلیل انسان کو ٹھیک کر سکتا ہوں۔"

منیزہ نے جواب دیا۔ "اب میں دمشق واپس نہیں جاؤں گی۔"

ہارون کے بہنوئی نے منیزہ کے باپ سے کہا۔ "منیزہ کے اس جواب میں کہ اب میں واپس نہیں جاؤں گی، سب کچھ آگیا، اس سے کچھ پوچھنا بے کار ہے۔"

منیزہ کے باپ نے کہا۔ "اچھا اب تو واقعی دمشق واپس نہیں جائے گی۔ تو حمص میں رہے گی، ہارون بھی یہیں آئے گا اور یہیں رہے گا۔"

منیزہ نے اشک بار نظروں سے باپ کو دیکھ کر پوچھا۔ "ابا عامر؟ عامر کہاں رہے گا؟"

منیزہ کے باپ نے نفرت سے جواب دیا۔ "میں نہیں جانتا کہ عامر کہاں رہے گا لیکن وہ ہمارے ساتھ یا تیرے پاس نہیں رہے گا۔" پھر ہارون کے بہنوئی سے کہا۔ "تو کچھ دیر کے لیے باہر چلا جا، میں منیزہ سے چند ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

وہ باہر چلا گیا، منیزہ کے باپ نے آہستہ سے کہا۔ "یہ تو بار بار عامر کا نام کیوں لے رہی ہے؟ یاد رکھ وہ تیرا بیٹا نہیں ہے۔ ہارون کا باپ اپنے پوتے کو سکھا پڑھا کر تیرے خلاف تیار کر رہا ہے، افسوس کہ تو اولاد سے محروم ہے اور تیرا مستقبل تیری اولاد ہی محفوظ اور روشن رکھے گی، ورنہ کچھ بھی نہیں، تم دونوں، ہارون اور تم کسی وقت بھی ایک دوسرے سے علیحدگی اختیار کر سکتے ہو۔"

منیزہ ان باتوں کا کیا جواب دیتی لیکن باپ کی باتوں نے اس کے دل میں اپنی اولاد کی شدید خواہش کا ایسا چراغ روشن کر دیا جو اپنی پوری آب و تاب کی گرمی سے اس کے اور پورے وجود کو پگھلائے دے رہا تھا۔

منیزہ کے باپ نے دبے دبے لہجے اور اشاروں کنایوں میں پوچھا۔ "منیزہ مجھے تو اولاد سے محرومی کے پیچھے کوئی سازش، کوئی خاص منصوبہ کارفرما نظر آرہا ہے، ہو سکتا ہے خیال غلط ہو لیکن میرے اس خیال کی روشنی میں تجھ کو غور و فکر کرنا ہوگا اور ہارون کو سمجھنے کی کوشش کرنا ہوگی۔"

منیزہ کوئی جواب دیے بغیر باپ کے سامنے سے ہٹ گئی لیکن تنہائی میں لیٹ کر اس نے ہارون کی خلوتوں کا بڑی دیانت داری سے جائزہ لیا اور ان لمحوں کو پکڑ لیا جہاں ہارون

چالاکیوں سے کام لے کر انتہائی نازک، خاص اور لطیف موقعوں پر خود کو بہ عجلت منیزہ سے الگ کر لیا تھا اور یہی وہ قیمتی اور نازک لمحے ہوتے تھے جن میں اسے اولاد مل سکتی تھی۔ پہلے وہ ہارون کے اس فعل کو کوئی خاص اہمیت نہیں دیتی تھی لیکن اب وہ ماضی کے اس عمل میں تواتر اور پابندی محسوس کر کے خوفزدہ ہو گئی تھی۔ اس خوف نے غصے اور اشتعال کی شکل اختیار کر لی اور اس نے یہ قطعی فیصلہ کر لیا کہ اب وہ ایسا نہیں ہونے دے گی اور اولاد حاصل کر کے رہے گی۔

دوسری طرف ہارون کا بہنوئی اس فکر میں تھا کہ وہ کسی طرح ہارون اور منیزہ میں اختلافات پیدا کرا دے۔ وہ ہر وقت اس موقع کی تلاش میں رہتا جب وہ منیزہ سے تخلیے میں چند باتیں کرے۔

منیزہ کے باپ کا خلافت کی طرف سے بلاوا آگیا۔ اس کو دمشق میں طلب کر لیا گیا تھا وہ اس بلاوے کو ٹال دینا چاہتا تھا لیکن وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اس کے خطرناک نتائج بھی نکل سکتے ہیں۔ اس نے کوشش کی کہ ہارون کے بہنوئی کو بھی اپنے ساتھ ہی لیتا جائے لیکن اس نے ساتھ جانے سے انکار کر دیا۔ آخر بدرجہ مجبوری اس کو اپنی بیٹی کو سمجھانا پڑا، کہا۔ "منیزہ! میری بیٹی! میں چند دنوں کے لیے دمشق جا رہا ہوں، ہارون کا بہنوئی یہیں رہے گا، کیا اچھا ہوتا کہ یہ بھی میرے ساتھ ہی چلتا۔"

منیزہ خاموش رہی، اس کا باپ کچھ توقف کے بعد مزید بولا۔ "لیکن میں اس کو ساتھ چلنے پر مجبور بھی نہیں کر سکتا۔ وہ ہمارا مخلص ہے۔ اس لیے اگر وہ میری عدم موجودگی میں یہیں رہ جائے تو میں اسے منع بھی نہیں کر سکتا۔"

منیزہ باپ کی صورت دیکھنے لگی کہ آخر وہ کہنا کیا چاہتا ہے۔ باپ کہتا رہا۔ "لیکن مشکل تو یہ ہے کہ ہارون اپنے بہنوئی سے خوش نہیں ہے۔ شاید اس لیے کہ وہ تجھ سے شادی کرنا چاہتا تھا اور اگر ہارون ذرا بہ تاخیر پہنچتا تو تو آج ہارون کے بجائے اس کے بہنوئی کی بیوی ہوتی۔ بس اس واقعے نے انہیں ایک دوسرے کا دشمن بنا دیا ہے۔۔۔"

منیزہ نے کہا۔ "بابا جان! آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟ جو کچھ کہنا ہے فی الفور کہہ دیجیے گھما پھرا کر کہنے کی کوئی ضرورت نہیں۔"

باپ نے جواب دیا۔ "میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ اب تو ہارون کی بیوی ہے، ہارون کسی وقت بھی آسکتا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ جب ہارون یہاں آئے تو اپنے بہنوئی کو تیرے ارد گرد دیکھ کر مشتعل ہو جائے تو محتاط رہ بالکل اس طرح جیسے ہارون بھی یہیں کہیں موجود

ہے اور وہ تیری حرکات و سکنات پر نظریں رکھے ہوتے ہے۔"

منیزہ نے کہا۔ "میں جانتی ہوں، پھر بھی مزید خیال رکھوں گی۔"

منیزہ کا باپ دمشق چلا گیا۔ ہارون کا بہنوئی اس گفتگو سے لاعلم تھا اس لیے اس نے ایک اور ہی منصوبہ بنا لیا تھا۔ وہ ابھی تک منیزہ کی طرف سے مایوس نہیں ہوا تھا لیکن مشکل یہ پیش آ رہی تھی کہ منیزہ اس سے بچتی پھر رہی تھی۔ اس کو کئی ایسے موقعے ملے جب منیزہ کو ورغلا سکتا تھا لیکن منیزہ نے ان موقعوں کو ضائع کر دیا۔

منیزہ علی الصبح اٹھ کر نماز پڑھتی اس کے بعد کچھ دیر تلاوت میں لگاتی پھر گھر کے کاموں میں مشغول ہو جاتی لیکن ایک دن اس کے معمولات میں فرق آ گیا۔ نزلے نے کئی دن سے پریشان کر رکھا تھا، وہ اس کو ٹال رہی تھی لیکن ایک دن وہ بستر پر گر گئی۔ بخار بھی ہو گیا، رات بھر نیم مدہوشی میں معلوم نہیں کیا بڑبڑاتی رہی۔ ہارون کے بہنوئی کو اس کے قریب جانے کا موقع مل گیا۔ صبح کی نماز بھی قضا ہو گئی، بہنوئی اس کے سرہانے کھڑا ہوا، پوچھا۔ "منیزہ! اب کیسی طبیعت ہے؟"

منیزہ نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ادھر ادھر دیکھا اور اپنے سامنے اسے دیکھ کر اٹھ کر بیٹھ گئی، پوچھا۔ "آپ یہاں کب آئے؟"

بہنوئی نے جواب دیا۔ "منیزہ! میں تیری مجبوریوں سے واقف ہوں لیکن میں یہ بھی محسوس کر رہا ہوں کہ تو جتنی مجبور نہیں ہے، اس سے زیادہ مجبور ظاہر کر رہی ہے۔ اب کو خول سے باہر آ جانا چاہیے۔"

منیزہ نے جواب دیا۔ "بھائی! تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ نہ میں خود کو مجبور محسوس کرتی ہوں اور نہ ہی میں نے اپنے آس پاس کوئی خول چڑھا رکھا ہے جو اس سے باہر آ جاؤں۔"

بہنوئی اس کے قریب ہی بیٹھ گیا، شوخی سے بولا۔ "تجھے تو جھوٹ بول کر دھوکا دینے میں مزہ آنے لگا ہے۔"

منیزہ نے مختصراً کہا۔ "یہ آپ کی سوچ کا کرشمہ ہے ورنہ میں بالکل ہشاش بشاش اور مطمئن ہوں۔"

بہنوئی نے کہا۔ "منیزہ! میں تجھ سے چند ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

منیزہ نے جواب دیا۔ "بھائی! پھر کبھی باتیں کر لینا، مجھے اچھا ہو جانے دو۔"

بہنوئی نے منہ بنا کر کہا۔ "ان باتوں کے لیے اس سے بہتر موقع نہیں ملے گا۔"

منیزہ نے آنکھیں بند کر لیں اور عدم دلچسپی کا اظہار کیا، بولی۔ "جو بات کرنی ہو، مختصراً جلدی کر لیں کیونکہ طبیعت باتیں کرنے یا سننے پر راغب نہیں ہو رہی۔"

بہنوئی نے پوچھا۔ "منیزہ! تو سچ سچ بتا، کیا تو موجودہ حالات سے خوش اور مطمئن ہے؟"

منیزہ نے جواب دیا۔ "اگر ہارون میرے پاس ہوتا تو میں خوش بھی ہوتی اور مطمئن بھی لیکن اس کی عدم موجودگی میں خوشی اور اطمینان کا اقرار نہیں کر سکتی۔"

بہنوئی تلملا گیا، بولا۔ "تو غلط بیانی سے کام لے رہی ہے کیونکہ میں کیا جو بھی تجھے قریب سے جانتا ہے خوب سمجھتا ہے کہ تو بالکل ناخوش اور غیر مطمئن ہے اور اگر ہارون تیرے پاس بھی ہوتا تب بھی موجودہ کیفیت برقرار رہتی۔"

منیزہ نے کہا۔ "بس یہی بات کہنا تھی یا کچھ اور بھی؟"

بہنوئی سخت مایوس تھا، بولا۔ "پہلے تو اس کا اقرار کر کہ تو نے میری بات کے جواب میں جو کچھ کہا، وہ غلط ہے، جھوٹ ہے۔ اس کے بعد میں چند اہم مگر کام کی باتیں کروں گا۔"

منیزہ نے بڑی سنجیدگی اور مضبوط لہجے میں جواب دیا۔ "بھائی! میں تمہیں کس طرح یقین دلاؤں کہ میں جو کچھ کہہ رہی ہوں سچ سچ کہہ رہی ہوں۔ میں جھوٹ کیوں بولوں گی؟ ہاں اگر تم میری زبان سے وہی سب سننا چاہتے ہو جو بہ جبر کہلوانے پر مصر ہو تو میں تمہیں خوش کرنے کے لیے کہے دیتی ہوں کہ میں ناخوش بھی ہوں اور غیر مطمئن بھی۔ اب آگے کہیے کچھ۔"

بہنوئی نے کہا۔ "اگر ہارون اور تیرے درمیان ہارون کا باپ اور عامر موجود نہ ہوتے تو میں یقین سے کہہ سکتا کہ تم دونوں بہت خوش و خرم ہو لیکن ایسا ہے نہیں اس لیے میں۔۔۔۔"

منیزہ نے جواب دیا۔ "بہرحال میں بہت مطمئن اور خوش ہوں، جو تھوڑی بہت رنجشیں آ بھی گئی ہیں ہم دونوں کے دل و دماغ میں تو وہ چند دنوں کے ساتھ میں ڈھل جائیں گی۔"

بہنوئی نے کہا۔ "لیکن میں اسے ناممکن سمجھتا ہوں۔ منیزہ! اگر تو نے اپنے باپ کی ہاں میں ہاں نہ ملائی ہوتی تو آج تو میری بیوی ہوتی اور ٹھاٹھ کی زندگی گزار رہی ہوتی۔"

منیزہ نے جواب دیا۔ "اے بھائی! یہ ٹھاٹھ کی زندگی کیا شے ہوتی ہے؟ مجھے

کیسے معلوم ہوا؟"

بہنوئی نے ہنس کر کہا "تو ہارون سے طلاق لے کر مجھ سے شادی کر لے، پھر تجھے خود بخود میری باتوں کا جواب مل جائے گا۔"

منیزہ غصے میں اٹھ کر بیٹھ گئی۔ طیش میں بولی "بھائی! یہ تم کیسی باتیں کرنے لگے، اگر تم سے شادی کرنا ہوتی تو ہارون سے شادی کیوں کرتی؟ میں ہارون سے محبت کرتی ہوں۔"

بہنوئی نے طنز کیا "محبت کرتی ہے ہارون سے! خوب۔ منیزہ یا تو تو مجھے بیوقوف بنا رہی ہے یا پھر تو بہت سیدھی سادی لڑکی ہے، کیونکہ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ تو ہارون سے نالاں ہے۔ اس کے باپ اور بیٹے سے تو پریشان اور عاجز ہے اور یہ محض تنہا تیری آمد اور موجودگی اس کی گواہ ہے کہ تو ہارون سے دل برداشتہ ہو چکی ہے۔ ممکن ہے تو نے کبھی اس سے محبت کی ہو لیکن فی الحال تو ہارون سے متنفر ہے یہ بات میں پورے یقین اور وثوق سے کہہ سکتا ہوں۔"

منیزہ نے برا مان کر کہا "میرے پاس تمہاری فضول باتوں کا کوئی جواب نہیں۔ تم یہاں سے چلے جاؤ تاکہ میں کچھ دیر آرام کر لوں۔"

بہنوئی نے ہنس کر جواب دیا "اور میں بھی اس وقت تک یہیں موجود با[illegible] کرتا رہوں گا جب تک تو اپنے خول سے باہر نہیں آجائے گی۔"

منیزہ چڑ کر بیٹھ گئی۔ سر کو دونوں ہاتھوں سے دبا کر بولی "میرا سر درد کر رہا ہے خدا کے لیے میرا پیچھا چھوڑ دو بھائی! ورنہ میں دیوار سے سر ٹکرا لوں گی۔"

اتنے میں منیزہ کی پھوپی بھی آگئی۔ اس نے منیزہ کو بستر پر بیٹھے جو دیکھا تو دُ ہی سے پوچھا "کیا بات ہے منیزہ! تیری طبیعت تو ٹھیک ہے؟"

بیچ میں بہنوئی بول پڑا "منیزہ کی طبیعت خراب ہے اور میں بڑی دیر سے اس کو یہ رائے دے رہا ہوں کہ کسی طبیب سے رجوع کر لیکن یہ آمادہ ہی نہیں ہوتی۔"

پھوپی نے کہا "یہ ٹھیک تو کہتا ہے تجھ کو اس کا کہنا مان لینا چاہیئے منیزہ! زیادہ دنوں تک دبائے رکھنا خطرناک بات ہے۔"

منیزہ نے جھنجلا کر کہا "پھوپی جان! آپ بھی بھائی کی ہاں میں ہاں ملاتے چلی رہی ہیں۔"

پھوپی نے جواب دیا "معقول بات ہوگی تو ہر شخص ہاں میں ہاں ملائے گا۔"

بہنوئی نے پھوپی سے کہا "میں طبیب کو لاتا ہوں، آپ منیزہ کو حکم دیں کہ یہ اس کو دکھانے میں چون و چرا نہ کرے۔"

پھوپی نے سختی سے کہا "تو طبیب کو بلا لا، میں دیکھوں گی یہ علاج کس طرح نہیں کرائے گی۔"

بہنوئی طبیب کے پاس چلا گیا اور منیزہ نے سکھ کا سانس لیا۔ وہ ہارون کے بہنوئی کو اتنا خبیث نہیں سمجھتی تھی۔ اس کے جی میں آئی کہ جب ہارون واپس آجائے تو اس کو ان باتوں سے آگاہ کر دیا جائے لیکن پھر یہ سوچ کر دہل گئی کہ اس کا نتیجہ بہت برا نکلے گا۔

کافی دیر بعد جب واپس آیا تو طبیب تو اس کے ساتھ آیا نہیں، ہاں چند دوائیں البتہ اس کے ہاتھ میں تھیں، انہیں منیزہ کی طرف بڑھا دیا، بولا "منیزہ! میں نے تیرا احوال کہہ کر طبیب سے یہ دوائیں لے لی ہیں۔ اب تو کیسی ہے؟"

منیزہ نے بیزاری سے جواب دیا "بھائی! تم نے بلاوجہ زحمت کی اب میں بالکل ٹھیک ہوں۔"

بہنوئی نے ادھر ادھر دیکھ کر یہ اندازہ لگایا کہ پھوپی کا کہیں پتہ نہیں ہے۔ بولا "منیزہ! میں تجھ سے جواب چاہتا ہوں، یہ تو تو اچھی طرح یقین کر لے کہ ہارون کا باپ ہمیشہ تیرے سر پر بنا رہے گا۔ کل عامر بھی بڑا ہو جائے گا اور ایک نہ ایک دن عامر بھی مصیبت بن جائے۔ یہی یہ بات کہ تو خود صاحب اولاد ہو جائے، ناممکن ہے۔ ہارون ایسا کبھی بھی نہ ہونے دے گا اور اگر یہ لغزش ہو بھی گئی تو یہ بھی ممکن ہے کہ پیدائش کے بعد اس کو ہلاک کر دیا جائے بہرحال تیری آغوش تیری اپنی اولاد سے محروم ہی رہے گی۔" پھر وہ اور زیادہ بے شرمی پر اتر آیا، پوچھا "ہارون نے اب تک یقیناً غسل کیا ہوگا؟"

منیزہ بپھر کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے غصے میں کئی ہاتھ رسید کر دیے، بولی "بے شرم انسان! تو اسی وقت دور ہو جا نظروں سے ورنہ کوئی بدترین حادثہ رونما ہو جائے گا۔"

لیکن بہنوئی بھی آسانی سے زیر ہو جانے والا شخص نہیں تھا مسکراتا ہوا بولا "منیزہ میں غرض مند ہوں اس لیے یہ ذلت بھی برداشت کر لوں گا۔ میں انتہائی خلوص سے تجھ کو یہ باور کرانا چاہتا ہوں کہ تو ہارون اور اس کے حالات کو سمجھنے میں سخت غلطی کر رہی ہے۔ ابھی تک تو جس جگہ کھڑی ہے وہاں سے واپسی آسان ہے لیکن اگر تو نے ہوش مندی سے کام نہ لیا اور آنکھیں بند کیے اسی راہ پر چلتی رہی تو بدقسمتی سے وہ دن بھی آجائے گا۔

جب تو واپس نہیں جا سکے گی اور ساری زندگی خجالت اور ندامت میں گزار دے گی۔"

منیزہ نے بیچ میں کھڑے بہنوئی کو دھکا دے کر راہ سے ہٹا دیا، بولی "میرا راستہ چھوڑ دے او خبیث انسان! تو جو کچھ کہہ رہا ہے یا جو کچھ مزید کہے گا میں نہیں سنوں گی اور ہارون کو تیری یاوہ گوئی سے آگاہ کر دوں گی پھر وہ دے گا تیری باتوں کا صحیح جواب اور کہ تو انتہائی غلط انسان نکلا۔"

منیزہ بھاگ کر پھوپی کے پاس چلی گئی۔ بہنوئی کچھ دیر کھڑا اس کی واپسی کا انتظار کرتا رہا۔ بالآخر وہ بھی مایوس ہو کر باہر چلا گیا۔ اب اس کو ایک فکر بھی لاحق ہو گئی تھی۔ اس نے سوچا اگر منیزہ نے یہ سب کچھ ہارون کو بتا دیا تو کیا ہوگا؟ اس کا نتیجہ کیا نکلے گا؟

اور آخر کار یہ فیصلہ کر لیا کہ پہلے تو وہ اس سے انکار کرے گا لیکن اگر انکار ناممکن ہوا تو وہ ہارون کا مقابلہ کرے گا اور اس مقابلے میں وہ ہارون کو شکست دینے کی کوشش کرے گا۔

دوسری طرف منیزہ کو اب تنہائی سے خوف محسوس ہونے لگا تھا۔ اور وہ دل کی گہرائیوں سے دعا مانگ رہی تھی کہ خدایا تو باپ کو دمشق سے واپس بلوا دے ورنہ ہارون ہی کو واپس بلا لیا جائے۔

یہ دعا اس طرح مقبول بارگاہ ہوئی کہ دوسرے ہی دن اس کا باپ آ گیا۔ باپ کو دیکھتے ہی اس نے سکھ کا سانس لیا اور اس کے سینے سے لگ کر زار و قطار رونے لگی۔ باپ نے اس کی پشت پر شفقت سے ہاتھ پھیر کر پوچھا "بیٹی منیزہ! کیا ہوا کیا؟ یہ تو رو کیوں رہی ہے۔ خیریت تو ہے؟"

منیزہ نے ہچکیاں لیتے ہوتے جواب دیا "باوا جان! میں آپ کی نصیحتوں کو یاد کر کے رو رہی ہوں جو آپ دمشق جانے سے پہلے کر رہے تھے، اس عمر میں اب میں نے یہ سمجھا ہے بزرگوں کو شاید آنے والے واقعات کا قبل از وقت ہی علم ہو جاتا ہے۔"

باپ نے پوچھا۔ "کیا کوئی خاص بات ہو گئی؟"

منیزہ نے جواب دیا "نہیں، ابھی تک تو نہیں۔"

باپ نے شوخی سے منیزہ کے سر پر ہاتھ پھیر کر کہا "کوئی بات کبھی نہیں ہوتی اور بزرگوں کو آنے والے واقعات کا قبل از وقت علم بھی ہو جاتا ہے۔ اب تو ذرا نہ گھبرا، میں آ گیا ہوں۔" پھر کچھ سوچ کر پوچھا "منیزہ! سچ سچ بتا اس نے تجھ کو ستایا تو نہیں؟"

منیزہ رونے لگی "باوا جان! یہ شخص قابلِ اعتبار ہرگز نہیں۔"

باپ نے چونک کر پوچھا "تو رو کیوں رہی ہے؟ اس نے کیا کیا؟ مجھے تو بتا کچھ۔"
منیزہ نے پر جوش آواز میں کہا۔ "یہ کرتا کیا، اگر یہ کچھ کرتا تو میں اس کا برا حشر کر دیتی۔"

باپ نے بار بار اور مختلف طریقوں سے وہ بات معلوم کرنا چاہی جس نے منیزہ کو رُلا دیا تھا لیکن اس نے نہیں بتایا آخر وہ ہارون کے بہنوئی کو تلاش کرتا ہوا وہیں پہنچ گیا جہاں وہ چوروں کی طرح چھپا کھڑا تھا، منیزہ کے باپ نے طنزاً پوچھا "تو یہاں کھڑا کیا کر رہا ہے؟ میں تو تجھے تلاش کرتا پھر رہا ہوں۔"

بہنوئی کی جان میں جان آ گئی، بولا "جناب والا! آپ مجھ کو کہاں تلاش کر رہے تھے؟ میں تو بڑی دیر سے کھڑا آپ کا انتظار کر رہا تھا۔"

منیزہ کے باپ نے منہ بنا کر ہارون کے بہنوئی پر یہ بات واضح کر دی کہ اس کا دل اس سے صاف نہیں ہے۔ اس لیے وہ اب اس پر اعتبار نہیں کرے گا۔ ہارون کے بہنوئی نے بھی منہ بنا کر پشت پھیری اور دل ہی دل میں کچھ کہتے میں مشغول ہو گیا۔

★ ★ ★

ہارون خراسان سے چلا تو پہلے دمشق پہنچا۔ وہاں اپنے بیٹے عامر کو سینے سے لگا لیا۔ عامر باپ کو دیکھتے ہی پھوٹ پھوٹ کر رو دیا اور منیزہ کی شکایت کر دی۔ ہچکیاں لیتے ہوتے کہا "وہ تنہا حمص چلی گئی مجھ کو نہیں لے گئی، حالانکہ میں نے اس کی بڑی خوشامد کی تھی۔"

باپ کو اپنے بیٹے سے ہمدردی ہوئی۔ ابھی وہ اس سے فارغ بھی نہ ہوا تھا کہ اس کا باپ تبھی اس کے پاس جا کھڑا ہوا اور پوچھا۔ "یہ عامر تجھ سے کیا کہہ رہا تھا؟"

ہارون نے جواب دیا "اپنی ماں کی شکایت کر رہا تھا۔"

باپ نے منہ بنا کر کہا "ہاں، میں جانتا ہوں کہ یہ شکایتوں میں حق بجانب ہے، میں نے بھی اس کی سفارش کی تھی کہ اپنے ساتھ لیتی جاتے مگر منیزہ پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا، وہ اپنی مرضی سے حمص چلی گئی۔ تنہا، اکیلی۔ میں نے پہلی بار اس کی خودسری محسوس کی۔"

ہارون نے تلملا کر پوچھا "باوا جان! اس نے آپ کی بات بھی نہیں مانی؟ یعنی اس میں اتنی خودسری آ گئی تھی۔ میں یہ تو معاف کر سکتا ہوں کہ اس نے عامر کا دل توڑ دیا یہ معاف نہیں کر سکتا کہ اس نے آپ کا حکم بھی نہیں مانا۔"

باپ نے پچکارا پھیرا "نہیں، بہو سے بات کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں نے اسے معاف کر دیا۔"

لیکن اس سے ہارون کا پارہ چڑھ چکا تھا۔ وہ منیزہ سے سخت ناراض تھا اور دل ہی دل میں یہ فیصلہ کر لیا کہ پہلے تو وہ منیزہ کو سمجھائے گا، اگر وہ اپنے کیے پر شرمندہ ہو گئی تو کوئی بات نہیں ورنہ وہ طلاق کی دھمکی دے دے گا۔

منیزہ کی سرکشی کا ایک خاص سبب بھی اس کی سمجھ میں آ رہا تھا۔ اس نے سوچا کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ اس کے بہنوئی نے کسی طرح منیزہ کو ورغلایا ہو اور منیزہ کا حمص جانا بھی کہیں اس سلسلے کی کوئی کڑی تو نہیں۔ وہ ان الجھنوں کو اپنے دل و دماغ میں بسائے ہوئے عامر کو لے کر حمص روانہ ہو گیا۔ منیزہ ان دونوں کو اچانک اپنے سامنے دیکھ کر گھبرا گئی۔ اس وقت ہارون کا بہنوئی بھی گھر ہی میں موجود تھا۔ بہنوئی نے سلام میں پہل کی اور ہارون کو سلام کر کے عامر کی طرف بڑھا۔ ہارون نے سلام کا جواب نہیں دیا، تیکھے لہجے میں پوچھا "تو تو یہاں موجود ہے، گویا میرا اندازہ غلط نہیں نکلا۔"

بہنوئی نے بڑی محبت سے عامر کو گود میں اٹھانا چاہا مگر ہارون نے عامر کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچ لیا اور بہنوئی سے کہا "بہن مر گئی، میرا تیرا رشتہ ختم ہو گیا اس لئے اب بے تکلف ہونے کی کوشش نہ کر۔"

بہنوئی نے زہر خند کیا، بولا "ہارون! یہ تجھ کو ہو کیا گیا؟ تو کیسی باتیں کر رہا ہے؟"

ہارون نے جواب دیا "مجھ کو کچھ نہیں ہوا مگر کیا تجھ کو بھی کچھ نہیں ہوا؟"

بہنوئی نے کہا "تو معلوم نہیں کیسی اکھڑی اکھڑی باتیں کر رہا ہے۔"

اس کے بعد اس نے ایک بار پھر عامر کو گود میں اٹھانے کی کوشش کی مگر ہارون نے سختی سے منع کر دیا "کیا میری بات تیری سمجھ میں نہیں آئی؟ میرا تیرا رشتہ ہی کیا؟ اب ہم دونوں ایک دوسرے کے لئے اجنبی ہیں۔"

بہنوئی شرمندہ اور دل برداشتہ ہو کر باہر چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی ہارون نے منیزہ سے پوچھا "منیزہ! تیرا باپ کہاں چلا گیا؟"

منیزہ نے ناگواری سے کہا "میرا باپ گویا تیرا تو کچھ ہے ہی نہیں۔ وہ بازار گیا ہوا ہے۔"

ہارون نے بڑی تیکھی نظروں سے منیزہ کو گھورنا شروع کر دیا۔ منیزہ نے ایک آدھ بار اس کو اس طرح گھورتے دیکھ لیا اور سہم گئی۔ منیزہ نے عامر کو اپنی گود میں بٹھا لیا اور اس سے گھر کی خیریت معلوم کرتا رہا۔ ہارون نے تلخی سے کہا "منیزہ! مجھے تجھ سے یہ امید نہیں تھی

کہ میرے جاتے ہی تو اتنی بدل جائے گی۔"

منیزہ نے جواب دیا "میں ذرا بھی نہیں بدلی۔ تجھ سے یہ کس نے کہہ دیا کہ میں بدل گئی ہوں؟"

ہارون نے کہا "میں جاننا چاہتا ہوں کہ میرے بہنوئی کا اس گھر میں کیا کام ہے؟ یہ یہاں کیوں رہتا ہے؟"

منیزہ نے جواب دیا "ہارون، تو شاید یہ بات بھول گیا کہ یہ میرا گھر نہیں ہے یہ میرے باپ کا گھر ہے اور یہاں ہر وہ شخص آ کر رہ سکتا ہے جس کو والد صاحب اپنے ساتھ رکھنا پسند کریں گے۔"

ہارون دانت پیستا ہوا بولا "اگر یہ بات تھی تو تجھے اپنے باپ کو صاف صاف یہ بتا دینا چاہیئے تھا کہ میں اپنے بہنوئی کو سخت ناپسند کرتا ہوں۔ اس کو اس گھر میں دیکھ کر میں تو حیران بھی ہوا اور پریشان بھی۔"

منیزہ خاموش رہی اور محبت سے عامر کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگی۔

ہارون نے کہا "افسوس کہ میں نے تجھ کو بڑی مشکل سے حاصل کیا تھا اور میں یہ امید کرتا تھا کہ تو مجھ سے اور میرے متعلقین سے ہمیشہ بہت اچھی طرح پیش آتی رہے گی لیکن تو نے تو عامر تک کا خیال نہیں رکھا، اسے چھوڑ کر اکیلی حمص چلی آئی۔"

منیزہ نے جواب دیا "ہاں، وہاں میں بہت پریشان تھی اور اس وقت تک میرے پاس میری پریشانی کا کوئی حل بھی نہیں تھا۔ اس لیے میں حمص چلی آئی۔"

ہارون نے منہ بنا کر کہا "میں تیری ساری باتیں سمجھ چکا، اب تو میری بات بھی سن لے۔ میں دمشق سے یہ فیصلہ کر کے چلا ہوں کہ یا تو تو میری فرماں بردار بن کر رہے گی یا پھر میں تجھے طلاق دے دوں گا۔"

اس تلخ ترین اعلان نے منیزہ کو بدحواس کر دیا۔ اس نے جو کچھ سنا تھا، کانوں پر یقین نہیں آیا۔ اس نے نرمی سے جواب دیا "فرمانبرداری؟ کس قسم کی فرماں برداری؟ کس کی فرماں برداری؟"

ہارون نے کہا "مجھ کو باتوں میں نہ بہلا منیزہ! تو نے میری باتوں کا مطلب اس سے کہیں زیادہ سمجھ لیا ہے جتنا میں سمجھانا چاہتا تھا۔"

منیزہ کو غصہ تو بہت آیا ہوا تھا مگر بات ختم کرنے کے لیے وہ ہارون کے سامنے سے ہٹ گئی، بولی "ہارون! میں محسوس کر رہی ہوں کہ اس وقت تو اپنے ہوش و حواس میں

نہیں ہے اس لیے میں اس وقت کوئی بات ہی نہیں کروں گی۔ پھر کسی وقت جی بھر کے باتیں کر لوں گی۔"

ہارون دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا۔ منیزہ اپنی پھوپی کے پاس چلی گئی، دوسرے کمرے تک جاتے ہوتے ایک جگہ ہارون کا بہنوئی نظر آ گیا۔ وہ شاید اس کا انتظار ہی کر رہا تھا، منیزہ کا خفگی اور غم میں ڈوبا ہوا چہرہ دیکھ کر اس نے پوچھا "منیزہ! کیا بات ہے؟ میرا خیال ہے اس اجڈ انسان نے تیرا دل بھی دکھا دیا۔"

منیزہ نے ڈانٹ کر جواب دیا "تو چپ ہو جا اور مجھ سے بات نہ کر کیونکہ ہارون کی ناراضی کا اصل سبب تو ہے، ہارون تجھ پر اعتبار نہیں کرتا اسی لیے وہ اکھڑی اکھڑی باتیں کر رہا ہے۔"

ہارون کا بہنوئی خاموش ہو گیا۔

سہ پہر کو منیزہ کے باپ سے بھی ملاقات ہو گئی، اس نے اپنے داماد کو بڑی خوش دلی اور خلوص سے خوش آمدید کہی مگر ہارون اب بھی روٹھا ہوا نظر آ رہا تھا۔

منیزہ کے باپ نے کہا "میں تو تیرا بڑی بے چینی سے انتظار کر رہا تھا، خدا کا شکر ہے کہ تو آ گیا۔"

ہارون نے بد مزگی سے کہا "کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ اس گھر میں میری مرحوم بہن کے شوہر کا کیا کام ہے؟ اس کا رشتہ تو ختم ہو چکا۔"

منیزہ کے باپ نے بڑے سکون سے جواب دیا "ہارون بیٹے! تیرا بہنوئی کتنا ہی برا سہی لیکن یہ میدانِ جنگ کے اس دستے میں تھا جس میں میں خود شامل تھا۔" پھر ذرا رک کر بولا "میں نے یا منیزہ نے تیرے بہنوئی کو تیرے ہی ذریعے پہچانا ہے اور اس گھر میں اس کی جتنی بھی قدر و منزلت ہے اس کی بنیادی سبب وہی ہے۔ جو میں نے بیان کر دیا۔"

ہارون نے کہا "اگر یہ بات درست ہے کہ تو نے میری مرحوم بہن کے شوہر کو میرے تعلق اور میرے رشتے سے پہچانا ہے تو اب اس رشتے اور تعلق کا واسطہ دے کر یہ کہہ رہا ہوں کہ اس گھر سے اس کو ہمیشہ کے لئے نکال باہر کیا جائے۔"

منیزہ کے باپ نے افسوس سے کہا "مگر کس طرح؟ اس سے تیری دشمنی کا سبب، وجہ؟"

ہارون نے جواب دیا "میں زیادہ تفصیل میں نہیں جانا چاہتا۔ میں نے جو کچھ کہہ دیا، اس پر عمل ہونا چاہیئے۔"

منیزہ کے باپ نے ذہن پر زور دے کر کچھ سمجھنے کی کوشش کی اور جب کچھ سمجھ میں نہ آیا تو اپنا فیصلہ کن جواب دے مارا "افسوس کہ تو میرے ہی گھر میں کچھ اس طرح باتیں کر رہا ہے گویا میں تیرا غلام ہوں اور تو میرا آقا۔ تجھ کو گفتگو کا سلیقہ تو ہونا ہی چاہیئے۔ تو منیزہ کو اپنے ساتھ لے جا اور مجھ کو میرے حال پر چھوڑ دے۔ میں کسی کے حکم پر نہیں چل سکتا۔"

شاید ہارون کو بھی اپنی تلخ کلامی کا احساس ہو گیا۔ ذرا نرمی سے بولا "پدرِ بزرگوار! میں جب بھی اپنے بہنوئی کی شکل دیکھتا ہوں مجھے بہنوئی کی عیاریاں اور بہن یاد آنے لگتی ہیں، اس لیے میں اس شخص کو اپنے سامنے رکھنا ہی نہیں چاہتا۔"

منیزہ کے باپ نے جواب دیا "تو بلا کا جذباتی اور حساس انسان ہے۔ یہ سب کچھ جان لینے کے بعد کہ میں تجھ سے۔۔۔۔۔"

لیکن ہارون نے بات کاٹ دی، بولا "آپ کچھ بھی کہیں مگر میں اس شخص پر اعتبار نہیں کر سکتا۔"

منیزہ کے باپ نے جواب دیا "میں کب کہتا ہوں کہ تو اس پر اعتبار کر۔" اس کے بعد وہ ہارون کو باہر لے گیا، بولا "میرے ساتھ چل ہم دونوں تخلیے میں باتیں کریں گے۔"

منیزہ کا باپ اسے گھر کے قریب ہی ایک چھوٹے سے باغ میں لے گیا۔ باغ میں انگور کی بیلوں کے سائبان پھیلے ہوتے تھے اور انجیر اور فالسے کے درختوں کی کثرت تھی۔ منیزہ کا باپ اس کو تاکستان کے سائے میں لے کر بیٹھ گیا اور گفتگو کا آغاز کیا "ہارون! تو سوچ رہا ہوگا کہ میں تجھ کو یہاں کیوں لایا اور باتوں کے لیے میں نے گھر کو کیوں نہیں پسند کیا؟"

ہارون نے جواب دیا "ہاں، میں نے اس پر غور تو کیا ہے مگر حیران ہرگز نہیں کیونکہ میں جانتا ہوں کہ بہت سی باتوں کے لیے گھر کی چار دیواری موزوں نہیں ہوتی۔"

منیزہ کا باپ ہنس دیا "بالکل میرے دل کی بات کہہ دی۔ واقعی میں جو بات کہنا چاہتا ہوں اس کے لیے یہ تاکستان کی خلوت بہترین جگہ ہے۔"

ہارون نے لاپرواہی سے جواب دیا "آپ لوگ سنسنی خیز باتوں کے عادی ہیں یا پھر سیدھی سی بات یہ ہے کہ میرے بہنوئی کا جادو کام کر گیا ہے اور آپ چاہتے ہیں کہ میں منیزہ سے قطع تعلق کر لوں اور آپ منیزہ کو میرے بہنوئی کے حوالے کر دیں۔"

منیزہ کے باپ نے کانوں پر ہاتھ رکھے اور گھبرا کر کہنے لگا "بخدا ایسی کوئی

بات نہیں۔ میں تو تجھ سے یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ شادی کے کتی سال بعد بھی تو لاولد کیوں ہے؟"

ہارون نے جواب دیا۔ "یہ سوال تو خدا سے کیجئے۔ اولاد دینا یا نہ دینا تو اس کے اختیار میں ہے۔"

منیزہ کے باپ نے ایک دم جھنجلا کر کہا۔ "میں خدا سے جو پوچھتا ہوں وہ اس سے تعلق رکھتے ہیں لیکن اب جو میں پوچھوں گا اس کا تعلق تجھ سے اور منیزہ سے ہوگا اور تجھ کو ان کے جوابات دینا پڑیں گے۔"

ہارون نے کہا۔ "جو کچھ بھی پوچھنا ہے جلد از جلد پوچھ، ورنہ شاید اس کا بھی موقع ہی نہ آتے اور میں واپس چلا جاؤں۔"

منیزہ کے باپ نے کہا۔ "منیزہ کب تک تیرے بیٹے عامر کی پرورش کرتی رہے گی، وہ اپنے بچے کی پرورش کب کرے گی؟"

ہارون نے جواب دیا۔ "جب تک عامر بڑا نہیں ہو جاتا تیری بیٹی اس کی پرورش کرتی رہے گی جس دن یہ خود ماں بن جائے گی تو اپنے بچے کی پرورش بھی کرے گی۔"

منیزہ کے باپ نے ذرا زور دے کر پوچھا۔ "وہی تو میں پوچھ رہا ہوں کہ وہ ماں کب بنے گی؟"

ہارون نے جواب دیا۔ "جب خدا چاہے گا۔"

منیزہ کے باپ نے کہا۔ "اس میں خدا کو تو کیوں شامل کر رہا ہے، کیا یہ جھوٹ ہے کہ تو اپنے عامر کی خاطر میری بیٹی کو اولاد سے محروم رکھے ہوئے ہے؟"

ہارون ذرا جھجکا کیوں کہ اس کا چور پکڑا گیا تھا، نرمی سے بولا۔ "یہ جھوٹ ہے۔ یہ کس نے بتائی آپ کو؟"

منیزہ کے باپ نے جواب دیا۔ "یہ جھوٹ نہیں ہے، اگر درمیان میں عامر نہ ہوتا تو آج میری بیٹی کی گود میں بچہ ضرور ہوتا۔"

ہارون نے غصہ ظاہر کیا۔ "یہ ساری شرارتیں میرے بہنوئی کی طرف سے ہو رہی ہیں! میں انہیں کسی قیمت پر بھی برداشت نہیں کر سکتا۔"

منیزہ کے باپ نے بھی سختی سے کہا۔ "ہارون! تو نے مجھ پر احسان کیے تھے، میں اس کا یہ صلہ دیا کہ اپنی بیٹی کو عین اس وقت تیرے حوالے کر دیا جبکہ وہ کسی اور کے دلہن بنی بیٹھی تھی۔ اب تجھے یہ زیب نہیں دیتا کہ تو اپنے بیٹے عامر کی خاطر میری بیٹی کو اولاد

سے محروم رکھے۔ میں زیادہ بے نرمی نہیں اختیار کروں گا لیکن تجھے یہ یقین رکھنا چاہیئے کہ میں سب کچھ جان چکا ہوں، ایک ایک بات۔"

ہارون نے پوچھا۔ "آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟ ذرا کھل کر کہیئے۔"

منیزہ کے باپ نے جواب دیا۔ "یہ کہ اب تو اپنی سازش میں کامیاب نہیں ہو سکتا، تجھ کو یہ فیصلہ کرنا ہے کہ تو منیزہ کو چاہتا ہے یا نہیں؟ اگر تو منیزہ کو واقعی چاہتا ہے تو تو اس کو اولاد دے، ورنہ دمشق واپس چلا جا اور عامر کو اپنے ساتھ لیتا جا۔"

ہارون نے کہا۔ "یہ فضول سی شرط ہے، میں منیزہ کو لینے آیا ہوں۔"

منیزہ کے باپ نے جواب دیا۔ "منیزہ تیرے ساتھ جائے گی اور ضرور جائے گی لیکن اسی وقت جبکہ اس کی گود میں اس کا اپنا بچہ بھی ہوگا۔ تو اس وقت تک حمص ہی میں رہے گا۔ جب تک کہ عامر کے علاوہ ایک اور بچے کا بھی باپ نہیں بن جاتا۔"

ہارون نے کہا۔ "مجھے کب تک یہاں رہنا ہوگا؟"

منیزہ کے باپ نے جواب دیا۔ "سال بھر، دو سال، تین سال۔ جب تک تو منیزہ کے بچے کا بھی باپ نہیں بن جاتا۔"

ہارون نے کہا۔ "یہ تو بڑی بُری شرط ہے، میں منیزہ کو جبراً لے جاؤں گا۔"

منیزہ کے باپ نے جواب دیا۔ "اگر جبراً لے جا سکتے ہو تو ضرور لے جاؤ ورنہ یہ اتنی آسان بات بھی نہیں ہے۔"

ہارون نے کھڑے ہوتے ہوتے پوچھا۔ "تو آپ اتنی سی بات کے لیئے یہاں لائے تھے مجھے؟"

منیزہ کے باپ نے جواب دیا۔ "تیرے نزدیک یہ اتنی سی بات ہے تو ہوا کرے میں اس کو بہت بڑی بات سمجھتا ہوں۔"

ہارون نے کہا۔ "منیزہ میری بیوی ہے، آپ اس کو اس کی مرضی کے خلاف نہیں روک سکتے، میں اس سلسلے میں پہلے منیزہ سے بات کروں گا اس کے بعد کوئی فیصلہ کروں گا۔"

منیزہ کے باپ نے کہا۔ "تو منیزہ سے بھی بات کر لے۔ میں نے کب منع کیا ہے۔"

وہ دونوں چپ چاپ اٹھے اور گھر کی طرف چل پڑے۔ دونوں میں سے کسی ایک نے بھی راستے میں کوئی بات نہ کی۔

منیزہ کے باپ کو اس وقت بڑی شرمندگی ہوئی جب اس کو یہ معلوم ہوا کہ منیزہ اور ہارون کا بہنوئی دونوں کمرے میں تنہا باتوں میں مشغول ہیں، عامر باہر کھڑا باپ کا انتظار کر رہا تھا۔ منیزہ کے باپ نے کمرے میں داخل ہونے کی کوشش کی مگر ہارون نے اس کو پکڑ لیا اور سرگوشی میں کہا "اس طرح نہیں پہلے ان دونوں کی باتیں سن لی جائیں کیونکہ میں اپنے شبہات کو یقین میں بدل دینا چاہتا ہوں، اگر ان دونوں میں کسی قسم کے عہد و پیمان ہو رہے ہیں تو مجھ کو کنارہ کشی اختیار کر لینا چاہیئے۔"

منیزہ کا باپ بہت شرمندہ تھا، بولا "لیکن رسول اللہ ﷺ نے کسی کی جستجو کرنے سے منع کیا ہے۔"

ہارون نے جواب دیا "لیکن میں کسی کی جستجو کب کر رہا ہوں میں تو اپنی بیوی کی باتیں سننا چاہتا ہوں۔"

منیزہ کے باپ نے کہا "ہارون! اگر تیرا شبہ یقین میں بدل گیا تو میں تیرا ساتھ دوں گا کیونکہ میں ایک غیرت مند باپ ہوں اور میں یہ نہیں برداشت کر سکتا کہ منیزہ ہم دونوں کو دھوکا دے۔"

ہارون نے اپنے سسر کے منہ پہ ہاتھ رکھ دیا "خاموش رہیئے، ہماری سرگوشی کی آواز کہیں اندر تک نہ پہنچ جائے۔"

یہ دونوں دروازے سے کان لگا کر کھڑے ہو گئے لیکن منیزہ کے باپ کی حالت غیر ہو رہی تھی۔

اندر آہستہ آہستہ باتیں ہو رہی تھیں۔ ہارون کا بہنوئی کہہ رہا تھا "منیزہ! بات بگڑنا نہیں چاہیئے۔ میں ہارون کا بہنوئی رہ چکا ہوں اس لئے میں ہارون سے بھی محبت رکھتا ہوں۔ ہاں، اس سے ضرور اختلاف ہے کہ اس نے ایک سازش کے زیرِ اثر تجھ کو اولاد سے محروم کر رکھا ہے۔"

منیزہ نے افسردہ لہجے میں جواب دیا "لوگ جو کچھ کہہ رہے ہیں میں اس پر یقین رکھتی ہوں لیکن میں ہارون کی جدائی برداشت نہیں کر سکتی اور پھر عامر تو میرا اپنا ہی بیٹا ہے۔"

باہر منیزہ کے باپ کا دھڑکتا ہوا دل کسی حد تک قابو میں آ گیا وہ جو کچھ سن چکا تھا، اس سے وہ ایک بڑی شرمندگی سے بچ گیا تھا۔ لیکن دل میں کہیں یہ چور اب بھی موجود تھا کہ کہیں وہ دونوں ایسی باتیں نہ کرنے لگیں جو اس کے کان سننا نہیں چاہتے۔ منیزہ کے باپ نے ہارون کو فاتحانہ انداز میں دیکھا، بولا "سُن لیں دونوں کی باتیں، ورنہ میں تو ڈر ہی گیا تھا کہ کہیں آج میرے چہرے پر سیاہی نہ پُت جائے۔"

ہارون نے کہا "ذرا توقف سے کام لیجئے۔ ابھی دستک نہ دیجئے گا۔"

لیکن اندر والوں کو ان کی آہٹ مِل چکی تھی۔ اندر سے دروازہ کھل گیا اور دونوں ہارون اور منیزہ کے باپ کو اپنے سامنے کھڑا دیکھ کر پریشان ہو گئے۔

منیزہ نے پوچھا "یہ آپ دونوں یہاں چوروں کی طرح کیوں کھڑے ہوئے ہیں؟"

ہارون نے جواب دیا "یہی سوال میں تجھ سے کر سکتا ہوں کہ منیزہ! یہ تم دونوں چوروں کی طرح اندر بند ہو کر کیسی باتیں کر رہے تھے؟"

دونوں کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ ہارون کے بہنوئی نے کہا "ہم دونوں تخلیے میں موجود تو ضرور تھے لیکن باتیں تخلیے کی نہیں ہو رہی تھیں۔"

منیزہ البتہ شرمندہ تھی باپ سے بولی "آپ دونوں اتنی جلدی واپس آ گئے؟"

ہارون نے طنزاً کہا "ہاں، حالانکہ تو سمجھ رہی ہو گی کہ ہم دونوں آدھا دن گزار کر واپس آئیں گے۔"

منیزہ کھسیانی ہوئی تھی، بولی "نہیں، میں ایسا نہیں سمجھ رہی تھی۔"

ہارون نے اپنے بہنوئی اور منیزہ کے باپ سے کہا "آپ دونوں باہر چلے جائیں میں منیزہ سے فیصلہ کن باتیں اسی وقت کر لینا چاہتا ہوں۔"

منیزہ کے باپ نے جواب دیا "لیکن اس کا خیال رہے کہ میری بیٹی نے تیرے بہنوئی سے کوئی ایسی بات نہیں کی ہے جس کا تو طعنہ دے یا جواب طلب کرے۔ ہاں وہ تخلیے میں باتیں کرنے کی البتہ گناہ گار ہے۔"

ہارون کے بہنوئی نے اعتذار کے لہجے میں کہا "ہارون! تخلیے میں میں ہی لایا تھا ورنہ منیزہ نہیں آ رہی تھی، اس لیے اس سلسلے میں منیزہ کو لعن طعن نہ کرنا۔"

ہارون نے جواب دیا "منیزہ میری بیوی ہے، میں اس سے جو بھی باتیں کروں گا تم لوگوں کی رہنمائی اور مشوروں کے بغیر کروں گا۔"

منیزہ کا باپ ہارون کے بہنوئی کو لے کر چلا گیا۔ راستے میں کہا "تو نے یہ اچھی بات نہیں کی۔ تو نے ہارون کو بلا وجہ شک و شبہے میں ڈال دیا۔"

اندر ہارون نے جب دروازہ بند کرنا چاہا تو منیزہ نے خوفزدہ ہو کر کہا "دروازہ بند نہ کر، کیا کھلے کمرے میں باتیں نہیں ہو سکتیں؟"

ہارون نے منیزہ کی خواہش پر کمرے کو بند نہیں کیا، بولا "تو مجھ سے خوفزدہ ہے؟"

منیزہ نے جواب دیا "نہیں تو۔"

ہارون نے کہا "نہیں، تو مجھ سے خوفزدہ ہے۔ کیونکہ تو کمرے کو اندر سے بند کرنے میں خوف محسوس کر رہی ہے۔"

منیزہ نے موضوع بدل دینا چاہا "ہارون! تجھے جو باتیں کرنا ہیں وہ کر، بے کار باتوں سے کچھ حاصل نہیں۔"

ہارون نے جواب دیا "منیزہ! بات دراصل یہ ہے کہ اگر ہم دونوں تنہا رہیں اور کسی کو اپنے معاملات میں دخل دینے کا موقع نہ دیں تو ہم دونوں زیادہ خوش رہیں گے۔ کم از کم میں تو اس نتیجے پر پہنچا ہوں۔"

منیزہ نے جواب دیا "نہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔ لوگوں نے تو ازراہ ہمدردی بس یہ کیا ہے کہ میرے ساتھ جو زیادتی ہو رہی تھی اس سے مطلع کر دیا اور اس سے میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ خاندان کے لوگ بہت ضروری ہیں کیونکہ یہ لوگ غلطیوں اور کوتاہیوں کی نشاندہی کر کے تادیر ان پر قائم نہیں رہنے دیتے۔"

ہارون نے کہا "اپنے اپنے تجربے ہیں۔ کوئی بات ایک کو نقصان پہنچاتی ہے تو دوسرے کے لیے سود مند ثابت ہوتی ہے۔"

منیزہ نے کہا "اب کام کی بات کر، تو نے کیا فیصلہ کیا ہے؟"

ہارون نے پوچھا "کس سلسلے میں؟ کس بات کا فیصلہ؟"

منیزہ نے جواب دیا "سبھی لوگ معترض ہیں کہ شادی کے کئی سال بعد بھی میں اولاد سے محروم کیوں ہوں۔"

ہارون کو چاروں طرف سے ایک ہی بات سننا پڑ رہی تھی۔ وہ بوکھلا گیا "کیا تو نے اس کا کیا جواب دیا؟"

منیزہ نے کہا "میرے پاس اس کا کوئی جواب نہیں، جواب تو تجھے دینا ہے۔"

ہارون نے کہا "لیکن جب تو نے عامر کو اپنا بیٹا مان لیا ہے تو پھر اس پر اصرار کیوں؟"

منیزہ نے جواب دیا "اپنی اولاد کی بات ہی کچھ اور ہے۔ میں اپنا بچہ چاہتی ہوں، اپنی اولاد۔"

ہارون نے تھکے تھکے لہجے میں کہا "منیزہ! لوگوں کے ورغلانے میں نہیں آنا چاہیے

ورنہ یہ طے ہے کہ ہم دونوں کے تعلقات میں خوشگواری اسی وقت تک ہے جب کہ تو اپنے بچے کی ماں نہیں بن جاتی۔ تو اس بات کو سمجھ نہیں رہی ہے، لوگ وہ سب نہیں دیکھ سکتے جو میری آنکھیں دیکھ رہی ہیں۔"

منیزہ نے اٹل لہجے میں کہا "لیکن میں بچہ چاہتی ہوں، اپنا بچہ، جو میری کوکھ سے پیدا ہوا ہو، جسے میں نے اپنے خون سے پالا ہو۔"

ہارون نے کہا "اگر میں انکار کر دوں تو؟"

منیزہ نے جواب دیا "تب پھر میں عامر کو بھی اپنے پاس نہیں رکھوں گی۔"

ہارون ایک دم چونک پڑا "تو عامر کو اپنے پاس نہیں رکھے گی، کیوں؟"

منیزہ نے جواب دیا "سچائی تلخ ہوتی ہے۔ میں اور تقریباً سبھی لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ عامر کی وجہ سے اولاد سے محروم ہوں اور چونکہ یہ ایک حقیقت بھی ہے اس لیے میں اپنی بے اولادی کے سبب کو دور کر دوں گی۔"

ہارون نے حیرت سے رک رک کر کہا "لیکن ابھی کچھ دیر پہلے تو تو عامر کو اپنا بیٹا کہہ رہی تھی۔"

"ہاں، میں عامر کو اپنا بیٹا کہہ رہی تھی اور ہمیشہ اس کو اپنا بیٹا سمجھا بھی ہے لیکن میں اپنے حقیقی بیٹے کی خواہش میں عامر کی جدائی گوارا کر لوں گی۔"

ہارون نے کہا "منیزہ، تو جو فیصلہ بھی کرے یہ سوچ کر کر کہ اگر اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے تو تو آسانی سے بھگت لے۔"

منیزہ نے جواب دیا "ہارون! میں نے اس سے زیادہ سوچ رکھا ہے۔ میں اس وقت تک تجھ سے دور رہوں گی جب تک کہ میں تیرے بچے کی ماں نہ بن جاؤں۔ میں تجھ کو اپنے ساتھ رہنے کا ایک ماہ دوں گی، اس کے بعد تو چلا جائے گا اور اس وقت تک تو میرے پاس نہیں آئے گا جب تک کہ میں ایک بچے کی ماں نہ بن جاؤں۔"

ہارون نے پوچھا "اگر میں تجھ کو مایوس کر کے چلا جاؤں تو؟"

منیزہ نے جواب دیا "تو اس صورت میں، میں تیرا دو سال انتظار کروں گی کہ شاید تو اپنا فیصلہ بدل دے اور میری خواہش کے احترام میں عامر کو ایک بھائی یا بہن عطا کر دے۔"

ہارون نے پوچھا "اور اگر میں دو سال بعد بھی اپنے فیصلے پر قائم رہا تو؟"

منیزہ نے ایک سرد آہ بھری، بولی "تب پھر میں اپنی سوچ بدل دوں گا اور تجھ سے امیدیں ختم کر کے تیری جگہ کسی اور کو دینے کی کوشش کروں گی۔"

ہارون نے افسوس سے کہا "منیزہ! افسوس کہ میں آج تک اس غلط فہمی یا خو بدنصیبی کا آغاز ہو جائے گا۔
فہمی میں رہا کہ ہم دونوں میں ایک مثالی محبت پائی جاتی ہے، یعنی ہم دونوں کی روحیں محو تیسری طرف دل کے اندر معلوم نہیں کون یہ مشورہ دے رہا تھا کہ دو سال تک صبر
کے لطیف جذبوں سے سرشار ہیں لیکن اس وقت یہ سن کر بڑا دکھ پہنچا کہ تو میری جگہ کر، ممکن ہے اس عرصے میں خود منیزہ کو اپنی بے جا ضد پر افسوس ہو اور شرمندگی کا اظہار کر کے
اولاد کو بھی درے سکتی ہے۔" دوبارہ رجوع ہو جائے۔

منیزہ نے خشک لہجے میں جواب دیا "افسوس کہ ابھی تک میں بھی اسی خوش فہ منیزہ اس کے چہرے پر نظریں گاڑے امید و بیم کی اذیت جھیل رہی تھی۔ وہ ہارون
میں تھی، لیکن جب مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ تیری نظر میں عامر مجھ سے زیادہ اہم ہے تو میرا کو متامل دیکھ کر پُرامید ہو گئی تھی اور اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا تھا۔ اس کے کان
ٹوٹ گیا اور میں مایوسیوں کے گہرے سمندر میں بیٹھتی چلی گئی اور مجھ کو مجبوراً یہ فیصلہ کرنا ہارون سے جو کچھ سننا چاہتے تھے، دل وہ مفہوم پا چکا تھا۔ ہارون کی کچھ دیر کی خاموشی اس
پڑا جس کا ابھی ابھی میں نے ذکر کیا ہے۔" کے لئے ناقابل برداشت ہو گئی۔ بے چینی سے بول اٹھی "ہارون! مجھے پریشان نہ کر اور اپنے
ہارون اپنے مقدمے کو بہت مضبوط سمجھ رہا تھا مگر جب دلائل اور براہین فیصلے سے فوراً ہی آگاہ کر دے!"
جنگ چھڑی تو وہ شکست کھا گیا، شکست فاش۔ اس نے بے دلی سے پوچھا "تو یہ تیرا ہارون نے محبت بھری نظروں سے منیزہ کو دیکھا اور مسکرا دیا گو کہ اس مسکراہٹ میں
اور آخری فیصلہ ہے کہ اولاد سے محروم رہ کر تو مجھ سے علیحدگی اختیار کر لے گی؟" یاس اور ناکامی کا احساس بھی شامل تھا مگر اس احساس کو منیزہ محسوس نہ کر سکی۔ ہارون نے
منیزہ نے جواب دیا "میں تجھ کو اپنے ساتھ ایک ماہ رکھ سکتی ہوں اس کے بعد پُرسکون اور باوقار لہجے میں کہا "منیزہ! افسوس کہ میں تجھ کو بے حد چاہتا ہوں اور اس پر
فیصلہ کر دوں گی!" یقین رکھتا ہوں کہ اگر کسی وجہ سے مجھ کو تجھ سے ہمیشہ کے لئے جدا ہونا پڑے تو میں زیادہ
ہارون نے کہا "لیکن میں بھی دھوکے میں نہیں رکھنا چاہتا، میں تجھ کو کسی پر دن زندہ نہیں رہوں گا۔۔۔"
بچوں کی ماں بنا کر عامر کی بدنصیبی کو آواز دینا پسند نہیں کرتا۔ میں یہاں ایک ماہ بھی کیوں منیزہ نے بات کاٹ دی، بے اختیار بولی "تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ تو نے اپنا فیصلہ بدل
جبکہ میں یہ قطعی فیصلہ کر چکا ہوں کہ جب تک عامر جوان نہ ہو جاتے میں کسی دوسرے پر دیا ہے اور اب میں اپنے بچے کی ماں بن جاؤں گی!"
باپ نہیں بنوں گا۔" ہارون نے جواب دیا "نہیں، یہ بات نہیں، میں اپنے فیصلے پر اب بھی قائم ہوں۔
منیزہ نے دفورِ جذبات میں آنکھیں بند کر لیں بولی "تب پھر تو اسی وقت میں دو سال کے لیے تجھ سے جدا ہوا جاتا ہوں۔ تو یہ دو سال اس امید میں گزار دے گی کہ شاید
جا اور دو سال تک اپنی اس غلطی پر سوچتا رہ، اگر اس عرصے میں تو ندامت محسوس کرنے مجھ میں تبدیلی آ گئی ہو اور میں اس ہجر کو یوں برداشت کر لوں گا کہ اگر تو مجھ سے واقعی محبت
اور میری گود کبھی آباد کرنے پر آمادہ ہو جائے تو میں تیری واپسی پر خوش آمدید کہوں گی اور کرتی ہے تو عین ممکن ہے کہ تو خود ہی اپنے فیصلے سے منحرف ہو جائے اور میرے پاس
دو سال بعد بھی تو خود کو نہ بدل سکے تو از راہ مہربانی مجھ کو طلاق دے دینا تاکہ میں آزاد چلی آئے۔"
جاؤں اور اپنے بارے میں کوئی اور فیصلہ کر دوں!" منیزہ نے آنکھیں بند کر لیں اور بستر پر گر گئی، بولی "تب پھر تو یہاں سے اسی وقت
ہارون نے دل میں سوچا کہ کیوں نہ وہ اپنے دو سال بعد والے فیصلے کا بھی اسی دن چلا جا اور دو سال بعد مجھ سے ملاقات کر، لیکن میرے بارے میں ہمیشہ اس یقین پر عمل کرنا
اعلان کر دے لیکن وہ منیزہ کو چھوڑنے پر آمادہ نہیں تھا۔ جب وہ یہ سوچتا کہ اس کی منیزہ کہ میں اولاد سے کم پر کوئی سمجھوتہ کر لوں گی تو یہ تیری بھول ہو گی!"
کسی اور کی آغوش میں چلی جائے گی تو وہ ایک عجیب سا کرب محسوس کرنے لگتا۔ دوسری طرف ہارون ایک دم کھڑا ہو گیا، بولا "اچھا منیزہ! اب میں یہاں نہیں ٹھہروں
اس کا باپ اور بکر، دونوں ہی خیالوں میں اس کو منع کر رہے تھے اور ہاتھ کے اشاروں گا۔ میں عامر کو اپنے ساتھ لیے جا رہا ہوں۔ دو سال بعد تیرے فیصلے کے بارے میں معلوم
اس کو روک رہے تھے کہ خبردار جو تو نے منیزہ کو اولاد دی کیونکہ جب بھی تو ایسا کرے گا کر لوں گا!"

منیزہ کو یہ یقین نہیں تھا کہ ہارون فوراً ہی رختِ سفر باندھ دے گا۔ بولی "اگر تو چاہے تو ابھی ایک ماہ تو رہ سکتا ہے؟"

ہارون نے جواب دیا "میں نے کہہ جو دیا کہ میں اپنا فیصلہ بدل نہیں سکتا جب بدلنا ہی نہیں تو پھر ایک ماہ بھی کیوں رہوں؟"

منیزہ نے ہونٹ بھینچ لیے، بولی "تیری مرضی، اب میں بھی اصرار نہیں کروں گی۔"

ہارون کمرے سے باہر نکلا تو اپنے بہنوئی اور منیزہ کے باپ کے انداز سے سمجھ گیا کہ ان دونوں نے بھی اس کی باتیں سن لی ہیں کیونکہ دونوں میں سے کسی ایک نے بھی نہیں پوچھا کہ اندر کیا فیصلہ ہوا؟

اس نے عامر کا ہاتھ پکڑا اور بڑے دکھ سے کہا "آؤ بیٹے دمشق چلیں دادا کے پاس۔"

عامر نے معصومیت سے پوچھا "اور میری نئی ماں؟ کیا وہ نہیں چلیں گی؟"

ہارون نے اپنے غم کو سینے میں دبا لیا، بولا "ہاں بیٹے! منیزہ نہیں آئے گی، یہیں رہے گی اور ممکن ہے کہ وہ اب ہمیشہ ہی یہیں رہے اور ہماری پھر کبھی اس سے ملاقات ہی نہ ہو۔"

منیزہ کا باپ آگے بڑھا اور بولا "ہارون! میں تیرا انتظار کروں گا۔"

بہنوئی نے کہا "بہرحال میں ابھی تک مایوس نہیں ہوا اور اس جدائی کو عارضی سمجھ رہا ہوں۔ منیزہ تیری ہے اور ہمیشہ تیری ہی رہے گی۔"

ہارون نے جواب دیا "بہرحال یہ جو کچھ ہوا یا جو کچھ ہوگا اس میں ہاتھ قدرت کا کارفرما ہے۔"

بہنوئی نے کہا "اگر یہ شک تیرے دل میں بیٹھ گیا ہے کہ اس اختلاف اور فیصلے میں میرا ہاتھ کام کر رہا ہے تو میں معذرت خواہ ہوں، مجھ کو معاف کر دے۔" اس کے بعد عامر کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا "یہ معصوم ان ہنگاموں میں کیوں شامل ہو۔" پھر عامر سے سوال کیا "عامر بیٹے! کیا تو ہمارے معاملات جانتا ہے؟ میں چاہتا ہوں کہ تو میرے پاس ہی رہ جائے میں تیری پرورش کر سکتا ہوں۔" پھر ہارون سے پوچھا "کیا تو عامر کو ساتھ ہی لے جائے گا؟"

ہارون نے جواب دیا "ہاں میں عامر کو اپنے ساتھ ہی لے جاؤں گا۔"

بہنوئی نے کہا "میری طرف سے منیزہ اور تجھ کو ایک پیش کش ہے۔"

ہارون نے پوچھا "کون سی پیش کش ہے؟"

بہنوئی نے جواب دیا "تیرے گھر میں کوئی عورت نہیں ہے اگر تو چاہے تو عامر کو میرے حوالے کر دے، میں اس کو بڑے پیار سے رکھوں گا، اس طرح تو منیزہ کی خواہش بھی پوری کر سکے گا۔"

ہارون نے پوچھا "پھر؟ یعنی اس سے مجھے کیا سہارا ملے گا؟"

بہنوئی نے جواب دیا "اس سے یہ سہارا ملے گا کہ تو عامر کی طرف سے بے نیاز ہو کر منیزہ کو خوش رکھ سکے گا۔"

ہارون کے جی میں آئی کہ وہ اسی وقت عامر کو اپنے بہنوئی کے حوالے کر دے اور خود منیزہ کے پاس واپس جائے اور ہنس کر یہ خوش خبری سنا دے کہ وہ منیزہ کی ہر خواہش پوری کرنے کو تیار ہے۔

لیکن پھر اچانک اس نے اپنا فیصلہ بدل دیا اور عامر کو ساتھ لے کر چل دیا۔ اس وقت منیزہ کمرے کے در پر کھڑی ہارون کو جاتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ منیزہ کا باپ اور ہارون کا بہنوئی دونوں ہی اس کو جاتے ہوئے دیکھتے رہے۔ جب وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا تو منیزہ بستر پر دوبارہ گر گئی اور سسکیاں لے لے کر رونے لگی۔

★ ★ ★

ہارون دمشق واپس گیا اور اپنے باپ کو پوری تفصیل بتا دی۔ باپ ساری رُوداد توجہ سے سنتا رہا، آخر میں پوچھا "پھر اب کیا ہوگا، میں تو یہ جاننا چاہتا ہوں۔"

ہارون نے جواب دیا "بادا جان! میں نے آپ کی ہدایت پر عمل کیا ہے، آپ ہی بتائیے کہ میں کیا کروں؟"

باپ نے فکرمند لہجے میں کہا "تو خراسان یا کسی اور محاذ پر چلا جائے گا، عامر کی دیکھ بھال کون کرے گا؟"

ہارون نے کہا "میں خود بھی یہی سوچ سوچ کر پریشان ہو رہا ہوں۔"

باپ نے کہا "تو نے منیزہ سے کہہ دیا ہوتا کہ دو سال بعد بھی میں اپنے ارادوں پر قائم رہوں گا اس لیے جو فیصلہ کرنا ہے ابھی کر لے۔"

ہارون نے جواب دیا "بادا جان! میں نے یہ بات کہہ دی تھی مگر اس نے کہا کہ نہیں میں اس فیصلے کو نہیں مانتی کیونکہ دو سال بعد یہ جذبات نہیں ہوں گے جو اس وقت ہیں

اور جب یہ جذبات نہیں ہوں گے تو یہ فیصلہ بھی نہیں ہوگا، اس لیے اس وقتی ہنگامی
اور جذباتی فیصلے کو میں نہیں مانتی۔"

باپ نے کہا "تب پھر تو منیزہ کو طلاق دے دے اور دوسری شادی کر لے۔"

ہارون ہنس دیا "میں دوسری شادی کیوں کر لوں؟ اس کا فائدہ؟"

باپ نے جواب دیا "اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ عامر کی پرورش اور نگہداشت اچھ
طرح ہو جائے گی۔"

ہارون نے کہا "اور جب یہ دوسری بیوی بھی مجھ سے اولاد کی خواہش کرے گ
اس وقت میں کیا کروں گا؟"

باپ پھر سوچ میں پڑ گیا، بولا "عامر کی فلاح اسی میں ہے کہ کسی اور لڑکی یا ع
سے تیری اولاد نہ ہو۔"

ہارون نے کہا "افسوس کہ میں خراسان واپس جاؤں گا، عامر کس کے پاس رہے
اس کو کس کے پاس چھوڑ جاؤں؟"

باپ کا دماغ بھی کام نہیں کر رہا تھا۔

ہارون کی عدم موجودگی میں اس کے بہنوئی نے بڑی کوشش کی کہ منیزہ کو طلا
پر آمادہ کر لے لیکن وہ اس موضوع پر بات ہی نہیں کرنا چاہتی تھی اس نے اپنے باپ
کہہ دیا کہ اگر یہ شخص اسی طرح باتیں کرتا رہا تو وہ دمشق میں اپنے شوہر ہارون کے پا
چلی جائے گی۔

ہارون نے خراسان جاتے ہوئے عامر کو اپنے ساتھ لیا کیونکہ وہ عامر کے سلسلے م
باپ کو نہیں پریشان کرنا چاہتا تھا۔ وہ عامر کو لے کر خراسان کے چپے چپے میں گھومتا پھ
رہا۔ اس کو اپنے باپ سے بھی ایک معمولی سی شکایت تھی کہ وہ ہارون کو مشورہ تو ایسا د
دے دیا جن کی افادیت مسلم تھی، لیکن اس پر عمل دشوار تھا۔ ہارون بمشکل ڈیڑھ سال با
گزار سکا اس کے بعد وہ سیدھا حمص پہنچا اور منیزہ کے سامنے وہ زر و مال ڈھیر کر دیا
اس نے مختلف جنگوں میں انعام و اکرام اور مال غنیمت سے حاصل کیا تھا۔ منیزہ اس کا انتظا
تو کر رہی تھی لیکن اتنی بے چینی سے نہیں کیونکہ اس کے اپنے حساب کے مطابق ہارون ک
ٹھیک دو سال بعد واپس آنا تھا۔ جب منیزہ کے سامنے مال و زر کا ڈھیر لگایا گیا تو اس ک
باپ کی رال ٹپک پڑی اور اس نے بیٹی کو حکم دیا "ہارون تھکا ہوا ہوگا اس لیے اس ک
غسل اور آرام کا انتظام کر دے۔"

عامر بھی ان دونوں کے سامنے ہی تھا مگر اس پر دونوں میں سے کسی ایک نے بھی
توجہ نہیں دی۔ ہارون نے عامر کو حکم دیا کہ "عامر! تو نے اپنی ماں کو سلام نہیں کیا؟"

عامر نے جھجکتے ہوئے نہایت تکلف سے منیزہ کو سلام کیا۔ منیزہ نے بھی کسی قدر
تکلف سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور سلام کا جواب دے کر پوچھا "تو ٹھیک ٹھاک تو ہے؟"

عامر نے گردن ہلا کر جواب دیا "بالکل ٹھیک ہوں ماں۔"

ہارون نے ادھر ادھر دیکھ کر پوچھا "منیزہ! میرا بہنوئی کہاں چلا گیا؟"

منیزہ نے جواب دیا "اس نے دوسری شادی کر لی۔"

ہارون نے اطمینان کی سانس لی، بولا "منیزہ! تو نے بہت بڑی خوشخبری سنائی ورنہ
میں اس کی طرف سے بہت فکر مند رہتا تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہم دونوں میں جو ناچاقیاں ہوتی
ان میں میرے بہنوئی کا بڑا ہاتھ تھا۔"

منیزہ نے جواب دیا "لیکن میں ایسا نہیں سمجھتی۔"

ہارون نے پوچھا "وہ آج کل کہاں رہ رہا ہے؟"

منیزہ نے جواب دیا "یہیں، اسی گھر میں میرے پاس ہی۔"

ہارون نے کہا "خوب! تو اس نے ابھی پیچھا نہیں چھوڑا۔"

منیزہ نے پوچھا "تو دمشق گیا تھا؟"

ہارون نے جواب دیا "نہیں، میں ابھی دمشق نہیں گیا، سیدھا تیرے پاس آیا ہوں،
اب یہاں سے تجھ کو لے کر دمشق جاؤں گا۔"

منیزہ نے کہا "ہم دونوں میں دو سال کی مدت طے ہوئی تھی۔ تو نے کیا
فیصلہ کیا؟"

ہارون نے جواب دیا "میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ تجھ کو لے کر دمشق چلا جاؤں۔"

منیزہ نے کہا "لیکن میں اس وقت تک تیرے ساتھ نہیں جاؤں گی جب تک کہ میں
اس پر یقین نہ کر لوں کہ اب میں بے اولاد نہیں رہوں گی۔"

ہارون نے عامر کی طرف دیکھ کر خفیف سا اشارہ کیا، بولا "منیزہ! کچھ تو لحاظ کر،
اس موضوع پر پھر بات ہو جائے گی۔ اب ہم دونوں کے درمیان سے میرا بہنوئی بھی نکل
گیا۔ میرا خیال ہے کہ تجھ کو اب ضد نہیں کرنا چاہیئے۔"

منیزہ نے جواب دیا "یہ تو بار بار بہنوئی کا ذکر بیچ میں کیوں لے آتا ہے میں اس کو
نہیں جانتی، میرا مطالبہ اس سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔"

منیزہ کا باپ جو ذرا سی دیر کے لئے ٹل گیا تھا دوبارہ آ گیا۔ ہارون نے اپنے سامان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "اس کو کہیں اندر رکھوا دیجئے۔"

منیزہ کا باپ سامان اٹھانے لگا۔ ہارون کے آنے کی خبر سن کر پاس پڑوس کے لوگ بھی آ گئے۔ ان میں اس کا بہنوئی بھی تھا۔ ہارون کو دیکھتے ہی فرطِ جوش میں لپٹ گیا اور پوچھا۔ "ہارون! یہ تو کب آیا؟ خوب۔" اس کے بعد عامر کی طرف مڑ گیا۔ "اور عامر کیسا ہے؟"

عامر نے بھی کبھی مسکراہٹ میں جواب دیا۔ "اچھا ہوں۔"

منیزہ اٹھ کر جانے لگی تو ہارون نے پوچھا۔ "کہاں؟"

منیزہ نے جواب دیا۔ "میں ابھی آتی ہوں تم لوگ باتیں کرو۔"

ہارون اپنے بہنوئی سے باتیں کرنے لگا، کہا۔ "تم نے شادی کر لی اور مجھ کو پتہ بھی نہ چلا۔"

بہنوئی نے جواب دیا۔ "ہاں، میں پوری زندگی تنہا تو نہیں گزار سکتا تھا اور اگر اس شادی کی اطلاع دینا چاہتا تو کہاں دیتا؟"

ہارون نے کہا۔ "یہ اچھا کیا۔"

بہنوئی ہنس دیا، کہا۔ "ہاں، اچھا ہی کیا کیونکہ جب تک میں شادی نہ کرتا تم ہی رہتا۔ تلوار کی طرح تیرے سر پر لٹکا رہتا۔"

ہارون نے کھسیا کر جواب دیا۔ "ایسی بات نہیں تھی بھائی، لیکن میں کچھ شک شبے میں ضرور مبتلا ہو گیا تھا۔"

بہنوئی نے کہا۔ "بقیہ باتیں تو ہوتی رہیں گی، بعد میں کر لوں گا، لیکن اس وقت میں چند ایسی باتیں کرنا چاہتا ہوں جو منیزہ کی موجودگی میں شاید نہ کر سکوں۔"

ہارون نے کہا۔ "ہاں ہاں، بھائی ضرور کرو، میں تیار ہوں۔"

بہنوئی نے پوچھا۔ "میرا خیال ہے تو منیزہ کی دی ہوئی مدت سے پہلے آ گیا ہے۔"

ہارون نے جواب دیا۔ "ہاں، تقریباً چھ ماہ قبل۔"

بہنوئی نے پوچھا۔ "کیا تم نے یہ فیصلہ کر لیا کہ منیزہ کی خواہش پوری کر دی جا

ہارون نے جواب دیا۔ "بھائی! میں منیزہ کو نہیں چھوڑ سکتا اور عامر سے نا الگ بھی نہیں برداشت کر سکتا، اس لیے تم ہی کوئی مشورہ دو کہ میں کیا کروں؟"

بہنوئی نے کہا۔ "تو منیزہ کی خواہش پوری کر دے کیونکہ میں نے اس دوران ہر طرح ٹٹول کر یہ اندازہ لگا لیا ہے کہ وہ جو چاہتی ہے اس سے دستبردار نہیں ہو سکتی۔"

ہارون نے پیشانی کو انگلیوں سے سہلایا، پوچھا۔ "بھائی! اگر میں منیزہ کی خواہش پوری کر دوں تو کیا وہ اپنے بچے کی موجودگی میں عامر کو نظرانداز نہیں کر دے گی؟"

بہنوئی نے ذہن پر ذرا سا زور دے کر جواب دیا۔ "اگر یہ خطرہ نہ ہوتا تو تجھ میں یہ مشورہ کبھی نہ دیتا کہ تو منیزہ سے کوئی بچہ نہ ہونے دے لیکن اب صورت حال بدل چکی ہے اور منیزہ بچے کی خواہش میں دیوانی ہو رہی ہے تو اب اسے زیادہ دنوں تک نہیں بہلایا جا سکتا۔ اس لیے میرا مشورہ یہ ہے کہ تو اس کی خواہش پوری کر دے رہ گیا عامر، تو اس کو میرے پاس چھوڑ دے، میں اس کو خوش رکھوں گا اور کوئی کمی نہیں محسوس ہونے دوں گا۔"

ہارون نے کسی قدر پس و پیش سے کہا۔ "بھائی! پہلے مجھے غور کر لینے دو، اس کے بعد میں کوئی فیصلہ کر لوں گا۔"

ہارون نے اپنے بہنوئی کی نئی بیوی کو بھی دیکھا جو بظاہر ایک سیدھی سادی عورت نظر آتی تھی۔

تین دن تک ہارون نے منیزہ سے مزید کوئی بات نہیں کی، اس کے اعزاز میں دعوتیں ہوتی رہیں اور ہارون انہیں اڑاتا رہا۔ بہنوئی نے عامر کی دلجوئی شروع کر دی اور اس کو اپنے پاس ہی رکھ لیا۔ عامر بھی اپنے پھوپا میں خلوص اور محبت محسوس کر رہا تھا۔ اس نے منیزہ کو اپنی طرف سے کھنچا کھنچا محسوس کیا تو پھر منیزہ کے پاس جانے کی ضرورت ہی نہیں محسوس کی۔

منیزہ نے چوتھے دن ہارون کو ایک بار پھر گھیر لیا اور پوچھا۔ "ہارون! میں مستقل بے چینی محسوس کر رہی ہوں، تو نے ابھی تک مجھے نہیں بتایا کہ تو نے کیا فیصلہ کیا؟"

ہارون بہت خوش تھا، مسکراتا ہوا منیزہ کے سامنے کھڑا ہو گیا، بولا۔ "میں نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ تجھ کو اپنے ساتھ لے کر دمشق چلا جاؤں، اور خراسان واپس جانے کے منصوبے کو ذہن سے نکال دوں۔"

منیزہ نے جواب دیا۔ "لیکن میں دمشق اس وقت تک نہیں جاؤں گی جب تک کہ میں اولاد والی نہ ہو جاؤں۔"

ہارون نے کہا۔ "اگر میں تیری خواہش پوری کر دوں تو تو یہ بتا کہ عامر کا کیا

پنے گا' وہ کہاں رہے گا؟"

منیزہ نے جواب دیا۔ "ہارون! یہ خدشہ تو اپنے ذہن سے نکال دے کہ میں اپنے بچے کی موجودگی میں عامر سے زیادتی کروں گی، میں نے عامر کو ہمیشہ اپنا ہی بیٹا سمجھا ہے اور ہمیشہ ہی بیٹا سمجھتی رہوں گی، تجھ کو اس کی طرف سے فکر مند نہیں ہونا چاہیئے۔"

ہارون نے خوشی کا اظہار کیا، بولا۔ "اگر یہ بات ہے تو میرا فیصلہ بھی سن لے جب میں یہاں آیا ہوں، اس وقت تک میں اس نتیجے پر پہنچ چکا ہوں کہ میں نے تیرے ساتھ واقعی بڑی زیادتی کی ہے اور اب اس کی تلافی چاہتا ہوں۔ عامر تیرے ہی پاس رہے گا اور یاد رکھ کہ اگر اس کو کوئی شکایت ہوئی تو میں بھی بے مروتی اختیار کر لوں گا۔"

یہ خبر منیزہ کے باپ کو بھی مل گئی۔ اس نے خوشی کا بے پایاں اظہار کیا۔

اب ہارون کی اس گھر میں جو قدر و منزلت تھی، اس سے پہلے اس کو نصیب بھی نہ ہوئی تھی۔ منیزہ کے قہقہے اور شوخیاں پھر عود کر آئی تھیں۔ منیزہ کا باپ ہارون کی ناز برداریوں میں لگا رہتا۔ ہارون کا بہنوئی بھی بے حد خوش تھا۔ ہاں اگر ان سب میں کوئی رنجیدہ تھا تو وہ عامر تھا۔ وہ معلوم نہیں کس سوچ میں پڑ گیا تھا۔ منیزہ ہارون کو دکھانے کے لیئے اگر کسی وقت عامر کی طرف پیار و محبت سے متوجہ بھی ہوتی تو اس میں وہ شدت اور گرمی نہ ہوتی جو پہلے کبھی ہوا کرتی تھی۔ عامر اس کمی کو محسوس کر رہا تھا لیکن خود ہارون اس سے بے خبر تھا۔ ہارون کا بہنوئی بھی عامر کے خلا کو محسوس کر رہا تھا۔ وہ کبھی کبھی دبے لفظوں میں عامر کو سمجھانے لگتا۔ "بیٹے عامر! تیرا باپ تجھ سے چھن گیا لیکن تو ذرا بھی فکر نہ کر، میں جو موجود ہوں۔"

عامر کہتا۔ "لیکن پھوپا جان! میری نئی ماں منیزہ پہلے تو ایسی نہیں تھی، یہ اب اس کو کیا ہو گیا ہے؟"

پھوپا جواب دیتا۔ "ہاں پہلے وہ تجھی سے پیار کرتی تھی، مگر اب وہ اپنی محبت کا ذخیرہ اپنے بچے کے لیے محفوظ کر رہی ہے۔ اپنے اس بچے کے لیے جو ہنوز عدم میں ہے مگر آنے کے لیے پاؤں ہلا رہا ہے۔"

پھوپا کی سمجھ میں عامر کی باتیں تو آ رہی تھیں مگر پھوپا کی باتیں عامر کی سمجھ میں بالکل نہیں آ رہی تھیں۔

* * *

کئی ماہ حمص میں رہنے کے بعد ہارون اور منیزہ نے دمشق جانے کا منصوبہ بنایا۔ اب منیزہ کے باپ کو بھی کوئی اعتراض نہیں تھا۔ ہارون کو اب ایک ہی فکر تھی، وہ یہ کہ اس کا باپ منیزہ کو بار دار دیکھ کر خوش نہیں ہو گا۔ اس نے کئی راتیں اس فکر اور تشویش میں گزار دیں کہ وہ اس سلسلے میں اپنے باپ کو جواب کیا دے گا؟

جب جانے کی تیاریاں مکمل ہو گئیں تو منیزہ نے ہارون کو مشورہ دیا۔ "ہارون! میں کئی دن سے تجھ کو ملول اور فکر مند محسوس کر رہی ہوں، کیا میں پوچھ سکتی ہوں کہ ایسا کیوں ہے؟"

ہارون نے جواب دیا۔ "منیزہ! اب میں تجھ سے کوئی بات کبھی نہیں چھپاؤں گا، میں یہ سوچ رہا ہوں کہ میرا باپ جب تجھ کو امید سے دیکھے گا تو مجھ پر بہت برہم ہو گا۔ میں سوچ رہا ہوں کہ میں اس کے جواز میں کیا کہوں گا!"

منیزہ کا منہ لٹک گیا۔ بولی۔ "تیرے باپ کو یہ سوال کرنا ہی نہیں چاہیئے۔"

ہارون نے کہا۔ "میرے باپ کو کیا کرنا چاہیئے اور کیا نہیں کرنا چاہیئے، یہ ان کو کون سمجھا سکتا ہے۔ سر دست تو یہی سوچنا ہے کہ میرا باپ تجھ کو اس حال میں دیکھ کر خوش نہیں ہو گا۔"

منیزہ نے برا سا منہ بنایا۔ "مجھ کو اس حال میں دیکھ کر اگر وہ خوش نہیں ہوتا تو نہ ہو، مجھ کو اس کی پرواہ بھی نہیں، تو اس کا یہ مطلب بھی ہوا کہ میں دمشق میں زیادہ دن نہیں رہ سکوں گی۔"

ہارون نے تسلی دی۔ "بہر حال میں کسی نہ کسی طرح اس کو سمجھا لوں گا اور ایک ڈر یہ بھی ہے کہ میرا باپ کہیں عامر کو اپنے پاس ہی نہ روک لے کیونکہ اس کو فوراً ہی یہ شبہ گزرے گا کہ اب عامر پر پوری توجہ نہیں دی جا رہی ہو گی۔ میں اپنے باپ کے دل سے یہ شبہ کس طرح نکالوں گا اور پھر یہ امکان بھی موجود ہے کہ میرا باپ عامر کو اپنے پاس ہی روک لے اور اس کو تیرے خلاف کرنا شروع کر دے۔ انہی فکروں نے مجھ کو ہلکان اور پریشان کر رکھا ہے۔"

منیزہ نے چٹکی بجائی۔ "اس کا حل ہے میرے پاس۔"

"اس کا کیا حل ہے؟"

"اس کا حل یہ ہے کہ دمشق میں زیادہ قیام ہی نہ کیا جائے اور عامر کو حمص ہی میں رکھا جائے۔ تیرا بہنوئی اس پر خصوصی توجہ دے رہا ہے۔"

ہارون نے اپنے ذہن پر ذرا سا زور دیا تو منیزہ کی یہ تجویز بہت اچھی لگی، بولا۔ "لیکن اس میں ایک خرابی بھی ہے۔"

"کون سی خرابی؟ میں بھی تو سنوں اس خرابی کے بارے میں تفصیل۔"

ہارون نے جواب دیا۔ "اس میں خرابی یہ ہے کہ اگر عامر حمص میں رہا تو اس کے ننھے سے دل پر یہ اثر ہوگا کہ ہم دونوں نے اس کو نظر انداز کرنا شروع کر دیا ہے اور یہیں سے اس میں احساس محرومی پیدا ہو جائے گا۔"

منیزہ نے کہا۔ "اتنی گہرائیوں میں مت جا ہارون۔ میرا کہنا مان اور عامر کو اپنے بہنوئی کے پاس ہی چھوڑ جا۔ میرا خیال ہے تیرا بہنوئی عامر کو اتنا خوش رکھے گا کہ وہ ہم دونوں کو بھول جائے گا۔"

ہارون نے جواب دیا۔ "بہرحال اس پر خوب اچھی طرح غور کر کے کوئی قدم اٹھانا ہوگا۔"

منیزہ نے مسکرا کر کہا۔ "میں نے یہ کب کہا تھا کہ جو بھی کرنا ہو فوراً ہی کر ڈالو۔"

ہارون نے عامر کو لے جانے یا نہ لے جانے پر خاصہ غور و فکر سے کام لیا اور بالآخر اسی نتیجے پر پہنچا کہ عامر کو اپنے ساتھ لے جانے میں کوئی فائدہ نہیں، نقصان ہی نقصان ہے۔ اس نے خاموشی سے منیزہ کو اپنے فیصلے سے مطلع کر دیا، بولا۔ "منیزہ! اب میں تیرے ہی فیصلے پر عمل کروں گا۔ ہم دونوں دمشق چلیں گے عامر یہیں بہنوئی کے پاس ہی رہے گا۔ اس طرح میرے باپ کو ورغلانے پھسلانے کا موقع نہیں ملے گا اور وہ عامر کو روک بھی نہیں سکے گا۔"

منیزہ کا چہرہ خوشی سے تمتمانے لگا، بولی۔ "میں ہمیشہ تجھ کو وہی مشورہ دوں گی جس سے تجھ کو نقصان نہ پہنچے۔ میں تیری شریک حیات ہوں، بیوی، زندگی بھر کا ساتھ۔ میں ہمیشہ تیرے لئے وہی چاہوں گی جو خود اپنے لیے پسند کروں گی، اس لیے تجھ کو مجھ پر بھروسہ کرنا چاہیئے۔"

ہارون نے منیزہ کو آغوش میں سمیٹ لیا، بولا۔ "افسوس کہ میں نے تجھ کو سمجھنے میں بڑی غلطیاں کی ہیں لیکن اب یہ غلطیاں نہیں ہوں گی۔"

منیزہ نے ہارون کی گرم سانسیں اپنے چہرے پر محسوس کیں تو دونوں آنکھیں بند کر لیں، بولی۔ "ہارون! کوئی انسان کبھی غلطی نہ کرے اگر اس کو دوسرے

ورغلانے پر مجبور نہ کر دیں۔ تو معصوم اور پاک باز انسان ہے جب کہ دوسرے چالاک اور عیار تھے۔ ان چالاکوں نے تجھ کو ورغلا کر گمراہ کر دیا تھا اس لیے مجھ کو تجھ سے کوئی شکایت نہیں، مجھ کو ان لوگوں سے شکایت ہے جو دوسروں کے معاملات میں خواہ مخواہ دخل دے کر انہیں تباہی اور بربادی کے کنارے پر پہنچا دیتے ہیں۔ افسوس کہ تیرا باپ بھی انہی میں سے ایک ہے۔"

ہارون شرما رہا تھا۔ وہ کوئی جواب نہیں دے سکا اور شرما کر آنکھیں بند کر لیں۔

عامر نے ابھی تک یہ سوچا بھی نہ تھا کہ اس کا باپ اور منیزہ اسے چھوڑ کر دمشق چلے جائیں گے۔ پھوپا نے بڑی تسلیاں دیں لیکن عامر کا دکھ دور نہیں ہوا۔ دوسری طرف ہارون بھی عامر کی کمی محسوس کر رہا تھا مگر منیزہ نے تسلی دی اور سمجھایا کہ عامر کو کبھی کبھی تنہا چھوڑ کر اس میں خود اعتمادی پیدا ہونے کا موقع دو۔ ہارون کو غم کے ساتھ ہی یہ خوف بھی محسوس ہو رہا تھا کہ اس کا باپ اس کی اس حرکت پر خوب خوب لعن طعن کرے گا۔

عامر کا یہ حال تھا کہ کئی دن تک اس کی بھوک پیاس اڑی رہی۔ لیکن اس کا پھوپا برابر دل جوئی کرتا رہا۔ عامر بار بار ٹھنڈی سانس بھر کے پوچھتا۔ "یہ بادا جان مجھے اپنے ساتھ کیوں نہیں لے گئے، مجھے یہاں کیوں چھوڑ گئے ہیں؟"

پھوپا نے محبت سے سر پر ہاتھ پھیرا اور جواب دیا۔ "بیٹے عامر! اب تو میرا بیٹا ہے، اپنے باپ کو زیادہ نہ یاد کر۔ اب تو میرے ہی پاس رہے گا، تیرا باپ ایک اور عامر کی فکر میں ہے۔"

ایک اور عامر کی فکر کا مطلب عامر کی سمجھ میں نہیں آیا اور اس سلسلے میں اس نے کوئی سوال بھی نہیں کیا۔ وہ زیادہ تر باتیں اپنے آپ سے معلوم کرنا چاہتا تھا کسی سے سوال کیے بغیر، ہر وقت کچھ نہ کچھ سوچتا رہتا۔

ہارون اور منیزہ کو عامر کے بغیر دیکھ کر ہارون کے باپ کو حیرت بھی ہوئی اور دکھ بھی۔ اور ساتھ ہی ایک لایعنی ان جانا خوف بھی محسوس ہوا، لیکن جب اس کو یہ معلوم ہوا کہ عامر خیریت سے ہے اور حمص میں اپنے پھوپا کے ساتھ رہ رہا ہے تو ہارون کا باپ سناٹے میں رہ گیا۔ اس نے ہارون کو مال و زر اور سامان کے بغیر دیکھا تو اور زیادہ پریشان ہو گیا، پوچھا۔ "کیا اس بار تو خالی ہاتھ آیا ہے؟"

ہارون نے جواب دیا۔ "نہیں باوا جان میں خالی ہاتھ تو نہیں آیا۔ کچھ سامان لایا تھا اسے حمص میں چھوڑ آیا۔"

"حمص میں چھوڑ آیا! کیا مطلب؟ حمص میں کس کے پاس چھوڑ آیا؟"

ہارون نے جواب دیا۔ "حمص میں منیزہ کے گھر، کیونکہ میں خراسان سے سیدھا حمص گیا تھا۔"

باپ نے تلخی سے کہا۔ "لیکن حمص میں تیرا اپنا گھر تو نہیں ہے۔ یہ کیسی تبدیلیاں دیکھ رہا ہوں میں تجھ میں۔"

ہارون نے جواب دیا۔ "ہاں باوا جان! مجھ میں کچھ تبدیلیاں سچ مچ آگئی ہیں۔"

باپ نے سر سے پاؤں تک بیٹے کو بغور دیکھا۔ "عامر کو بھی اپنے ساتھ نہیں لایا۔ اپنا مال و زر بھی حمص ہی میں چھوڑ آیا، تجھ میں عجیب سی تبدیلیاں دیکھ رہا ہوں میں۔"

ہارون نے جواب دیا۔ "ہاں باوا جان! میں نے ڈیڑھ سال تک اپنے مسائل پر غور کیا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ میں غلطی پر ہوں، مجھ کو اپنے مسائل کا حل خود ہی سوچنا چاہیئے۔ مجھے اپنے معاملات کا خود ہی فیصلہ کرنا چاہیئے۔"

باپ نے بوکھلا کر پوچھا۔ "یعنی، یعنی کیا مطلب؟"

ہارون نے منیزہ کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا، دونوں ہی کے چہروں پر مسکراہٹ موجود تھی، پھر باپ سے کہا۔ "مطلب یہ کہ میں منیزہ کو ناخوش نہیں رکھ سکتا۔ وہ جن کی عمریں ختم ہو چکیں اور عدم کی سرحد پر کھڑے ہیں ان لوگوں کو صحیح مشورہ کس طرح دیں گے جو بظاہر عدم کی سرحدوں سے دور ہیں۔ میں منیزہ کو اولاد سے محروم نہیں رکھ سکتا۔"

باپ نے ہارون کی باتیں بڑے تحمل سے سنیں اور کسی قدر لاپرواہی سے جواب دیا۔ "اپنے غلط فیصلوں کے نتائج بھی تو خود ہی بھگتے گا۔ میں جانتا تھا کہ تو ایک نہ ایک دن بڑوں کے فیصلوں سے منحرف ہو جائے گا۔"

ہارون نے کہا۔ "میں بڑوں کے فیصلے سے منحرف نہیں ہوا، بلکہ فیصلوں کی غلطی سے بچنے کی کوشش کی ہے۔"

باپ نے ان دونوں میں دلچسپی ہی نہیں لی، انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا۔

اب ہارون اور منیزہ کا بیشتر وقت ساتھ گزر رہا تھا۔ ان کی محبتیں

دم جوان ہو گئی تھیں۔ احتیاط اور ہدایات کی طنابیں کھل گئی تھیں اور انہیں پہلی بار محبت اور آزادی کے نشے اور لذت کا صحیح علم ہوا تھا۔ وہ دونوں کچھ دن دمشق میں رہے اور پھر حمص چلے گئے۔ حمص میں بھی یہ دونوں آزادی سے ادھر ادھر گھومتے پھرتے رہے۔ ہارون کے بہنوئی نے عامر کی ذمہ داریاں بڑی محنت اور محبت سے نبھائیں۔ ہارون جب عامر کو اپنے بہنوئی کے پاس خوش و خرم دیکھتا تو اس کی طمانیت اور سکون میں اور اضافہ ہو جاتا۔ دمشق میں ہارون کا باپ تنہا رہ رہا تھا۔ وہ اکثر ان حسین اور چہل پہل سے بھرپور دنوں کو یاد کرتا رہتا جب اس گھر میں ہارون کی پہلی بیوی، عامر، ہارون کی بہن اور دوسرے لوگ سرگرم عمل رہتے تھے۔ انہی میں منیزہ بھی یاد آجاتی، لیکن منیزہ کی یاد سے وہ ملول ہو جاتا۔ ہارون نے اپنے باپ کو تقریباً نظر انداز کر دیا تھا۔ منیزہ کو یہ سوچ سوچ کر خوشی ہوتی تھی کہ آخر کار اس نے اس بوڑھے سے بدلہ لے لیا۔

ایک سال بعد منیزہ بھی ایک بچے کی ماں بن گئی۔ ہارون لڑکے کا نام عامر کے وزن پر فاہر رکھنا چاہتا تھا لیکن منیزہ نے اس نام کو ناپسند کیا اور اس کا نام ابراہیم رکھ دیا۔ یہ بات عامر کو بھی معلوم ہوئی تو اس کو دکھ پہنچا۔ اس کی سمجھ میں یہ نہیں آتا تھا کہ منیزہ اس سے نفرت کیوں کرنے لگی۔ ابراہیم کی ولادت کی خبر جب ہارون کے باپ کو پہنچی تو وہ رونے لگا، اور ہارون کو خط لکھا کہ عامر کو اس کے پاس بھیج دیا جائے تاکہ اس کی تنہائی دور ہو جائے، لیکن عامر کو اس کے پھوپا نے بھیجنے سے انکار کر دیا۔

ہارون کو ایک بار پھر حمص چھوڑنا پڑا، لیکن اب اسے موصل کے آس پاس خارجیوں سے جنگ کرنا تھی۔ وہ غیر معینہ مدت کے لئے جزیرہ اور اس کے مضافات میں بھیج دیا گیا۔ ہارون کے بہنوئی نے عارضی طور پر سپاہ گری چھوڑ دی اور حمص کے حاکم کی ملازمت اختیار کر لی۔ وہ عامر پر بڑی توجہ دے رہا تھا۔ یہ عامر کی خوش قسمتی تھی یا بدقسمتی کہ اس کا پھوپا اولاد سے محروم تھا چنانچہ دونوں میاں بیوی نے عامر کو اپنی اولاد کی طرح رکھا اور منیزہ کی عدم توجہی کو محسوس نہیں ہونے دیا۔ مگر دونوں کسی طرح عامر کے دل میں جھانک سکتے اور انہیں کوئی ایسا وسیلہ حاصل ہوتا جس سے دلوں کے احساسات معلوم کیے جا سکتے تو وہ عامر کے دل میں نفرت کا ایک ایسا شعلہ موجزن دیکھتے جو بڑھ کر بڑی سے بڑی شے کو جلا سکتا تھا۔

ہارون اپنی بیوی کو خطوں میں یہی لکھتا رہتا تھا کہ اب ابراہیم کی موجودگی میں منیزہ پر یہ فرض عائد ہو گیا ہے کہ عامر کا بھی اتنا ہی خیال رکھے جتنا وہ ابراہیم کا رکھتی ہو گی۔ وہ ابراہیم کے لیے جو کچھ بھیجتا وہی عامر کے لیے بھی بھیجتا لیکن منیزہ اسے بھی رکھ لیتی اور عامر کو اس کی ہوا تک نہ دیتی۔ وہ عامر کے ذکر پر یہی سوچنے لگتی کہ یہی وہ ذات ہے جس کی وجہ سے کئی سال تک اس کو اپنی اولاد سے محروم رکھا گیا۔ اس کا یہ انداز فکر اس کے دل میں عامر کے خلاف نفرتیں بڑھاتا جا رہا تھا اور اب جب کہ اس نے یہ دیکھا کہ ہارون ابراہیم کا تنہا ذکر کبھی بھی نہیں کرتا، اس کے ساتھ عامر کا ذکر ضرور کر دیتا ہے، اس طرح سوچتے سوچتے وہ اس نتیجے پر پہنچی کہ عامر کو اب حمص میں نہیں رہنا چاہیے۔ کیونکہ عامر جب تک حمص میں رہے گا، ہارون اس کے بیٹے ابراہیم پر خاص توجہ نہیں دے سکے گا۔ لیکن اب مشکل یہ تھی کہ عامر اس کے ساتھ نہیں رہتا تھا، ہارون کے بہنوئی کے پاس رہ رہا تھا اور ہارون کے بہنوئی کو ترکِ سکونت پر مجبور نہیں کیا جا سکتا تھا۔

دوسری طرف ہارون کا بہنوئی منیزہ کے حسد کو پوری طرح محسوس کر رہا تھا۔ منیزہ عامر سے جتنا زیادہ حسد کرتی، ہارون کا بہنوئی اسی قدر خوش ہوتا اور عامر پر نوازشوں اور عنایتوں کی بارش کر دیتا۔ وہ منیزہ کو اس طرح جلا جلا کر ایک قسم کی لذت حاصل کر رہا تھا۔

ایک دن جب وہ حمص کے حاکم کے پاس سے اٹھا تو گھر میں داخلے سے پہلے اس کی ایک اجنبی سے ملاقات ہو گئی۔ یہ شخص سامان کی پوٹلی سنبھالے منیزہ کے باپ کا پتہ پوچھ رہا تھا۔ منیزہ کا باپ اس وقت گھر میں نہیں تھا۔ اس نے اس شخص کو عزت احترام سے اپنے گھر میں بٹھایا اور اپنا تعارف کرایا۔ "میں ہارون کا بہنوئی ہوں، اگر ہارون کا کوئی پیغام تیرے پاس ہے تو مجھے دے دے۔"

اس شخص نے تپاک سے ہاتھ ملایا اور پوٹلی اس کے حوالے کر دی، بولا! "ہارون نے بھجوائی ہے اس میں ایک خط بھی ہے اور کچھ رقم بھی، اس کے علاوہ کپڑے بھی ہیں۔"

اس نے پوٹلی لے لی اور ہارون کا خط پڑھنے لگا۔ اس میں منیزہ کو لکھا گیا تھا:۔

"صبح کی شفق کی طرح گلنار اور مشرقی افق پر سے طلوع ہونے والی تنویر کی طرح حسین منیزہ! میں عنقریب واپس آ رہا ہوں لیکن ساتھ ہی یہ دھڑکا بھی لگا ہوا ہے کہ کہیں کوئی خارجی میرا کام تمام نہ کر دے کیونکہ دو دن پہلے میں ایک خارجی کی زد میں آ گیا تھا۔ ہم تین ہزار سپاہی خارجیوں کی تلاش میں ادھر ادھر مارے مارے پھر رہے تھے کہ رات کو خارجیوں نے ہم پر شب خون مار دیا۔ ان کے اچانک اور خوفناک حملے نے ہمیں اتنا بدحواس کر دیا تھا کہ ہم میں ان کا مقابلہ کرنے کی ہمت ہی نہیں رہی خارجی ہمیں بیدردی سے قتل کرتے رہے، ہمارے خیموں کی طنابیں کاٹ کر انہیں آگ لگا دی، اور ہمارے گھوڑوں پر قبضہ کر لیا۔ میں نے ذرا سی دیر میں اپنے چاروں طرف خون کے فوارے چھوٹتے دیکھے، زخمیوں کی چیخ و پکار نے قیامت صغریٰ برپا کر رکھی تھی جس نے بھی ہتھیار سنبھالا، خارجیوں کے ہاتھوں مارا گیا۔ اس ہنگامۂ دار و گیر میں معلوم نہیں کس طرح میں نے یہ تدبیر کی کہ قتل ہونے والوں میں مُردوں کی طرح لیٹ گیا۔ خارجیوں نے ہم پر شب خون کے فوارے چھوٹتے دیکھے، زخمیوں کی چیخ و پکار نے قیامتِ صغریٰ برپا ایک خارجی نے اپنا پاؤں میرے منہ پر رکھ دیا اور کچلتا ہوا نکل گیا۔ میں دم سادھے اذیت کی پرواہ کیے بغیر مُردے کی طرح پڑا رہا۔ میں نے اپنے جگہ سے حرکت تک نہ کی جب تک کہ مجھ کو یہ یقین نہیں ہو گیا کہ سارے خارجی جا چکے ہیں، اور اب وہ واپس نہیں آئیں گے۔ میں اپنی جگہ سے اٹھا اور بچتا بچاتا چھپتا چھپاتا موصل پہنچا اور خارجیوں کے خوفناک شب خون کی حکومت کو اطلاع دی۔

منیزہ! مجھے حیرت ہے کہ میں زندہ کس طرح بچ گیا؟ شاید تیری، عامر اور ابراہیم کی وجہ سے۔ کیونکہ ان تینوں کو میری ضرورت ہے۔ حکومت نے مجھے انعام و اکرام سے نواز دیا ہے کیونکہ میں نے حکومت کو یہی تاثر دیا ہے کہ میں نے خارجیوں کا تنہا زبردست مقابلہ کیا اور ان کے خطرناک محاصرے سے بزور قوت بچ نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔

منیزہ! تو دعا کرتی رہ کہ میں خارجیوں سے محفوظ رہوں ورنہ یہ وہ جری لوگ ہیں جن کے چند افراد سینکڑوں بلکہ ہزاروں کو شکست دے دیتے ہیں۔ بڑے بڑے تجربہ کاروں کا یہ قول ہے کہ ان جیسے بہادر روئے زمین پر نہیں اور نہ پہلے کبھی تھے۔

مجھ کو تیری، ابراہیم اور عامر کی یاد آتی رہتی ہے۔ میں چند ریشمی ٹکڑے

بھیج رہا ہوں، ان میں کے دو نیلے پارچے عامر کے لیے ہیں کیونکہ عامر کو نیلا رنگ بہت پسند ہے۔ بقیہ تو اپنے اور ابراہیم کے لئے رکھ لے۔

میں نے اس سے پہلے جو سلیپر روانہ کی تھیں، وہ پسند آئیں یا نہیں؟ عامر کو اپنی سلیپر کیسی لگی؟

منیزہ! میں تجھ کو خدا اور رسولؐ کا واسطہ دیتا ہوں کہ تو عامر کا خاص خیال رکھ۔ ابراہیم کی سفارش اس لیے نہیں کر رہا ہوں کہ وہ تیرا بیٹا ہے اور اس کے لیے کچھ لکھوں یا نہ لکھوں تو اس کا خیال بہر حال رکھے گی مگر عامر کے لیے اس لیے لکھ رہا ہوں کہ وہ چند سالوں سے ہماری توجہ سے محروم ہے، میرے بہنوئیؓ نے اس کی ذمہ داریاں قبول کر کے ہم دونوں کو کسی حد تک بے نیاز کر دیا ہے مگر میں اس بے نیازی کو ناپسند کرتا ہوں۔ میں نے تیری خواہش پوری کر دی اور ابراہیم سے تیری گود بھر دی، اب تو بھی میری خواہش پوری کر، اور عامر پر وہی نوازشیں برسا دے جو کبھی دمشق میں برسایا کرتی تھی۔

میرے خوابوں اور خیالوں کی پُراسرار ساحرہ! کیا تو جانتی ہے کہ دمشق میں میرا باپ بیماری جھیل رہا ہے، افسوس کہ اس وقت میں اس کے پاس نہیں، لیکن جلد ہی میں تجھے لے کر دمشق چلا جاؤں گا، اگر تو اپنے باپ کے ذریعے میرے بیمار باپ کی خبر گیری کر سکے تو ضرور کر۔ میں تیرا عمر بھر احسان مند رہوں گا۔"

ہارون کے بہنوئیؓ نے اس شخص کو رخصت کر دیا پھر خط اور سامان کی پوٹلی منیزہ کو پہنچا دی۔ اس نے منیزہ پر یہ نہیں ظاہر ہونے دیا کہ اس نے ہارون کا خط پڑھ لیا ہے۔ منیزہ خط کو لے کر کمرے میں چلی گئی اور کچھ دیر بعد جب باہر نکلی تو اس کا چہرہ اترا ہوا تھا، بہنوئیؓ نے پوچھا۔ "کیا کوئی خاص بات ہو گئی ؟"

منیزہ نے جواب دیا۔ "ہاں ہارون بہت جلد آنے والا ہے۔ وہ خارجیوں کے ہاتھوں قتل ہوتے ہوتے بچ گیا۔"

اس نے پوچھا۔ "اور کچھ ؟"

منیزہ نے جواب دیا۔ "اور یہ کہ ہارون کا باپ دمشق میں ایڑیاں رگڑ رہا ہے تو عامر کو ساتھ لے کر فوراً دمشق چلا جا، کیونکہ یہ میری نہیں ہارون کی خواہش ہے۔"

وہ منیزہ کے جھوٹ پر حیران رہ گیا، پوچھا۔ "اور کچھ ؟"

منیزہ نے جل کر جواب دیا۔ "اور کچھ نہیں، کیا یہ کافی نہیں ہے ؟"

وہ بڑی دیر تک منیزہ کے پاس ہی بیٹھا رہا کہ شاید ریشمی پارچے عامر کے حوالے کر دیئے جائیں لیکن منیزہ نے ان کا ذکر تک نہیں کیا۔ عامر بھی یہ خبر سن کر وہیں آ کر بیٹھ گیا کہ اس کے باپ کا خط آیا ہوا ہے، لیکن منیزہ نے اس کی موجودگی کو بالکل نظر انداز کر دیا اور کنکھیوں تک سے دیکھنا گوارا نہ کیا۔ اس نے عامر کو جلانے کے لیے ابراہیم کو گود میں اٹھا لیا اور اس کو بھینچ بھینچ کر پیار کرتی ہوئی بولی۔ "ابراہیم! تیرے باپ نے تجھ کو پیار لکھا ہے اور ہدایت کی ہے کہ میں تجھ کو خوب بھینچ بھینچ کر تیرے باپ کی طرف سے پیار کر دوں۔"

بہنوئیؓ نے عامر کی طرف دیکھا جو کھویا کھویا، گم صم یہ منظر دیکھ کر دل ہی دل میں رو رہا تھا۔ بہنوئیؓ نے پوچھا۔ "کیا ہارون نے عامر کے لیے کچھ بھی نہیں لکھا؟"

منیزہ نے چونک کر باری باری دونوں کی طرف دیکھا اور عامر کے پیچھو پا کر جواب دیا۔ "نہیں، عامر کے لئے کچھ بھی نہیں لکھا اور پھر ابراہیم سے عامر کا کیا مقابلہ عامر بلوغت کی طرف بڑھ رہا ہے اور ابراہیم ابھی ماں کا دودھ پی رہا ہے چنانچہ میرا شیر خوار جس محبت اور توجہ کا مستحق ہے عامر تو اس توجہ اور محبت کا مستحق نہیں ہو سکتا۔"

بہنوئیؓ نے جواب دیا۔ "منیزہ! تیرا انداز فکر درست نہیں، ایک باپ کی نظر میں چھوٹے بڑے بچے میں کوئی فرق نہیں ہوتا، میں خوب جانتا ہوں کہ ہارون عامر سے بھی بڑی محبت کرتا ہے اور اگر اس نے اپنے خط میں عامر کی بابت کچھ نہیں لکھا تو حیرت ہے۔"

منیزہ نے تہیّا مان کر کہا۔ "میں تجھ سے ایک بات کچھ عرصے سے نہیں کہہ پا رہی ہوں لیکن اب کہہ ڈالوں گی۔"

بہنوئیؓ نے جواب دیا۔ "تو ضرور کہہ ڈال کیونکہ جب دلوں میں کدورت پیدا ہو جائے تو منافقت سے بچنا چاہیئے۔"

منیزہ نے پوچھا۔ "کیا میں پوچھ سکتی ہوں کہ تو اس گھر میں کیوں رہ رہا ہے ؟"

اس نے جواب دیا۔ "میں اس لیے رہ رہا ہوں کہ تو نے اور تیرے باپ نے مجھ کو یہاں روک رکھا ہے۔"

منیزہ نے کہا" ایسی کوئی بات نہیں۔ اگر تو اس طرح سوچ رہا ہے تو غلط سوچ رہا ہے اب تجھ کو یہاں سے چلا جانا چاہیئے۔"

اس نے جواب دیا" میں تیرے کہنے سے تو ہرگز نہیں جاؤں گا، مجھ کو ایک عرصہ سے شبہ تھا کہ ایک نہ ایک دن تو مجھ سے اس قسم کی باتیں ضرور کرے گی؛ اس لیئے میں نے عامر کو اپنے ساتھ رکھ لیا۔ اب جب تک عامر میرے ساتھ ہے میں یہاں سے نہیں جاؤں گا۔"

منیزہ نے کہا" عامر کو میں اپنے پاس رکھ لوں گی تو یہاں سے چلا جا۔"

بہنوئی نے عامر کے سر پر ہاتھ رکھ دیا" اس کو تو اپنے پاس رکھے گی؟ عامر کو تو رکھے گی؟ خوب! کیا تجھ کو عامر کا کوئی خیال ہے؟ میرا خیال ہے نہیں، اور میں خود بھی عامر کو تیرے پاس نہیں چھوڑ سکتا۔"

منیزہ نے جواب دیا" اس کا فیصلہ بھی بہت جلد ہو جائے گا۔ ہارون کے آنے کی دیر ہے، پھر میں عامر کو جبراً اپنے پاس رکھ لوں گی۔"

بہنوئی نے اکڑ کر کہا" ہاں صرف اس صورت میں کہ خود عامر بھی تیرے پاس رہنے پر آمادہ ہو جائے۔"

منیزہ نے تن کر کہا" میں عامر کو تجھ سے زیادہ محبت دے سکتی ہوں۔ تجھ سے زیادہ اچھی طرح رکھ سکتی ہوں۔"

بہنوئی ہنس دیا، بولا" بیشک، بیشک، مجھ کو یقین ہے جو عورت عامر کی سلیپر بھی غائب کر دے اور ریشمی پارچے اڑا دے وہ واقعی بڑی محبت سے رکھ سکتی ہے۔"

منیزہ دنگ رہ گئی، کٹ سی گئی، گرم ہو کر بولی" بد اخلاق انسان! اس کا یہ مطلب ہوا کہ تو میرے خطوط پڑھ لیتا ہے۔ مجھ کو تو اس کا پہلے ہی شبہ تھا اور اسی لیے سلیپر اور ریشمی پارچوں کو دبا کر بیٹھ گئی تھی اور یہ دیکھنا چاہتی تھی کہ تو میرے خطوط پڑھتا ہے یا نہیں، چنانچہ آج اس کا انکشاف ہو گیا، بھانڈا پھوٹ گیا۔"

بہنوئی نے کہا" اب فضول باتیں نہ کر۔ جب تیری چوری پکڑی گئی تو اس قسم کی میٹھی میٹھی باتیں کرنے لگی۔"

منیزہ نے عامر سے پوچھا" عامر! سچ سچ بتا تو کس کے پاس رہنا گوارا کرے گا، میرے پاس یا اپنے پھوپا کے پاس؟"

عامر نے بغیر کسی پس و پیش کے جواب دیا" پھوپا کے پاس۔"

منیزہ نے غصے میں جھنجھلا کر پوچھا" یعنی میرے پاس نہیں؟"

عامر نے جواب دیا" ہاں آپ کے پاس نہیں۔"

منیزہ غصے میں کھڑی ہو گئی بولی" کوئی بھی میرا نہیں، میں کتنی احمق تھی جو اب تک تجھ کو اپنا بیٹا سمجھتی رہی۔"

عامر نے جواب دیا" آپ نے کبھی اپنا سمجھا ہو مجھے تو وہ مجھے یاد نہیں لیکن یہ باتیں اچھی طرح یاد ہیں اور زندگی بھر یاد رہیں گی کہ آپ نے مجھ سے حسد کرنا شروع کر دیا ہے اور مجھ میں ایک قسم کا احساس محرومی پیدا کر دیا ہے۔"

پھوپا کو اس کے جواب سے خوشی ہوئی اور وہ سارا دن مگن رہ کر گزار دیا۔ خوشی میں اس کو ہر چیز اچھی نظر آئی۔ منیزہ کو یہ کوفت کھائے جا رہی تھی کہ اگر عامر نہ ہوتا تو ہارون کا سب کچھ منیزہ اور ابراہیم کو ملتا لیکن اب یہ ناممکن تھا۔

منیزہ غصے میں اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی اور ہارون کا بہنوئی اور عامر دونوں اپنے گھر چلے آئے۔

* * *

بہنوئی نے از خود یہ فیصلہ کر لیا کہ وہ عامر کے ساتھ دمشق چلا جائے گا اور وہاں ہارون کے والد کی تیمارداری میں مشغول ہو جائے گا۔

اس کے اس منصوبے سے ہر شخص لاعلم ہی رہتا لیکن بہنوئی زیادہ گھبرا رہا تھا اس لیے اس نے ایک ایک کو اس کا راستہ روک روک کر بتانا شروع کر دیا۔ اس نے عامر کو دادا کی بیماری کی خبر دی اور کہا کہ ہم دونوں بلکہ میری بیوی کو بھی چند دنوں کے لیے دمشق چلا جانا ہے تاکہ تیرے بیمار دادا کی شاندار تیمارداری کی جا سکے۔

اس نے چپکے چپکے عامر کو منیزہ کی وہ ساری باتیں بتا دیں جو اس نے ہارون کے خط میں پڑھی تھیں۔ اس نے عامر سے کہا" عامر! تجھ کو منیزہ اور اس کے پاس موجود مال و زر سے بالکل مایوس ہو جانا چاہیئے کیونکہ اس حریص عورت کے پاس سے کچھ نکلوانا بڑا مشکل کام ہے۔"

لیکن عامر اپنے باپ کی طرف سے بہت فکرمند تھا، اس نے پوچھا" پھوپا جان! یہ خارجی کون ہیں؟"

پھوپا نے ہنس کر پوچھا "یہ یکایک تجھ کو خارجیوں کا کیا خیال آ گیا؟"

عامر نے جواب دیا "مجھ کو ان کا یوں خیال آ گیا کہ انہوں نے میرے باپ کو مارتے مارتے چھوڑ دیا اور میرے باپ نے آپ کے بقول ان کی بہادری کی تعریف کی ہے۔"

پھوپا معلوم نہیں کیا سوچ کر ایک دم اُچھل سا پڑا، بولا "بیٹے عامر! خارجیوں کی بابت بس تو یہ سمجھ لے کہ یہ ایماندار اور بہادر لوگ ہیں، اس روئے زمین پر اپنا ثانی نہیں رکھتے۔"

عامر نے حیرت سے پوچھا "کیا یہ لوگ اچھے ہوتے ہیں؟ آپ تو ان کی تعریفیں کر رہے ہیں۔"

پھوپا نے جواب دیا "ہاں میں ان کی تعریف کر رہا ہوں اور اس لئے تعریف کر رہا ہوں کہ وہ تعریف کے مستحق ہیں۔ تیرے باپ نے بھی اپنے خط میں ان کی بڑی تعریفیں کی ہیں۔"

عامر نے پوچھا "اگر وہ اتنے ہی اچھے ہیں تو حکومت ان سے جنگ کیوں کرتی ہے؟ میرا باپ ان کے خلاف ہتھیار کیوں اٹھاتا ہے؟"

پھوپا نے جواب دیا "ان میں کچھ برائیاں بھی ہیں، بس ان برائیوں کے خلاف جنگ کی جاتی ہے۔"

عامر نے کسی قدر تذبذب سے کہا "برائیاں کہاں نہیں ہیں، کس میں نہیں ہیں پھر جنگ سب سے کیوں نہیں لڑی جاتی؟"

پھوپا نے فاتحانہ شان سے کہا "تو ان باتوں پر مت غور کر، دمشق چلنے کی تیاری کر، ہم دونوں دمشق چل کر تیرے دادا کی تیمارداری کریں گے، اگر ہم نے ایسا نہ کیا تو منیزہ پہنچ جائے گی اور تیرے دادا کے سارے مال و زر پر قبضہ جما لے گی۔"

لیکن عامر کو مال و زر سے دلچسپی نہیں تھی، بولا "میں دمشق اس لیے تو چل سکتا ہوں کہ وہاں میرا دادا بیمار ہے اس کی تیمارداری کروں گا لیکن مال و زر کی ہوس لے کر ہرگز نہیں جاؤں گا۔"

پھوپا نے کہا "کسی طرح چل تو سہی۔ مال و زر کی ہوس نہ کر، مگر اس مال و زر کو غلط شخص کے پاس بھی مت جانے دے۔"

پھوپا نے اپنی بیوی کو بھی ساتھ لے لیا۔ جب یہ تینوں بالکل تیار ہو گئے تو اس نے منیزہ کو مطلع کر دیا، بولا "منیزہ! تو خوش ہو جا کہ میں تیری مرضی پوری کر رہا ہوں۔"

منیزہ نے پوچھا "میری مرضی؟ کون سی مرضی پوری کر رہا ہے؟"

اس نے جواب دیا "منیزہ! میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ اب یہاں نہ رہوں، بن دمشق جا رہا ہوں۔۔۔۔"

منیزہ نے بات کاٹ کر پوچھا "اور عامر؟ یہ عامر کہاں رہے گا؟ کس کے پاس رہے گا؟"

اس نے جواب دیا "افسوس کہ عامر تیرے پاس نہیں رہنا چاہتا، وہ بھی یرے ساتھ ہی جائے گا۔"

منیزہ نے کہا "تم دونوں نے یہ بہت اچھا فیصلہ کیا ہے۔ تم لوگ چلو چند نوں بعد میں بھی پہنچ رہی ہوں۔"

چنانچہ دو دن بعد یہ لوگ دمشق روانہ ہو گئے۔ عامر کو منیزہ سے جدائی کا را بھی ملال نہ تھا بلکہ وہ خوش تھا۔ کئی دن بعد یہ تینوں خوشگوار موسم میں دمشق پہنچے ضا ابر آلود تھی اور ہلکی ہلکی بوندا باندی ہو رہی تھی۔ پُرکیف ہوائیں جسم میں سرور ہر سی دوڑا رہی تھیں۔ شہر کے لوگوں نے ان تینوں کو ذرا غور سے دیکھ کر یہ اندازہ یا کہ یہ پریشان حال پردیسی کسی مقصد سے دمشق آتے ہیں۔ یہ تینوں پُرپیچ راستوں عبور کرتے ہوئے اس مکان کے دروازے پر جا کھڑے ہوئے جہاں عامر کا دادا اکیلا ڑا آخری سانسیں لے رہا تھا۔ یہ تینوں اندر داخل ہوئے تو قریب المرگ بوڑھے کے س پاس چند پڑوسیوں کو بیٹھے دیکھا۔ ان میں سے ایک نے پوچھا "تم لوگ کون ہو ر کہاں سے آئے ہو؟"

ہارون کے بہنوئی نے جواب دیا "میں اس بوڑھے کا داماد ہوں۔" پھر عامر کی ف اشارہ کیا "اور یہ لڑکا اس بوڑھے کا پوتا ہے۔"

پڑوسی اِدھر اُدھر کھسکنے لگے۔ عامر اپنے دادا پر جھک گیا اور بڑی محبت ے کہا "داداجان! میں عامر آ گیا، اب آپ کیسے ہیں؟"

دادا نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے عامر کی طرف دیکھا اور شاید پہچان نہ سکا۔

عامر نے ان کے دونوں شانے پکڑ لیے اور خود بھی ان کے سینے اور چہرے پر جھک گیا اور بولا "داداجان! مجھے آپ نے بلایا تھا، میں عامر آپ کا پوتا ہوں۔"

دادا نے بمشکل کہا۔ ”ہارون؟ کیا تو ہارون ہے؟“

عامر نے جواب دیا۔ ”نہیں، میں ہارون نہیں، میں ہارون کا بیٹا عامر ہوں۔“

دادا کی جاتی ہوئی سانس واپس آگئی۔ ایک بار پھر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ان تینوں کی طرف دیکھا اور بہنوئی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ ”تو تو ہے ہارون؟ تو مجھ سے اتنی دور کیوں کھڑا ہے؟“

عامر نے ایک بار پھر دادا کو سمجھانے کی کوشش کی۔ ”دادا جان! یہ پھوپھا جان ہیں، میرا باپ اور آپ کا بیٹا ہارون آنے ہی والا ہے، آپ فکر نہ کریں۔“

دادا کو رونا آگیا۔ ”مجھ کو سب نے چھوڑ دیا۔ عامر میرے سینے سے لگ جا تاکہ میں برسوں کے تنہا اور اداس دل کو سکون پہنچا لوں۔ مجھے سب نے مجھے اکیلا چھوڑ دیا، تنہا چھوڑ دیا۔“

عامر دادا کے سینے سے لگ گیا۔ عامر کے بوجھ نے دادا کی سانس میں فتور پیدا کر دیا جس سے وہ کھانسنے لگا۔ عامر سینے سے الگ ہو گیا اور ادب سے اس کے پاؤں دابنے لگا۔

دادا کو کسی کسی لمحہ ہوش آجاتا لیکن یہ ہوش بھی مدہوشی سے کم نہیں تھا۔ مال و زر کا اس دنیا میں جو مقام ہے بوڑھا شخص مدہوشی میں بھی اس کی قدر و قیمت کا بالکل صحیح شعور رکھتا تھا۔ دادا کی سانسیں کئی بار اکھڑ اکھڑ کر واپس آئیں اور ہر بار یہی شبہ گزرا کہ آئندہ چند لمحے موت اور زندگی کے لیے فیصلہ کن ثابت ہوں گے لیکن بڑے میاں نے نوبانوں تک سے توانائی ظاہر کرنے کی کوشش کی اور اسی کوشش میں مشغول تھے کہ ان کی ناسازیٔ طبع کا خاص اثر نہ لیا جائے وہ عنقریب ادھر ادھر ہونے والے تھے۔

* * *

شام سے ذرا پہلے دادا کی حالت پھر بگڑ گئی اور بہکی بہکی باتیں کرنے لگے۔ عامر نے کہا۔ ”دادا جان! ہوش میں آئیے، پریشان مت ہوئیے۔“

لیکن دادا کی آنکھیں پھٹ چکی تھیں، انہوں نے نہ تو کسی کی باتیں سنیں اور نہ ہی کوئی اور ان کی باتیں سمجھ سکا۔ عامر اور اس کا پھوپھا بوڑھے کے پاس بیٹھے اس کے انجام کے منتظر تھے۔ بوڑھا مدہوشی میں بار بار ہارون کا نام لے رہا تھا اور بار

بار یہی کہہ رہا تھا کہ ”ہارون! تو نے عامر پر ظلم کیا ہے، زیادتی کی ہے۔“

عامر کے دل پر آرے چل رہے تھے۔ دادا نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے خلا میں گھورا اور مرحوم بیٹے کو آوازیں دیتے ہوئے ڈوبتے چلے گئے۔ عامر نے آواز دی۔ ”دادا جان! ہوش میں آئیے۔“

انہوں نے بے رونق اور نہ پہچان سکنے والی نظروں سے عامر کو دیکھ کر پوچھا۔ ”تو کون ہے؟ یہاں کیوں آیا ہے؟“

عامر نے جواب دیا۔ ”دادا جان! میں ہوں عامر آپ کا پوتا۔ مجھے پہچاننے کی کوشش کیجیے۔“

لیکن دادا نہیں پہچان سکا، اس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے اس نے نزع کے عالم میں کہا۔ ”میرے پاس جو کچھ ہے، عامر کا ہے، عامر کو بلاؤ تاکہ میں یہ سب اس کے حوالے کر دوں۔“

داماد نے سسر کو آواز دی۔ ”جناب! یہ عامر آپ کے پاس ہی موجود ہے، پہچانیے تو۔“

لیکن دادا پہچانے بغیر ہی رخصت ہو گیا۔ عامر دادا کے پائنتی پاؤں پر جھک گیا۔ انہیں کئی بوسے دیئے اور اپنے پھوپھا کے ساتھ آخری رسوم کی ادائیگی کی تیاریاں کرنے لگا، لیکن تدفین سے پہلے ہی ہارون اور منیزہ بھی پہنچ گئے، ہارون باپ کی میت پر خوب خوب رویا لیکن منیزہ نے سکھ کی سانس لی کہ اس کی راہ کا سب سے بڑا پتھر ہمیشہ کے لیے ہٹ چکا تھا۔

تمام رسوم سے فارغ ہونے کے بعد ہارون نے فیصلہ کیا کہ اب وہ دمشق میں نہیں رہے گا اور سامان اور مال و زر کو قابو میں لے کر اور مکان کو بیچ کر ہمیشہ کے لیے حمص چلا جائے گا لیکن بہنوئی نے اس کی مخالفت کی اور کہا۔ ”ہارون! یہ مکان نہیں بکے گا اور اس گھر میں جو کچھ بھی ہے، تیرے باپ کی آخری وصیت اور خواہش کے مطابق عامر کا ہے۔“

ہارون اپنے بہنوئی کی باتیں سمجھنے سے قاصر تھا۔ منیزہ بھی اس کے پاس ہی کھڑی ان دونوں کی باتیں سن رہی تھی۔ ہارون نے پوچھا۔ ”آخر اس کا مطلب [illegible] میرے باپ کی آخری وصیت اور خواہش کے مطابق یہاں جو کچھ بھی ہے عامر کا ہے اس کا مطلب؟“

بہنوئی نے جواب دیا۔ "میں نے مرنے سے چند لمحے پہلے خود سنا ہے کہ مرحوم نے اپنے مال و زر اور مکان کا مالک عامر کو قرار دیا ہے اس لیے اب یہاں کی ہر شے عامر کی ہے۔"

منیزہ نے کہا۔ "جب تک ہم میں ہارون موجود ہے ہارون کے مرحوم باپ کی چیزوں کا کوئی بھی وارث نہیں ہو سکتا اور پھر عامر کے ساتھ ہی ابراہیم بھی تو مرحوم کا پوتا ہے۔"

لیکن ہارون نے منیزہ کو سمجھایا۔ "منیزہ! تجھ کو نہیں الجھنا چاہیئے، میں خود بات کر لوں گا۔"

بہنوئی نے ہارون کو الگ لے جا کر سمجھایا۔ "ہارون! تو اس معاملے پر خاموشی اختیار کر، جیسا میں کہتا ہوں اس کو اسی طرح رہنے دے کیونکہ آئندہ اختلاف کی خلیج وسیع تو ہو جائے گی مگر پٹے گی نہیں، اس لیے عامر کو جو کچھ مل رہا ہے اس کے پاس ہی رہنے دے۔"

لیکن ہارون نے اس کی بات نہیں مانی۔ "بھائی! ایسی باتیں نہ کرو۔ عامر میرا بیٹا ہے، جب تک میں زندہ ہوں، تمام چیزیں میرے قبضہ میں رہیں گی اور عامر کو ان پر یوں تصرف رہے گا جس طرح مجھ کو حاصل ہے۔"

بہنوئی نے افسوسناک لہجے میں پوچھا۔ "تو کیا تو عامر کو ان چیزوں اور مکان سے محروم کر دے گا؟"

ہارون نے جواب دیا۔ "میں مکان بیچ دوں گا اور سارا مال و زر لے کر حمص چلا جاؤں گا۔ عامر اگر تیرے پاس رہا تو خیر، ورنہ میں اسے بھی اپنے ہی پاس رکھوں گا۔"

بہنوئی نے سکوت اختیار کر لیا۔ عامر کے دل میں نفرتیں جمع ہو رہی تھیں۔ اپنے باپ کے خلاف اور دنیا کے خلاف۔

چند دنوں بعد مکان بھی بک گیا اور سارا سامان سمیٹ کر ہارون حمص روانہ ہو گیا۔ ساتھ میں عامر اور اس کا پھوپھا بھی تھا۔ منیزہ بہت خوش تھی، اب اس کی بڑی جیت تھی۔ حمص میں داخل ہوتے ہی منیزہ نے ہارون کو سمجھایا۔ "ہارون! اگر تو چاہتا ہے کہ یہ مختصر سا کنبہ خوش و خرم اور نہال رہے تو تو اپنے بہنوئی کو یہاں سے چلتا کر دے۔"

ہارون نے دو ٹوک جواب دیا۔ "میں ایسا نہیں کر سکتا۔"

منیزہ نے پوچھا۔ "تیری بہن مر چکی ہے، اس کی کوئی اولاد بھی نہیں اب تیرا اس شخص سے رشتہ ہی کہاں رہا۔"

ہارون نے جواب دیا۔ "منیزہ! بات اور حالات سمجھنے کی کوشش کر۔ یہ میرا بہنوئی تھا اور ہمیشہ، جب تک زندہ ہے میرا بہنوئی رہے گا۔ اس نے میرے عامر کو بڑی محبت سے رکھا ہے۔"

منیزہ نے کہا۔ "تو اس کو یہاں سے چلتا کر دے، عامر کو میں اپنے پاس رکھوں گی کیونکہ لوگ باتیں بناتے ہیں اور اب میں زیادہ باتیں نہیں سنوں گی۔"

ہارون نے جواب دیا۔ "لیکن میں بہنوئی سے اس قسم کی باتیں نہیں کر سکتا۔ وہ یہیں میرے پاس ہی رہے گا اور میں عامر کو بھی اس سے نہیں لے سکتا۔"

منیزہ لاجواب ہو کر خاموش ہو گئی، لیکن اس کے تیور بتاتے تھے کہ وہ مایوس نہیں ہوئی۔

❊ ❊ ❊

ہارون حمص میں کئی بار آیا اور گیا، لیکن ابھی تک اس نے حمص کو اچھی طرح دیکھا نہیں تھا۔ اب باپ کی موت کے بعد جب وہ خود کو ہلکا اور آزاد محسوس کرنے لگا تو تفریحات کی سوجھی۔ وہ منیزہ اور ابراہیم کو ساتھ لے کر گھومنے نکلا تو عامر کا خیال آ گیا، منیزہ سے کہا۔ "منیزہ! میرا خیال ہے عامر کو بھی لے لیا جائے؟"

لیکن منیزہ نے مخالفت کی، بولی۔ "عامر اب بچہ نہیں ہے وہ ہمارے ساتھ کہاں جائے گا، ابراہیم تو بچہ ہے گود میں رہے گا۔ یہ بھی اگر عامر ہی جتنا ہوتا تو میں اسے بھی اپنے ساتھ نہ لے جاتی۔"

ہارون چپ ہو گیا، لیکن بہنوئی ان دونوں کے سامنے آ گیا اور پوچھا۔ "تم لوگ کہاں جا رہے ہو؟"

منیزہ نے جواب دیا۔ "میں ہارون کو حمص کی خاص خاص چیزیں دکھانا چاہتی ہوں۔"

بہنوئی نے کہا۔ "منیزہ! میں تجھ سے تو کوئی بات کروں گا نہیں، ہاں ہارون سے یہ البتہ کہنا ہے کہ اپنے ساتھ عامر کو بھی لیتا جا۔"

عامر بہنوئی کے پیچھے کھڑا تھا۔ ہارون نے عامر کو دیکھنا چاہا، لیکن بہنوئی کے

آتا ہے۔ اگر عامر کو کسی اور وقت لے آتا تو تیرا کیا بگڑ جاتا؟"

بہنوئی نے جواب دیا۔ "میں کسی اور وقت کیوں لاتا تم دونوں نے اس کو مارا تھا لیکن میں اس کا آزردہ اور افسردہ چہرہ نہیں دیکھ سکا اور اس کو یہاں لے آیا۔ کیا تجھ کو عامر کا آنا پسند نہیں؟"

منیزہ نے جواب دیا۔ "نہیں، یہ بات نہیں ہے میں تو ہارون سے یہ کہہ رہی تھی کہ دیکھ لیا تو نے، میں جو تجھ سے کہہ رہی تھی کہ عامر ہماری توجہ کا قطعاً بھوکا ہے اس کے پھوپھا نے اس کو وہ آرام پہنچایا ہے کہ اب عامر کو ہماری فکر ہی نہیں رہی۔"

بہنوئی نے ابراہیم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "ابراہیم کو ذرا بڑا ہو لینے دو، اس کو بھی اپنے قابو میں نہ کیا تو میرا نام نہیں۔"

بہنوئی نے عامر کے ہاتھ سے بھی مورتی کے پاؤں کے پاس سے اٹھائی ہوئی مورتی کے قدموں میں ڈال دی۔

اب یہ چاروں ایک ساتھ چل پھر رہے تھے۔ ہارون نے ازراہِ مذاق کہا۔ "بھائی تم نے تو عامر کو پوری طرح قابو میں لے لیا۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ آگے چل کر تو شاید مجھے پہچانے بھی نہ۔"

بہنوئی نے جواب دیا۔ "ابھی تو نے دیکھا ہی کیا ہے؟"

ہارون نے حیرت سے پوچھا۔ "کیا ابھی کچھ اور دیکھنا بھی باقی ہے؟"

بہنوئی نے جواب دیا۔ "ہاں میں اس کو اس لائق کر دوں گا کہ یہ تلوار سونت کر تیرے مقابلے میں آ جائے گا۔"

ہارون نے ہنس کر کہا۔ "تو گویا تو اس کو گستاخ کر دے گا۔" پھر عامر سے پوچھا۔ "بیٹے! کیا تو تلوار سونت کر میرے مقابلے پر آ سکتا ہے؟"

عامر نے شرما کر جواب دیا۔ "نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔"

لیکن منیزہ نے دبی آواز میں کہا۔ "نہیں، ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ اس دنیا میں بات ممکن ہے۔"

عامر منیزہ کی باتوں سے عاجز آ چکا تھا۔ بولا کچھ بھی نہیں، مگر منیزہ کے خلاف نفرتوں میں کچھ اور اضافہ ہو گیا۔

★ ★ ★

عامر جس ماحول میں جوان ہو رہا تھا اس کا ہر فرد خود غرض اور چالاک تھا۔ ہاں پھوپھا نے محبتیں دی تھیں۔ پھوپی بھی اچھی طرح پیش آتی رہی لیکن وہ ان دونوں کی محبتوں کو بھی شک و شبے سے دیکھتا تھا کیونکہ جب تک منیزہ کا اپنا کوئی بچہ نہیں تھا، وہ بھی عامر کو اسی طرح چاہتی تھی لیکن جب ابراہیم پیدا ہو گیا تو منیزہ کی محبت میں کمی آ گئی اور آہستہ آہستہ محبت کی جگہ حسد اور رقابت نے لے لی۔ اب اس کو کسی پر بھی اعتبار نہیں تھا یہاں تک کہ اپنے باپ پر بھی۔ کیونکہ باپ کے تغافل اور بے نیازی نے اس کو بڑے دکھ پہنچائے تھے۔ بظاہر ہارون کی محبت میں کوئی کمی نہیں محسوس ہوئی تھی لیکن جب کبھی کوئی ایسا موقع آیا جہاں ایک طرف منیزہ ہوتی اور دوسری طرف عامر تو عموماً فیصلہ وہی ہوتا جو منیزہ چاہتی۔ اس کا باپ منیزہ کی طرف جھک جاتا۔ اس طرح دنیا کے تمام رشتے اپنا اعتبار کھو چکے تھے۔ اب ابراہیم بھی بڑا ہو چکا تھا۔ ابراہیم اور عامر میں بارہا کشمکش ہوتی اور ابراہیم کی جیت ہوتی، کیونکہ منیزہ ہمیشہ ابراہیم ہی کی طرف ہوتی۔ زمانے کے دستور کے مطابق عامر فنِ سپاہ گری بڑی محنت سے حاصل کرتا رہا۔ یہ بالکل اتفاق کی بات تھی کہ ابراہیم اپنے بڑے بھائی عامر کا بڑا احترام کرتا تھا۔ اس کا حق پسند دل عامر کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں پر کڑھتا رہتا۔ ہارون اس سے بہت خوش ہوتا اور جب تب تنہائی میں ابراہیم کو یہی سمجھاتا رہتا کہ "ابراہیم! تیرے بڑے بھائی عامر پر بڑے ظلم ہوتے ہیں، لیکن تو اپنے بڑے بھائی کا خاص خیال رکھ اور زندگی بھر اس کا ادب کرتا رہ۔"

ابراہیم نے کوئی جواب نہیں دیا لیکن باپ کی باتوں کو گرہ میں باندھ لیا۔

ہارون اور بہنوئی دونوں ہی اپنی اپنی زندگی کے انحطاطی دور میں داخل ہو چکے تھے۔ ہارون اپنے بہنوئی کا بہت شکر گزار تھا لیکن بہنوئی کا دل صاف نہیں تھا۔ اس کا وہ زخم ابھی تک ہرا تھا کہ عین اس وقت جبکہ وہ دولہا بنا بیٹھا تھا اور منیزہ اس کی دلہن بن جانے والی تھی، ہارون نے بروقت حاضر ہو کر سارا کھیل بگاڑ دیا تھا۔ وہ ہارون سے اکثر ہنسی ہنسی میں کہہ دیا کرتا کہ "ہارون تو نے مجھے جس طرح ذلیل و خوار کیا تھا، میں اسے زندگی بھر نہیں بھولوں گا۔"

ہارون ہنس کر کہہ دیا کرتا۔ "بھائی! جو کچھ ہو گیا، ہو گیا، اب اس کا بار بار ذکر کیوں؟ میں معافی چاہتا ہوں۔"

لیکن بہنوئی بات کو ہنسی میں اڑا دیتا۔ ہارون حیران تھا کہ ایک طرف تو اس کا بہنوئی اس کا اتنا شاکی ہے کہ برسوں پرانی بات کا زخم یوں دکھا دیتا ہے گویا تازہ تازہ

ہارون نے سختی سے کہا۔"منیزہ! میں نے آج تک تجھ کو حکم نہیں دیا لیکن اب میں تجھے حکم دیتا ہوں کہ تو میرے ساتھ چل اور عامر کی ہونے والی دلہن کو دیکھ کر دیانت داری سے بتا کہ یہ عامر کے لئے کیسی رہے گی؟"

منیزہ نے بھی بڑی لاپرواہی سے جواب دیا۔"میں اپنے بیٹے ابراہیم کے لیے تو بھاگ دوڑ کر سکتی ہوں لیکن عامر کے لیے یہ سب کیوں کروں؟"

ہارون نے ایک بار پھر حکماً کہا۔"منیزہ! میں تجھے حکم دیتا ہوں، اگر تو نے میرا حکم نہ مانا تو میں تجھے طلاق دے دوں گا۔"

منیزہ کے باپ نے مداخلت کی، منیزہ کو سمجھایا۔"منیزہ! تجھے اپنے شوہر کا حکم ماننا چاہیے۔ آخر عامر بھی تو ہارون ہی کا بیٹا ہے۔"

منیزہ بے بس ہو گئی اور بادلِ نخواستہ ہارون اور اس کے بہنوئی کے ساتھ لڑکی کے گھر پہنچ گئی۔ لڑکی کا نام رابعہ تھا اور وہ اپنی شکل و صورت سے حور لگتی تھی۔ بڑی بڑی پلکوں کے سائے میں بڑی بڑی بادام جیسی آنکھیں، دلِ متوازن اور متناسب جسم پر میدہ شہابی رنگ سرتاپا کیف میں ڈوبی ہوئی کہ جو دیکھے اس پر نشہ چڑھ جاتے۔ باتوں میں سلیقہ اور آواز میں موسیقی کی کھنک، منیزہ کو یہ لڑکی بہت پسند آئی۔ رابعہ کے گھر والوں نے ان سب کی بڑی تواضع کی۔ منیزہ نے لڑکی کی ماں سے پوچھا۔"محترم خاتون! کیا تم عامر کو دیکھا ہے جس کو اتنی اچھی لڑکی سونپ دینا چاہتی ہو؟"

لڑکی کی ماں نے جواب دیا۔"نہیں، میں نے لڑکا تو ابھی تک نہیں دیکھا لیکن بھائی ہارون کو ایک عرصے سے جانتی ہوں۔ ظاہر ہے ہارون کا بیٹا بھی ہارون جیسا ہی ہو گا۔"

منیزہ نے کہا۔"افسوس کہ یہاں یہ صورتِ حال ہرگز نہیں۔ اگر تم میرا کہنا مانو تو عامر کے چھوٹے بھائی ابراہیم سے اس کا رشتہ کر دو۔ اللہ نے چاہا تو بڑے سکھ سے رہے گی۔"

لڑکی والوں نے بھی معاملہ کی اہمیت اور نزاکت کو اچھی طرح سمجھ لیا تھا۔

لڑکی کی ماں نے پوچھا۔"کیا عامر اچھا لڑکا نہیں ہے؟"

منیزہ نے جواب دیا۔"عامر میرا بیٹا نہیں ہے اس لیے میں اس کی ضامن بھی نہیں بن سکتی اور پھر یہ کہ عامر میرے پاس رہا بھی نہیں، وہ ہمیشہ دور دور رہا ہے۔"

رابعہ کی ماں نے پوچھا۔"اگر ایسی بات تھی تو عامر کی طرف سے میری لڑکی کو دیکھنے کیوں آئی تھیں؟"

منیزہ نے جواب دیا۔"میں لڑکی کو دیکھنے نہیں لڑکی کے گھر والوں کو سب کچھ بتانے آگئی تھی۔"

لڑکی کے گھر والوں نے ابراہیم کا رشتہ قبول کر لیا اور رابعہ کے بڑوں نے باہر یہ اعلان کیا کہ"رابعہ کو ابراہیم کے لئے پسند کر لیا گیا ہے اور وہ اپنی بیٹی کو کسی ایسے لڑکے سے ہرگز منسوب نہ کریں گے جو اپنے باپ سے دور پھوپا کے گھر پلا بڑھا ہو، وہ یقیناً گستاخ اور منہ پھٹ الھڑ لڑکا ہو گا۔"

اس غیر متوقع اعلان نے ہر کسی کو چونکا دیا۔ بہنوئی نے حیرت سے کہا۔"یہ کیا بات ہوئی، یہاں ابراہیم کا رشتہ لے کر کون آیا تھا؟"

ہارون نے جواب دیا۔"بھائی! میں سب کچھ سمجھ گیا۔"

یہ سب نڈھال اور افسردہ جب اپنے گھر میں داخل ہوئے تو ان سے بولا نہیں جا رہا تھا۔ پھپا منہ لٹکائے ہوئے اپنے کمرے میں چلا گیا۔ منیزہ کسی کی پرواہ کیے بغیر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ عامر ہکا بکا معاملے کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ اپنی زبان سے کوئی سوال بھی نہیں کر رہا تھا۔ دوسری طرف عامر کا باپ ہارون منیزہ سے برہم تھا۔ وہ بھی منیزہ کے پیچھے ہی اندر داخل ہو گیا۔ منیزہ بے حد خوش تھی وہ اپنا لباس بدل رہی تھی۔ اس نے آئینے میں اپنے پیچھے ہارون کو دیکھ لیا اور فوراً گھوم گئی۔ بولی۔"ہارون! خیریت تو ہے؟"

ہارون نے پھیکی مسکراہٹ سے جواب دیا۔"منیزہ! یہ کیا ہو گیا؟"

منیزہ نے پوچھا۔"کیا ہو گیا، میں نہیں جانتی کہ تو کیا جاننا چاہتا ہے۔"

ہارون نے کہا۔"ہم لوگ عامر کے رشتے کی بات کرنے گئے تھے۔"

منیزہ نے جواب دیا۔"بے شک! لیکن وہ لوگ عامر کے بجائے ابراہیم کو پسند کرنے لگے۔"

ہارون نے افسوس سے کہا۔"وہ خود عامر کے بجائے ابراہیم کو نہیں پسند کرنے لگے بلکہ تو نے انہیں اس پر آمادہ کیا ہے، کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟"

منیزہ نے ناگن کی طرح مڑ کر جواب دیا۔"انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ کیا میں عامر کی ضامن بن رہی ہوں، میں نے صاف صاف کہہ دیا کہ جو بچہ میرے پاس نہ رہا ہو اسے

میں نے نہ پالا پوسا ہو اور جو اپنے ماں باپ سے دور پھوپھا کے پاس رہا ہو، میں اس کی ضامن کس طرح بن سکتی ہوں۔"

ہارون نے تلملا کر ٹہلنا شروع کر دیا۔ "تو نے غلط بیانی کی ہے، عامر ہم سے دور کبھی بھی نہیں رہا، اس کا پھوپھا بھی ہمارے ساتھ ہی رہ رہا ہے اور پھر تو عامر کی ضامن نہ بن، میں تو ضامن بن سکتا ہوں۔"

منیزہ نے آہستگی سے کہا۔ "لیکن اب تو میں ابراہیم کی بات کر بھی آئی۔ عامر کی عمر زیادہ ہے جبکہ ابراہیم اس کے لئے بالکل موزوں ہے۔"

ہارون نے سختی سے کہا۔ "لیکن میں کہتا ہوں کہ یہ رشتہ عامر ہی سے ہوگا ابراہیم سے کبھی نہیں۔"

منیزہ نے تیوریاں چڑھا لیں۔ "ہارون! میں نے کبھی کسی معاملے میں ضد نہیں کی لیکن جب میں نے ابراہیم کے لئے زبان دے دی ہے تو یہ رشتہ ابراہیم سے ہی ہو کر رہے گا۔"

ہارون چیخ پڑا۔ "میں ایک عرصے سے تیری زیادتیاں دیکھ رہا ہوں۔ تو نے عامر پر جو ظلم کیے، میں خاموشی سے برداشت کرتا رہا ہوں لیکن اب تو ان زیادتیوں سے باز آجا، ابراہیم اور عامر میں نفرتوں کی خلیج نہ پیدا کر، کیونکہ ہم دونوں کے بعد انہیں مل کر زندگیاں گزارنی ہیں، اگر ان میں نفرتیں پیدا ہو گئیں تو یہ زندگی بھر آپس ہی میں لڑتے جھگڑتے رہیں گے۔"

منیزہ اپنے فیصلے پر قائم رہی، بولی۔ "ہارون! تو میری عادت سے واقف ہے، میں نے ایک بار جو فیصلہ کر لیا، کر لیا۔ میں فیصلے بدلنے کی قائل ہی نہیں۔ بہت عرصہ پہلے جب میں نے تجھ سے شادی کرنے کا فیصلہ کیا تھا تو اسے لوگوں کی مخالفت کی پرواہ کیے بغیر پورا کیا۔ پھر جب تم لوگوں نے سازش کے ذریعے مجھے بے اولاد رکھنا چاہا اور میں نے یہ فیصلہ کر لیا کہ میں اپنے بچے کی ماں بن کر رہوں گی تو میں اپنا مقصد حاصل کر کے رہی، اور اب میں نے یہ قطعی فیصلہ کر لیا ہے کہ رابعہ کی شادی ابراہیم سے ہوگی تو یہ شادی ابراہیم ہی سے ہو کر رہے گی۔"

ہارون نے بڑی بے بسی سے کہا۔ "میں چاہتا ہوں کہ گزشتہ تلخیوں کو بھلا دیا جائے اور خوشگوار ماحول پیدا کیا جائے۔"

منیزہ نے جواب دیا۔ "تو اس کے لیے بہترین طریقہ یہ ہوگا کہ رابعہ سے ابراہیم

کی شادی کر دی جائے۔"

ہارون نے خوب اچھی طرح محسوس کر لیا کہ منیزہ کسی طرح بھی اپنا فیصلہ نہیں بدلے گی تو اس نے ایک دوسری ترکیب پر عمل کرنا شروع کیا۔ وہ ابراہیم کو گھر سے دور انگور کی بیلوں کے سائے میں لے گیا اور پوچھا۔ "ابراہیم! سچ بتا عامر تجھے کیسا لگتا ہے؟"

ابراہیم نے جواب دیا۔ "بھائی عامر بہت اچھے ہیں، مجھے بہت اچھے لگتے ہیں۔"

ہارون اس جواب سے بہت خوش ہوا، بولا۔ "بیٹے! میں تیری ماں کی مخالفت نہیں کر رہا، لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ دانستگی یا نادانستگی میں تیری ماں نے عامر پر ظلم کیے ہیں زیادتی کی ہے۔"

ابراہیم کے چہرے پر افسوس اور ندامت کے اثرات پلٹتے جاتے تھے، بولا۔ "لیکن وہ میری ماں ہے میں اس کی مخالفت نہیں کر سکتا۔"

ہارون نے خوشامدانہ کہا۔ "میں یہ نہیں کہتا کہ تو اپنی ماں کی مخالفت کر، بلکہ میں یہ چاہتا ہوں کہ تو اس شادی سے انکار کر دے۔"

ابراہیم نے سر جھکاتے ہی جھکاتے جواب دیا۔ "میں نے شادی پر آمادگی ہی کب ظاہر کی تھی، مجھے بھائی عامر سے ہمدردی ہے۔"

ہارون نے بے اختیار ابراہیم کو اپنے سینے سے لگا لیا۔ "جزاک اللہ میرے بچے! تو کتنا نیک اور صالح ہے۔"

عامر کا پھوپھا منیزہ کی حرکت سے اتنا بدظن اور دل برداشتہ تھا کہ وہ منیزہ کے خلاف کسی خطرناک سازش کا منصوبہ تیار کرنے کی فکر میں تھا اس عورت کے خلاف کوئی ایسا شاندار مگر خطرناک منصوبہ بنایا جائے کہ منیزہ کو بس مزہ ہی آجائے۔ اس نے کئی راتیں یوں بے چینی میں گزاری ہیں اور منیزہ کے خلاف ہی سوچتا رہا۔ اس دوران عامر بھی کچھ کم فکرمند نہیں تھا وہ بھی معلوم نہیں کیا کچھ سوچتا رہا۔ پھر وہ گھر سے کافی کافی دیر تک غائب رہنے لگا اور آخر یہاں تک نوبت پہنچ گئی کہ وہ سارا سارا دن غائب رہتا۔ ہارون اور اس کا بہنوئی دونوں ہی عامر کی ان حرکتوں سے پریشان تھے مگر عامر کے چہرے پر سرکشی کے آثار دیکھ کر دونوں ہی خاموش رہنے پر مجبور ہو گئے تھے۔

ایک دن علی الصبح عامر باہر جانے لگا تو اس کے پھوپھا نے اس کو روک لیا، پوچھا۔ "تو کہاں جا رہا ہے؟"

عامر نے جواب دیا۔ "میں شام تک واپس آجاؤں گا۔"

پھوپا نے کہا۔ "تو آج کہیں نہ جا، کیونکہ میں منیزہ اور تیری چپقلش میں مستقبل کے ہنگامے دیکھ رہا ہوں۔ اس خاموش ماحول کی مثال اس راکھ جیسی ہے جس کے اندر چنگاریاں چھپی ہوں اور جو کسی بھی وقت آگ میں بدل جانے کو تیار ہوں۔"

عامر نے جواب دیا۔ "پھوپا جان! میں خود کو اس ماحول میں غیر اور اجنبی محسوس کرتا ہوں اس لیے میں یہاں سے چلا جانا چاہتا ہوں۔"

پھوپا نے رائے دی۔ "میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ تیرے باپ کو مال و زر کی تقسیم پر آمادہ کر لوں کیونکہ میں نے منیزہ کی فطرت اچھی طرح سمجھ لی ہے۔ ہارون کی عدم موجودگی میں یہ تجھ کو تیرے حق سے بھی محروم کر دے گی۔"

عامر نے جواب دیا۔ "میں مال و زر کو مصیبت سمجھتا ہوں، اس لیے میرے باپ کا مال و زر اس کو مبارک، مجھے اس میں سے کچھ بھی نہیں چاہیئے۔"

پھوپا بگڑ کر کھڑا ہو گیا۔ "یعنی اب تو میری بات بھی نہیں مانے گا، مال و زر مصیبت نہیں کاسا آمد ہے۔ میں تجھ کو یوں منفی انداز فکر پر قائم نہیں رہنے دوں گا۔"

لیکن عامر نہیں رکا اور چلا گیا۔ اس کا پھوپا سارا دن ہارون سے لڑتا جھگڑتا رہا کہ وہ اپنی زندگی ہی میں عامر کا حصہ الگ کر دے لیکن ہارون اس پر کیوں تیار نہ ہوتا تھا کہ وہ پہلے عامر کی شادی کرنا چاہتا تھا اس کے بعد اس کو الگ کر کے خود اس کے ساتھ رہنے کا منصوبہ بنا لیا تھا۔

لیکن پھوپا نے اصرار کیا۔ "نہیں، پہلے تقسیم بعد میں شادی اور آخر میں اس کے ساتھ رہائش۔"

کسی طرح منیزہ کو بھی اس بحث مباحثے کا علم ہو گیا۔ اس نے دونوں کو ڈانٹ دیا اور بولی۔ "جب تک میں موجود ہوں ایسا نہیں ہوگا۔ مال و زر نہیں تقسیم ہوگا۔ عامر شادی کرے گا تو وہ ساتھ رہے یا الگ، میں اپنے پاس سے اسے کچھ بھی نہ دوں گی، کیونکہ مجھے اپنے ابراہیم کی فکر ہے۔"

لیکن ابراہیم نے صاف صاف کہہ دیا کہ "ماں جس مال و زر کی طمع میں آپ میرا سہارا لے کر بھائی عامر کو ان کے حق سے محروم کرنا چاہتی ہیں میں اس میں آپ کا ساتھ نہیں دوں گا۔"

منیزہ نے ڈانٹ دیا۔ "تو چپ رہ نادان لڑکے، تیری بہتری کو جتنا بہتر میں سوچ سکتی ہوں کوئی اور نہیں سوچ سکتا۔ تیری ماں نے اس موجودہ مال و زر کو بڑی کوشش اور محنت سے محفوظ رکھا ہے اگر میں ایسا نہ کرتی تو آج اس گھر میں خاک اُڑ رہی ہوتی اور کسی کو بھی حق، حصے کی باتوں کا موقع نہ ملتا۔"

ہارون نے اپنے بہنوئی کو مخاطب کیا۔ "بھائی! تم عامر سے کہہ دو کہ میں اس کو اس کا حصہ ابھی سے دے دینا چاہتا ہوں اور اس راہ میں حائل ہونے والی ہر دیوار کو میں گرا دوں گا۔" پھر منیزہ سے کہا۔ "اور منیزہ! تو بھی اچھی طرح میری بات ذہن نشین کر لے اگر تو نے اس معاملے میں میری مخالفت کی تو میں پھر بھی وہی کروں گا، جس کا میں نے فیصلہ کر لیا ہے اور تیری ضد کے پیش نظر یہ بھی ممکن ہے کہ میں تجھ سے ہمیشہ کے لیے کنارہ کشی اختیار کر لوں۔"

منیزہ نے بھی سختی سے جواب دیا۔ "ہارون! میں اپنے مال و زر کے حصے بخرے ہرگز نہیں ہونے دوں گی۔ اگر تو اس بہانے سے مجھ سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتا ہے تو میں اس کے لیے بھی تیار ہوں کیونکہ یہ میری انا کی بات ہے، اور میں اپنی اور اپنے بیٹے ابراہیم کی نظر میں حقیر ہو جانا کسی قیمت پر بھی گوارا نہ کروں گی۔"

لیکن ہارون اپنی ضد پر اڑا رہا۔ اس نے اپنے بہنوئی سے کہا۔ "بھائی! عامر کو بلاؤ کہ یہ قضیہ ابھی اور اسی وقت چکا دیا جائے۔"

بہنوئی نے جواب دیا۔ "عامر گھر میں موجود نہیں ہے، امید ہے شام تک واپس آئے گا تبھی یہ قضیہ بھی چکا دیا جائے گا۔"

منیزہ نے اپنے بیٹے ابراہیم کا ہاتھ پکڑا اور وہاں سے یہ کہتی ہوئی چلی گئی۔ "مجھ پہلے ہی سے یہ معلوم تھا کہ ہارون کو ورغلایا جا رہا ہے مگر مجھے کوئی پرواہ نہیں۔ میں ہر ایک سے نمٹ لوں گی۔"

ہارون اور اس کے بہنوئی نے بھی بحث ختم کر دی اور دونوں ہی عامر کی واپسی کا انتظار کرنے لگے۔

شام ہو گئی مگر عامر نہیں آیا، رات ہوئی مگر عامر کا کوئی پتہ نہ تھا۔ پھر نصف رات ہو گئی۔ پھوپا کم مگر ہارون زیادہ فکر مند ہوا۔ دوسری صبح نمودار ہوئی مگر عامر کا کہیں پتہ نہ تھا۔ ہارون تلملایا تلملایا اِدھر اُدھر پھرتا رہا وہ عامر کی تلاش میں اپنا گھوڑا دوڑاتا رہا۔ منیزہ بہت خوش تھی کہ ایک کانٹا جو اس کے دل میں مستقلاً چبھ

رہا تھا اب دور ہو چکا تھا۔ وہ ہارون اور اس کے بہنوئی کی پریشانیوں سے بہت
ہو رہی تھی۔

ایک دن، دو دن، چار دن، ہفتہ، کئی ہفتے، مہینہ، دو مہینے پھر چھ
گئے مگر عامر کا کہیں پتہ نہ چلا۔ ہارون کا اضطراب بڑھتا رہا۔ اس کو غم نے نڈھال
پژمردہ کر دیا۔ پھوپا بھی پریشان تھا مگر نسبتاً کم۔ اب ہارون کم گو ہو گیا تھا۔ بار
کے غم کو دیکھ کر ابراہیم عامر کی تلاش میں نکل گیا کہ پھر وہ بھی واپس نہ آیا۔ ابراہیم
گمشدگی نے منیزہ کو بھی ہلا ڈالا۔ اب یہ گھر مستقل بیت الحزن بن چکا تھا۔ کسی کا کسی
میں دل ہی نہ لگتا۔ منیزہ کا باپ بھی خوفزدہ اور فکر مند رہنے لگا تھا۔ منیزہ کو شر
کہ اس کا بیٹا ابراہیم کسی کی سازش کا شکار ہوا ہے اور اس کے خیال میں اس سازش
بانی مبانی ہارون کا بہنوئی تھا۔ منیزہ کا بس چلتا تو وہ ہارون کے بہنوئی کو کچ
چبا جاتی۔

دونوں بیٹوں کی گمشدگی نے ہارون کو مردہ کر دیا۔ اب اس کا کسی کام
دل ہی نہ لگتا۔ منیزہ بھی اکثر و بیشتر روتی ہی رہتی۔ ہارون کا بہنوئی بھی اداس
لگا تھا۔ منیزہ کا باپ مرنے کی خواہش میں جی رہا تھا۔ ہارون اور منیزہ گاہے بگاہے
میں جھگڑ پڑتے۔ ہارون کہتا "یہ سب تیری وجہ سے ہوا ہے تیری خود غرضی نے
کہیں کا بھی نہ رکھا۔"

منیزہ کہتی "ہارون! مجھے موردِ الزام ٹھہرا کر میرے زخموں پر نمک نہ چ
اگر زیادہ تنگ کیا تو میں گھر چھوڑ کر ہمیشہ کے لئے کہیں روپوش ہو جاؤں گی۔"
اور تو تو میں میں کسی نتیجے کے بغیر ہی ختم ہو جاتی۔

ہارون نے آلتا کر بدرجۂ مجبوری اپنے سابقہ پیشے سے رجوع کیا اور کو
روانہ ہو گیا۔ ان دنوں کوفے اور بصرے میں خلافت کی نیابت حجاج بن یو
کو مل چکی تھی اور وہ خوارج کے خلاف مہمات میں بری طرح الجھا ہوا تھا۔ اس
سپاہیوں کی ضرورت تھی چنانچہ وہ بڑی آسانی سے فوج میں داخل کر لیا گیا۔

حجاج کو جب یہ بات معلوم ہوئی کہ ہارون وہی شخص ہے جس نے خر
میں وہاں کے عامل امیہ کا ساتھ چھوڑ کر باغی بکیر کی حمایت کی تھی تو غضب ناک ہو
"اگر اس بار بھی غداری کی تو یہ سمجھ لے کہ میں امیہ سے قطعی مختلف انسان ہوں۔ اگر
دنوں خراسان میں امیہ کی جگہ میں ہوتا تو آج تو نظر نہ آتا، تیری خاک کا بھی پتہ نہ

یں غداروں کو معاف نہیں کرتا۔"

ہارون نے جواب دیا "امیر! میں نے کوئی غداری نہیں کی تھی، اگر میں غدار
ہوتا تو میرا حشر بھی غداروں کے ساتھ ہو چکا ہوتا، لیکن میں ایک وفادار انسان ہوں
اس لیئے میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ کے حکم کی تعمیل میں میں اپنی گردن تک
کٹوا دوں گا۔"

حجاج نے کہا "تب پھر جیش میں شامل ہو جا جو دشمنان خدا اور دشمن خدا
سے مصروف پیکار ہے اگر تیری جیش نے انہیں شکست دے دی تو میں تجھے اور تیرے
ساتھیوں کو انعام واکرام سے نواز دوں گا۔"

ہارون نے افسردگی سے جواب دیا "امیر! میں لالچی نہیں ہوں اس لیے میں اپنی
خدمات کا صلہ انعام واکرام کی صورت میں نہیں لوں گا۔ میں حمص سے چل کر یہاں آیا ہوں،
چاہتا ہوں کہ جب میں انعام واکرام کا مستحق ٹھہروں تو مجھے کوفے میں رہنے کی جگہ دے
دی جائے۔"

حجاج نے پوچھا "تجھ کو حمص میں کیا تکلیف ہے جو تو کوفے میں منتقل ہو جانا
چاہتا ہے؟"

ہارون نے جواب دیا "امیر! میرے دو بیٹے معلوم نہیں کہاں چلے گئے، اس لئے
میں اس گھر میں روحانی اذیت محسوس کرتا ہوں جہاں میرے دونوں بیٹے رہتے اور
اٹھتے بیٹھتے تھے۔"

حجاج نے کہا "تو فکر نہ کر، خوارج کے فتنے سے نجات مل جائے تو میں تیرا انتظام کوفے
ہی میں کر دوں گا۔"

ہارون نے اپنے دل میں یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ اب وہ حمص واپس نہیں جائے گا، اس
کو منیزہ سے نفرت ہو گئی تھی کیونکہ وہ پورے المیہ کا منیزہ ہی کو ذمہ دار سمجھتا تھا۔ دونوں بیٹوں
کی گمشدگی نے اس میں مایوسی اور قنوطیت پیدا کر دی تھی۔ اس نے خدا سے لو لگا لی تھی
اور ہر وقت یہی دعا مانگتا رہتا تھا کہ "خدایا، یا تو خوارج کے مقابلے میں مجھ کو کامیاب
و کامران کر دے، یا پھر شہادت سے ہمکنار کر دے۔"

ہارون کو مشہور خارجی سردار شبیب کے مقابلے پر بھیج دیا گیا۔ شبیب نے اموی
فوج کو شکستوں پر شکستیں دے کر تہلکا مچا دیا تھا حجاج ان شکستوں کی وجہ سے
فکر مند ہو گیا تھا اور دن رات شبیب اور خوارج کا خوف اور اندیشہ کھلائے جا رہا تھا۔

حجاج کو یہ خبر مل چکی تھی کہ شبیب اپنی فوج کے ساتھ کوفے کی طرف بڑھا چلا آ رہا ہے۔ حجاج فرات کے کنارے اپنے محل میں بیٹھا فوجی ترتیب میں مشغول تھا۔ شبیب فرات کے دوسرے کنارے سنجہ نامی قصبے میں پڑاؤ ڈال کر حجاج کا انتظار کرنے لگا۔ ہارون کا دستہ شبیب کے مقابل حجاج کے حکم کا منتظر ڈٹا ہوا تھا۔

حجاج نے محل کی چھت سے میدان جنگ کا معائنہ کیا۔ اس نے فرات کے اس پار سنجہ میں مسجد کے سامنے شبیب کی فوج کو پڑاؤ ڈالے دیکھا۔ شبیب کے پاس فوج زیادہ نہیں تھی اس لیے وہ فرات کے کنارے کو دور تک محفوظ نہیں رکھ سکتا تھا۔ اب حجاج نے فوراً ہی ایک فرمان کے ذریعے ہارون کے دستے کو فرات کے اس پار اتروا دیا اور سختی سے تاکید کر دی کہ وہ شبیب سے خوفزدہ ہوئے بغیر اپنی جگہ اس وقت تک ڈٹے رہیں جب تک وہ خود ان کی مدد کو نہ پہنچ جائے۔

محل کی چھت سے اچھی طرح جائزہ لے چکنے کے بعد حجاج نیچے اترا اور دو غلاموں کو زرق برق لباس پہنا کر ساتھ لیا اور اپنی سپاہ کو لے کر فرات کے پار اتر گیا۔ حجاج کی مخصوص کرسی اس کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ حجاج سنجہ کی مسجد تک پہنچنے کا منصوبہ بنا چکا تھا کیونکہ وہ خوب جانتا تھا کہ وہ اگر خارجیوں کی اس مسجد تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا تو وہ شبیب اور اس کے ساتھیوں کو خوفزدہ کرنے میں کامیاب ہو جائے گا۔

شبیب نے حجاج کی فوج کو جمع ہوتے دیکھا تو وہ ان کی طرف بڑھا۔ حجاج نے زرق برق لباس میں ڈوبے ہوئے اپنے ایک غلام کو حکم دیا۔ "اے شخص! اگر تو شبیب کو ہلاک یا زخمی کر دے گا تو ایک بہت بڑے انعام کا مستحق ٹھہرے گا۔ آگے بڑھ اور شبیب کو قتل کر کے آ جا۔"

غلام نہایت شان اور آن بان سے آگے بڑھا اور شبیب کو للکارا۔ شبیب نے اس کو حجاج سمجھ کر آگے بڑھ کر حملہ کر دیا۔ غلام اور شبیب میں ذرا دیر مقابلہ ہوا اور چند لمحوں بعد شبیب نے غلام کو قتل کر دیا۔ وہ جوش و خروش سے گھوڑا دوڑاتا ہوا حجاج کی فوج کے قریب چلا گیا اور اعلان کیا۔ "اے مجھ سے نبرد آزما لوگو! اگر یہ حجاج تھا جو زرق برق لباس میں میرا مقابلہ کرنے آیا تھا تو جان لو کہ میں نے اس کو قتل کر دیا اور تم اس کے خوف اور عذاب سے نجات پا چکے ہو۔"

حجاج نے دوسرے غلام کو حکم دیا۔ "اب تو جا اور شبیب کے داؤ پیچ کو ذہن میں رکھتے ہوئے اس کو ہلاک کر دے۔ اگر تو اس میں کامیاب ہو گیا تو میں تجھے آزاد بھی کر دوں گا اور کسی بلند منصب پر فائز بھی کر دوں گا۔"

غلام جوش اور جذبے سے آگے بڑھا۔ شبیب نے ایک دوسرے شاندار شخص کو جھومتے ہوئے آتے جو دیکھا تو یہ سمجھ بیٹھا کہ شاید حجاج وہ نہیں تھا جو قتل ہوا، بلکہ حجاج یہ ہے جو اب اس کے مقابلے پر آیا ہے۔ وہ پچھلے جوش و خروش سے اس کی طرف بڑھا اور پے در پے وار کرنے لگا۔ غلام بھی معمولی شمشیر زن نہیں تھا، اس نے بھی بڑی ہوشیاری اور مہارت سے شبیب کا مقابلہ کیا۔ شبیب نے کہا۔ "افسوس کہ میں نے تجھ سے پہلے جس شخص کو حجاج کے دھوکے میں قتل کیا تھا، وہ تو نہیں کوئی اور ہی تھا لیکن خیر اب تو مقابلے پر آیا ہے تو میری تلوار کا مزہ چکھ۔"

غلام نے بھی یہی تاثر دیا کہ وہی حجاج ہے، بولا۔ "شبیب! کیا تو مجھے کوئی معمولی شخص سمجھتا ہے؟ یاد رکھ کہ میں حجاج ہوں اور تیری موت میرے ہاتھوں لکھی گئی ہے۔"

شبیب نے کہا۔ "افسوس کہ تو انسان ہو کر خدائی کا دعویدار ہے، ورنہ تو یہ فضول بات کبھی نہ کہتا کہ میری موت تیرے ہاتھوں لکھی گئی ہے۔"

غلام نے ہنس کر جواب دیا۔ "اس میں کیا ہے، ابھی پتہ چلا جاتا ہے کس کی موت کس کے ہاتھ لکھی گئی ہے۔"

حجاج ان کی باتوں اور جذبوں سے خاصا متاثر تھا۔ اپنے آدمیوں کو حکم دیا۔ "مجھے کرسی سمیت آگے بڑھاؤ یہاں تک کہ میں اس مسجد کے قریب ہو جاؤں کیونکہ میں خوب جانتا ہوں کہ جب میں اس مسجد کے پاس پہنچ جاؤں گا تو گویا فتح میری ہی ہو گی۔"

اس کی کرسی ذرا آگے بڑھا دی گئی۔

حجاج کا غلام طہمان اور شبیب کچھ دیر کے لئے ایک دوسرے سے ٹکرائے اور پھر شبیب نے اس کا بھی کام تمام کر دیا۔ حجاج کا غلام طہمان زخمی ہو کر جیسے ہی گرا، شبیب نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ "دوستو! اگر یہ شخص حجاج تھا تو میں نے اسے بھی ہلاک کر دیا۔"

لیکن شبیب کے کسی ساتھی نے کرسی پر بیٹھے ہوئے حجاج کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "یا امیر المومنین! آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ حجاج تو وہ رہا، جو کرسی پر تمکنت سے بیٹھا ہے۔"

شبیب نے دور سے حجاج کو دیکھا اور بڑے اطمینان سے کہا۔ "خیر، اگر حجاج ابھی بچ گیا ہے تو شاید اپنے انجام کو پہنچنے کے لئے، اور اللہ نے چاہا تو اس دشمنِ فلاح و خیر

سے میں ہی نجات دلاؤں گا۔"

دوسری طرف حجاج اپنی فوج سے کہہ رہا تھا۔ "اے اطاعت شعارو اور فرماں تم ثابت قدم رہو، اگر تم نے میرا کہنا مانا تو میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ ہمار اور فتح کے درمیان کوئی شے حائل نہیں رہے گی۔"

ابھی حجاج کا خطاب پورا بھی نہ ہوا تھا کہ شبیب نے ان پر بھرپور وار کر شبیب اپنے چھ سو آدمیوں کے ساتھ حملہ آور ہوا تھا لیکن حجاج کی موجودگی نے ا کی سپاہ کے حوصلے بلند کر دیئے تھے۔ دھوپ کی چمک میں ہتھیار نظروں کو خیرہ کر تھے۔ دونوں طرف سے تلواریں نیزے اور تیر انسانوں کو ہلاک اور زخمی کر رہے تھے۔ شب اور اس کے ساتھیوں کی ساری کوشش حجاج نے خاک میں ملا دی تھی اور وہ خارجیو پیچھے دھکیلنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ جیسے جیسے خارجی پسپا ہو رہے تھے حجاج کی کرسی کی مسجد کی طرف بڑھتی جا رہی تھی۔ شبیب نے اپنے ساتھیوں کو جوش دلایا۔ "اے ا کے دوستو! اب گھوڑوں کی پشت پر سوار رہنے کا وقت نہیں رہا، نیچے آ جاؤ اور حجاج سپاہ کو مسجد کی طرف بڑھنے سے روک دو۔"

ہارون نے حجاج سے اجازت طلب کی۔ "امیر! میں اس خارجی سردار کو موت گھاٹ اتار کر امر ہو جانا چاہتا ہوں۔"

حجاج نے جواب دیا۔ "پھر انتظار کس بات کا، آگے بڑھ اور آبِ شجاعت اس شعلۂ جوالہ کو سرد کر دے۔"

ہارون نے گھوڑے کو ایڑ لگائی، لیکن وہ جیسے ہی خارجیوں کے قریب پ خوارج کی پیدل سپاہ میں سے چند سپاہی آگے بڑھے اور انہوں نے ہارون کے گھوڑ کی ٹانگوں کو کاٹ دیا۔ گھوڑا اگلی ٹانگوں کے کٹ جانے سے منہ کے بل گر گیا۔ ہار گھوڑے کے سامنے ذرا فاصلے پر اس طرح جا گرا، گویا اس کو اٹھا کر پھینک دیا گیا ہارون کے ہاتھ کی تلوار بھی گر گئی۔ ہارون کو اس حادثے میں بھی یہ احساس باقی ر خارجی اس کو چاروں طرف سے گھیر کر ہلاک کر سکتے ہیں۔ اس نے چوٹ کی پرواہ ک فوراً اٹھ کر واپس جانے کی کوشش کی لیکن ایک خارجی نوجوان نے اپنی تلوار کی نوک کے سینے پر رکھ دی اور حکماً کہا۔ "بھاگنے کی کوشش مت کر، چپ چاپ کھڑا رہ ہلاک کر دیا جائے گا۔"

اس شناسا آواز نے ہارون کے دل کی دھڑکن تیز کر دی۔ اس نے بے اس نوجوان کی طرف دیکھا اور خوشی میں چلایا۔ "اے عامر! یہ تو ہے؟ مگر تو یہاں کہاں ہے؟"

عامر کی تلوار کی نوک اب بھی ہارون کے سینے میں چبھ رہی تھی۔ عامر نے جلدی جلدی کہا۔ "افسوس کہ میں باپ ہونے کے باوجود تجھ کو معاف نہیں کر سکتا کیونکہ تو غلطی سے عبدالملک بن مروان کو مسلمانوں کا امیر المومنین سمجھتا ہے اور میں شبیب کو اپنا امام سمجھتا ہوں۔"

اتنی دیر میں دوسرے خارجی بھی ان دونوں کے آس پاس جمع ہو گئے اور ہارون پوری طرح ان کے قابو میں چلا گیا۔ عامر نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ "دوستو! افسوس کہ یہ بدقسمت اسیر میرا باپ ہے اس لیئے میں اس کو ہلاک نہیں کر سکتا، گرفتار کر کے امیر المومنین شبیب کے حوالے کر دوں گا جو وہ سزا تجویز کریں گے وہ دے دی جائے گی۔"

لیکن انہی میں سے ایک اور آشنا نوجوان ہارون کے سامنے آ کھڑا ہوا، یہ ابراہیم عامر کی سوتیلی ماں کا بیٹا تھا۔ ہارون ایک بار پھر چیخا۔ "ابراہیم یہ تو ہے، واللہ میں کیا دیکھ رہا ہوں؟"

عامر نے پھر جواب دیا۔ "ہاں اب ابراہیم بھی ہمارے ہی ساتھ ہے ہم لوگوں نے اپنی اپنی دنیا آخرت کے لیے فروخت کر دی ہے اس لیے ہمارے دلوں سے رشتوں کا احترام بھی نکل گیا۔"

حجاج دور سے یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ اس نے ہارون کو گھوڑے سمیت گرتے ہوتے دیکھ لیا اور اپنے آدمیوں کو حکم دیا۔ "اے اللہ کے بندو! تمہارا ایک بھائی مصیبت میں گھر گیا ہے، فوراً اس کی مدد کو پہنچو۔"

شامی سپاہ کا ایک دستہ دیوانہ وار آگے بڑھا اور آناً فاناً ہارون سمیت کئی خارجیوں کو اپنے گھیرے میں لے لیا۔ حجاج کے کئی اور دستے بھی مختلف سمتوں سے بڑھ کر وہیں پہنچ گئے اور خارجیوں کو بھاگنے کا موقع نہیں دیا۔ اب پانسہ پلٹ چکا تھا۔ عامر نے اپنی تلوار کی نوک سینے پر سے ہٹا کر شامیوں سے مقابلہ کرنا چاہا مگر شامیوں نے کمندیں پھینک پھینک کر انہیں گرفتار کر لیا۔ انہی میں عامر اور ابراہیم بھی شامل تھے۔ ہارون نے اپنے دونوں بیٹوں کو رسیوں میں جکڑا ہوا دیکھا تو بے چین ہو گیا۔

شبیب نے اپنے آدمیوں کو گرفتار ہوتے دیکھ کر شامی دستے پر یلغار کر دی لیکن اتنی دیر میں حجاج شامیوں کو طاقتور کمک پہنچا چکا تھا اس کی کمک نے خوارج کو تلواروں کی دھار پر رکھ لیا اور اس میں شبیب کا بھائی مصاد قتل کر دیا گیا۔ خوارج نے خود کو

مجتمع کر کے فیصلہ کن وار کیا مگر شامیوں نے انہیں شکست دے دی۔ شبیب نے ساتھیوں کو حکم دیا۔ "اے اللہ کے دوستو! اپنے بہترین وقت کی توقع میں بدترین لمحوں سے منہ موڑ لو، شاید آنے والا کل ہمارے لیے نفع بخش اور مفید ہو۔"

خوارج پیچھے ہٹے۔ حجاج اپنی کرسی کو آگے بڑھاتا رہا، یہاں تک کہ شبیب اپنے ساتھیوں سمیت پیچھے ہٹ گیا اور حجاج مسجد کے قریب پہنچ کر کرسی سے اتر پڑا، مسجد کے قریب جا کھڑا ہوا اور اعلان کیا۔ "اے اطاعت شعارو! اس ذات کی قسم جس کے دست قدرت میں حجاج کی جان ہے۔ یہ پہلی فتح ہے جو ہمیں حاصل ہوئی۔"

پھر وہ بیس آدمیوں کے ساتھ مسجد میں داخل ہو گیا اور اپنے آدمیوں کو حکم دیا۔ "دوستو! تم اپنے چلوں میں تیر لگائے رکھو اور جب یہ دیکھو کہ خارجی ہماری طرف بڑھ رہے ہیں تو انہیں تیروں کی بوچھاڑ سے روک دو۔"

شبیب نے حجاج کو مسجد میں داخل ہوتے دیکھا تو مایوس ہو گیا۔ وہ لڑتے بھڑتے دریا کی طرف بڑھا اور دیکھتے ہی دیکھتے اپنے ساتھیوں سمیت دریا پار اتر گیا۔ جب وہ سب دریا پار اتر گئے تو شبیب نے پل تڑوا دیا تاکہ اموی سپاہ اس کا تعاقب نہ کر سکے۔

حجاج قیدیوں کو لے کر اپنے محل میں واپس چلا گیا۔ ہارون اپنے دونوں بیٹوں کی محبت میں حجاج سے جدا نہیں ہونا چاہتا تھا کیونکہ وہ خوب جانتا تھا کہ حجاج سخت ظالم اور سفاک انسان ہے وہ معاف کرنے کا قائل ہی نہیں۔

حجاج نے اسیر خوارج کو قید خانے میں ڈلوا دیا اور خود آرام کرنے کے لیے جانے لگا۔ اس نے اپنی سپاہ کا ایک طاقتور دستہ طلایہ گردی کے لیے چھوڑ دیا اور اس طلایہ گرد دستے کا سردار ہارون کو مقرر کر دیا مگر ہارون نے یہ منصب قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ حجاج یہ بات کہاں برداشت کر سکتا تھا، غضب ناک ہو کر بولا۔ "ہارون! حکم عدولی کا سخت مخالف ہوں۔ تجھے منصب قبول کرنے میں تامل کیوں ہوا؟"

ہارون نے جواب دیا۔ "امیر! جب تک گرفتار خوارج کا کوئی فیصلہ نہیں ہو جاتا میں آپ سے دور نہیں رہ سکتا۔"

حجاج نے اپنی ران پر ہاتھ مارا۔ "میں زبان درازی کبھی پسند نہیں کرتا۔ یہ حکم ہے کہ تو اسی وقت طلایہ گرد دستے کو لے کر دریا کے کنارے کنارے چکر لگا۔ کیونکہ شبیب کا کوئی بھروسہ نہیں، وہ ہماری غفلت سے کسی وقت بھی فائدہ اٹھا...

لیکن ہارون نے اٹل لہجے میں جواب دیا۔ "لیکن میں نے کہہ جو دیا کہ میں اس وقت تک آپ کے قریب ہی رہوں گا جب تک کہ گرفتار خوارج کا کوئی فیصلہ نہیں کر دیا جاتا۔"

حجاج نے کرختگی سے پوچھا۔ "ان سے تیرا تعلق؟ ان سے تیری دلچسپی کا سبب؟"

ہارون نے جواب دیا۔ "اگر آپ اجازت دیں تو میں اپنی داستان کا کچھ حصہ آپ کے گوش گزار کر دوں، پھر آپ کی سمجھ میں آ جائے گا کہ مجھے ان گرفتاروں سے دلچسپی کیوں ہے؟"

حجاج نے ہارون کو قہر کی نظروں سے دیکھا۔ "اچھا بتا مگر مختصراً، اجمالاً۔ کیونکہ میں داستان گوئی بالکل پسند نہیں کرتا۔"

ہارون نے نہایت اختصار سے اپنی روداد سنا دی۔ حجاج بڑے انہماک سے سنتا رہا۔ آخر میں جلدی جلدی پلکیں جھپکائیں اور درشتی سے کہا۔ "افسوس کہ تو فوج کی سرداری کا منصب کس طرح سنبھالے گا کیونکہ تو وہ نالائق انسان ہے جو اپنے باپ، بہن، بہنوئی، بیوی اور اولاد کسی پر بھی قابو نہیں رکھ سکا، اب میں اپنے آپ پر بھی لعنت بھیجتا ہوں کہ میں نے تجھ کو سمجھنے میں اتنی بڑی غلطی کیوں کی۔ میں تجھے طلایہ گرد دستے کی سرداری سے معزول کرتا ہوں۔"

اس کے بعد اس نے ایک دوسرے شخص کو سردار بنا کر روانہ کر دیا اور ہارون سے کہا۔ "اب تو یہاں سے دفعان ہو جا، میں تیرے سائے تک سے بچنا چاہتا ہوں، اپنی فوج سمیت۔"

ہارون نے حجاج کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ حجاج نے اس کی آنکھوں میں تری محسوس کر لی، بولا۔ "تو عورتوں کی طرح رو کیوں رہا ہے، ان آنسوؤں کا مطلب؟"

ہارون نے جواب دیا۔ "امیر! میں اپنے دونوں بیٹوں کے سلسلے میں آپ کی نظر کرم کا خواہاں ہوں۔"

حجاج نے کہا۔ "ہاں میں ان پر رحم کروں گا، ان پر بھی اور تجھ پر بھی۔"

ہارون فرط خوشی سے مسکرا اٹھا۔ "امیر! میں آپ کے رحم و کرم کا پیشگی شکریہ ادا کرتا ہوں۔"

حجاج نے جواب دیا۔ "کیسا شکریہ؟ کیسا رحم؟ میں نے تو یہ فیصلہ کیا ہے کہ میں ان دونوں نالائق اولادوں سے تیرا پیچھا چھڑا دوں۔ میں کل صبح ہی ان دونوں کو قتل کرا دوں گا تاکہ تیرا دل ان دونوں کی طرف سے اور زیادہ سخت ہو جائے اور ان نالائقوں سے تیرا ہمیشہ کے لئے پیچھا چھوٹ جائے۔"

ہارون تلملا کر کھڑا ہو گیا۔ "امیر! میں ان دونوں کا باپ ہوں میں یہ نہیں برداشت کر سکتا کہ میری دونوں اولادیں میری نظروں کے سامنے قتل کر دی جائیں۔"

حجاج نے سختی سے کہا۔ "تو حمص واپس جا اور اپنے دونوں بیٹوں پر صبر کر لے۔"

ہارون نے جواب دیا۔ "امیر! میں ان کی طرف سے رحم کی درخواست کر رہا ہوں۔"

حجاج نے کہا۔ "ابھی ان پر مقدمہ چلے گا اس لئے رحم کی درخواست قبل از وقت ہے۔"

ہارون نے اپنے مقصد کا زیادہ شدت سے اظہار کیا۔ "امیر! میں یقین دہانی چاہتا ہوں کہ آپ ان دونوں کو معاف کر دیں گے۔"

حجاج نے سختی سے جواب دیا۔ "کیسی یقین دہانی، کس کی یقین دہانی! دفعہ ہو جا یہاں سے، ورنہ میں ان دونوں کے ساتھ تجھے بھی بند کر دوں گا اور تو بھی سزا مستحق قرار پائے گا۔"

ہارون کا دل بھر آیا۔ "امیر تو مجھے قتل کر دے لیکن میرے بیٹوں کو رہا کر دے۔"

حجاج نے کہا۔ "تو ان بیٹوں کے لئے رحم کی درخواست کر رہا ہے جو ہمیشہ سے تیری پریشانیوں کا باعث بنے ہوئے ہیں۔ بخدا میں ان دونوں کو ایسی عبرت ناک سزا دوں گا کہ دیکھنے والے لرز جائیں، اور یوں بھی تیرا بڑا بیٹا عامر تو کسی حد تک عفو کا مستحق بھی ہے مگر تیرا چھوٹا بیٹا ابراہیم، وہ سزا سے ہرگز نہیں بچ سکتا کیونکہ اس کی ذلیل اور حاسد ماں کئی آدمیوں کی اذیت اور پریشانی کا باعث بنی رہی ہے اب اس کو پریشان ہونا چاہیئے اب اس کو اذیتیں جھیلنا چاہئیں۔"

ہارون تھر تھر کانپنے لگا۔ حجاج اس کو لرزاں و ترساں چھوڑ کر اندر چلا گیا ہارون کے آنکھوں تلے اندھیرا پھیل گیا اور وہ دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ کر جہاں تھا وہیں بیٹھ گیا۔

* * *

قیدی خوارج کو حجاج کے روبرو باندھ کر ڈال دیا گیا۔ امرا اور منصب دار حجاج کے انتظار میں کھڑے تھے۔ رسیوں سے جکڑے ہوئے خوارج کے پیچھے جلاد اور دُرّہ بردار کھڑے تھے۔ ہارون اور چند دوسرے منصب دار حجاج کے محل کے دربر دربانوں کی طرح کھڑے اس کی آمد کے منتظر تھے کیونکہ یہ لوگ اسیر خوارج کے لیے مقدمہ سے پہلے ہی معافی کی یقین دہانی حاصل کر لینا چاہتے تھے۔

کچھ دیر بعد جب پہرے دار ایک دم مستعد اور چاق و چوبند ہو گئے تو ہارون اور دوسرے منصب داروں کو معلوم ہو گیا کہ حجاج کہیں قریب ہی موجود ہے اور عنقریب نمودار ہونے والا ہے۔ کچھ دیر جب حجاج اس طرح نمودار ہوا کہ وہ آہستہ آہستہ نپے تلے قدم اٹھاتا ہوا محل سے نکل رہا تھا اور اس کے دائیں بائیں دو دو قدم پیچھے چار قاضی اپنے مخصوص لباس میں سر جھکاتے چل رہے تھے۔ ایک قاضی کے دائیں ہاتھ میں کاغذ کے چند رقعے دبے ہوتے تھے اور ایسے ہی چند اور رقعے ایک دوسرے قاضی کے بائیں ہاتھ میں تھے۔

ہارون اور اس کے پاس کھڑے ہوتے منصب داروں نے حجاج کا دامن پکڑنا چاہا مگر حجاج کے محافظوں نے انہیں مار مار کر دور ہٹا دیا۔

حجاج کسی کی پرواہ کیئے بغیر خوارج کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ ایک خدمت گار نے اس کے پیچھے کرسی رکھ دی۔ حجاج اس پر بیٹھ گیا مگر چاروں قاضی مودّب کھڑے رہے۔

حجاج نے ایک خدمت گار کو حکم دیا کہ باری باری سے تمام خارجی اس کے روبرو لائے جائیں۔ یہ کل ستائیس خارجی تھے۔

جب ایک خارجی حجاج کے روبرو کھڑا کیا گیا تو حجاج نے پوچھا۔ "او بے دین! دشمن خدا اور رہزن رہنما! بتا تیرا شبیب کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

خارجی نے جواب دیا۔ "وہ امیر المومنین اور امام ہمارا ہیں۔"

حجاج نے پوچھا۔ "اور امیر المومنین حضرت عبدالملک بن مروان کے بارے میں تیری کیا رائے ہے؟"

خارجی نے جواب دیا۔ "خدا اس کو ذلیل اور رسوا کرے۔ تو نے امام ہمارا کے مقابلے

میں کس گمراہ کا نام لے لیا۔"

حجاج نے بائیں ہاتھ کے دھرے والے قاضی سے ایک پرچہ لے لیا اور اس خارجی کے حوالے کر دیا اور کہا۔"اس میں تیری سزا لکھ دی گئی ہے۔ چند لمحہ صبر کر، پھر میرا جلاد ریا کوئی دُرہ بردار اس پرزے میں لکھی ہوئی سزا کے مطابق تجھے نواز دے گا۔"

اس کے بعد حجاج کے روبرو دوسرا قیدی پیش کیا گیا، حجاج نے اس سے بھی اسی قسم کے سوالات کیے۔ اس نے بھی بڑی دلیری سے ویسے ہی جوابات دیئے، جو اس کا پیش رو دے چکا تھا۔

زخمی ہارون بھاگتا ہوا آیا اور اپنے بیٹوں کے پاس کھڑا ہو گیا۔ حجاج کے آدمیوں نے ایک بار پھر زدوکوب کرنا شروع کر دیا۔ وہ ہارون کو یہاں سے ہٹا دینا چاہتے تھے لیکن حجاج نے ہاتھ کے اشارے سے اپنے آدمیوں کو منع کر دیا کہ وہ ہارون کو جہاں کھڑا ہے کھڑا رہنے دیں۔

ہارون نے سرگوشی میں اپنے دونوں بیٹوں کو سمجھایا۔"بیٹو! خبردار جو تم نے حجاج کی مخالفت کی۔ تم دونوں خوب سوچ سمجھ کر وہی جوابات دینا جس سے وہ خوش ہو جائے ورنہ حجاج سے رحم کی امید کرنا حماقت ہے۔"

عامر نے جواب دیا۔"لیکن باواجان! میں جھوٹ نہیں بول سکتا کیونکہ جھوٹ بولنا زنا سے بڑا گناہ ہے۔"

ہارون نے ابراہیم سے پوچھا۔"ابراہیم! کیا تو نے میری بات سُنی؟"

اس نے جواب دیا۔"ہاں میں نے آپ کی باتیں سُن لی ہیں۔"

ہارون نے کہا۔"چنانچہ حجاج کو اس کے سوالوں کے ویسے ہی جواب دینا جس سے وہ خوش ہو جائے۔"

ابراہیم نے جواب دیا۔"باواجان! آپ کس دنیا میں رہتے ہیں؟ آپ لوگ وقتی فائدوں کے زیر اثر جھوٹ بول دینا آسان اور جائز سمجھتے ہیں جبکہ ہمارا ایمان یہ ہے کہ گردن کو سچ پر قربان کر دو۔"

ہارون چیخ مار کر رو دیا۔"او اپنے باپ کی دشمن اولادو! میں جانتا ہوں کہ تم دونوں بے دین اور گمراہ ہو چکے ہو اور میری باتیں کسی طرح بھی نہیں مانو گے اور اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ تم دونوں کے ساتھ میں بھی مار دیا جاؤں گا۔"

حجاج نے دور ہی سے ڈانٹا۔"او ذلیل اور خاندان برباد ہارون! تو کیا دھر غلا رہا ہے، ادھر میرے پاس آجا ورنہ میں تیرے بیٹوں کو بدترین سزا دے بیٹھوں گا۔"

ہارون نے اپنے بیٹوں سے مزید کہا۔"بیٹو! مناسب تو یہی ہے کہ تم دونوں وہی کہو جو میں نے کہا ہے، ویسے تمہاری مرضی۔" پھر آنکھوں سے اُبل پڑنے والے آنسوؤں کو اپنے دامن سے پونچھتا ہوا حجاج کے پاس چلا گیا۔

حجاج نے طنز کیا۔"او ظالم انسان! جن بیٹوں کو تو شب و روز اپنے پاس رکھ کر خارجی بننے سے نہیں روک سکا، اب انہیں چند نصیحتوں کے ذریعہ خارجیت سے منحرف کس طرح کر دے گا؟"

ہارون نے رو کر جواب دیا۔"آپ درست کہتے ہیں، میں غلطی پر ہوں۔"

حجاج باری باری خارجیوں کو بلاتا اور سوال جواب کرتا رہا اور آخر میں کسی کو بائیں ہاتھ کا کاغذ تھما دیتا اور کسی کو دائیں ہاتھ والا۔ یہاں تک کہ عامر کی نوبت آگئی اور اس کو حجاج کے روبرو پیش کر دیا گیا۔ ہارون نے اپنی دونوں آنکھیں بند کر لیں اور دونوں کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں کیونکہ وہ حجاج اور عامر کے سوال جواب کی اذیت سے بچنا چاہتا تھا اور ان دونوں کے چہروں کے تکلیف دہ تاثرات کو اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھنا چاہتا تھا چنانچہ اس کو کچھ پتہ نہ چلا کہ حجاج اور عامر میں کیا باتیں ہوئیں۔

کچھ دیر بعد جب ڈرتے ڈرتے آنکھیں کھولیں اور دونوں کانوں میں سے انگلیاں باہر نکال لیں تو اس نے دیکھا کہ عامر اور ابراہیم سزا کی پرچیاں سنبھالے دوسرے خارجیوں کے ساتھ کھڑے ہیں۔ حجاج نے ہارون سے کہا۔"او بزدل شخص! افسوس کہ تیرے دونوں بیٹے ہی خارجی نکلے۔ میں نے آج پہلی بار اپنی مرضی کے خلاف عامر کو سزائے موت نہیں دی، لیکن اسے معاف بھی نہیں کیا۔ میں نے ہر شخص کے ہاتھ میں اس کی سزا کا پرچہ تھما دیا ہے۔ افسوس کہ ابراہیم نے مجھ سے چند گستاخیاں کیں اور میں نے اس کو وہ سزا دے دی کہ وہ مرنے کے بعد بھی یاد رکھے گا۔"

ہارون نے ڈرتے ڈرتے اجازت مانگی۔"یا امیر! کیا میں ان دونوں سے آخری بار مل لوں؟"

حجاج نے جواب دیا۔"ضرور مل لے، میں نے تجھ کو ملنے سے منع تو نہیں کیا۔"

ہارون لرزتا کانپتا آہستہ آہستہ اپنے بیٹوں کے پاس پہنچا اور عامر سے کہا۔

"عامر! اپنی سزا کا پرچہ مجھے تو دکھانا۔"

عامر نے اپنا پرچہ باپ کو دے دیا۔ ہارون نے بڑی بے چینی سے اس کو کھولا اس میں بس ایک ہی فقرہ لکھا تھا۔ "فقط پندرہ دُرّے۔"

ہارون کے خوشی سے آنسو نکل آئے، سجدے میں گر گیا۔

کچھ دیر بعد سر اٹھایا اور ابراہیم سے کہا۔ "ابراہیم! اپنا پرچہ تو دکھانا ذرا!"

ابراہیم کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ اس نے مُردہ دلی سے اپنا پرچہ باپ کے ہاتھ میں دے دیا اس میں بس ایک ہی لفظ لکھا تھا۔ "قتل"!

ہارون کا دل ڈوبنے لگا۔ آنکھوں تلے اندھیرا پھیلنے لگا۔ اس کے پیروں کی جان نکل گئی تھی اور پنڈلیاں بری طرح سنسنا رہی تھیں۔ اس نے ابراہیم کی ہمت بندھائی "ابراہیم بیٹے! تم گھبرانا مت، میں حجاج کے پاس واپس جا رہا ہوں، میں اس کے قدموں میں گر کر تیرے لیے رحم کی بھیک مانگوں گا۔"

ابراہیم نے کوئی جواب نہیں دیا۔

ہارون لڑکھڑاتا ڈگمگاتا حجاج کے پاس پہنچا اور بڑی رقت سے درخواست کی۔ "امیر رحم! میرے بچے ابراہیم پر رحم کر، اس کی موت سے ہم دونوں ہی بے موت مر جائیں گے۔"

حجاج نے درشت آواز میں حکم دیا۔ "ہارون! تو ایک طرف چپ چاپ بیٹھ جا، پہلے بقیہ کے فیصلے بھی ان کے ہاتھوں میں تھما دوں۔ اس کے بعد تیری درخواست پر غور کروں گا۔"

دل گرفتہ ہارون دل میں امید کی شمع جلا کے ایک طرف بیٹھ گیا۔ فرطِ غم سے دونوں آنکھیں بند ہو گئیں اور وہ معلوم نہیں کیا کیا سوچتا رہا۔

حجاج نے بے نیازی سے ہارون کی طرف دیکھا اور ایک قاضی کو اشارے سے پاس بلا کر اس کے کان میں کہا۔ "جا اور جلاد اور دُرّے والوں سے کہہ دے کہ جن جن کو سزاؤں کے پرچے مل چکے ہیں ان پر فوراً عمل کیا جائے۔"

قاضی دبے قدموں جلاد اور دُرّہ برداروں کی طرف چل دیا۔

دوسری طرف عامر اور ابراہیم ایک دوسرے کو عجیب سی نظروں سے دیکھ رہے تھے، عامر نے پوچھا۔ "ابراہیم! کیا بات ہے تو بہت ڈرا سہما نظر آتا ہے کیا موت سے ڈر گیا؟"

ابراہیم واقعی رو رہا تھا بولا۔ "بھائی! میں موت سے نہیں ڈرتا میں تو یہ سوچ رہا ہوں کہ میری ماں کو جب میرے قتل کی خبر پہنچے گی تو اس کا کیا حال ہوگا؟"

عامر کو اپنی سوتیلی ماں منیزہ منیزہ کے ظلم و ستم یاد آ گئے اور ذرا سی دیر کے لیے منیزہ کے غمگین چہرے سے اس نے ایک قسم کی خوشی سی محسوس کی۔ وہ غمگین چہرہ جو تصور میں قبل از وقت ہی نظر آ رہا تھا۔

عامر نے پوچھا۔ "پھر تو کیا چاہتا ہے؟"

ابراہیم نے جواب دیا۔ "بھائی! میں اپنی ماں کے لیے زندہ رہنا چاہتا ہوں، اپنی ماں کی خدمت کرنا چاہتا ہوں۔"

عامر ابراہیم کو کچھ دیر دیکھتا رہا اور سوچتا رہا۔ اس کے بعد اپنا پرچہ ابراہیم کو دے دیا "لے اسے رکھ لے، اسے رکھ لے اور اپنا پرچہ مجھے دے دے تاکہ میں تیرے لیے رحم کی درخواست لے کر حجاج کے پاس جاؤں۔"

ابراہیم نے اپنا پرچہ عامر کو دے دیا اور عامر کا پرچہ خود لے لیا۔

اتنی دیر میں قاضی حجاج کا حکم پہنچا چکا تھا اور دُرّے بردار بڑی سرعت سے اس کی تعمیل میں لگ گئے تھے۔ قاضی ایک ایک کے ہاتھ سے پرچہ لیتا اور اس میں لکھی ہوئی سزا پڑھ کر جلاد یا دُرّے بردار کی طرف بڑھا دیتا۔ جلاد فوراً ہی گردن مار دیتا اور دُرّے بردار دُرّے لگانے لگتا۔

یہاں تک کہ ابراہیم کی باری بھی آ گئی اور اس کا پرچا پڑھ کر اس کو دُرّے بردار کے حوالے کر دیا گیا۔ دُرّوں کی ضربات سے جو چیخیں نکل رہی تھیں انہیں سن کر ہارون نے آنکھیں کھول دیں۔ اس نے بیک وقت دو منظر دیکھے۔ ایک تو دُرّوں کی شپاشپ اور زخمیوں کے ادھر ادھر گرنے اور بھاگنے کا منظر اور دوسرا یہ کہ جلاد بڑی سفاکی سے گردنیں مارنے کا فریضہ نہایت خشوع و خضوع سے انجام دے رہا تھا۔

ہارون نے حجاج سے درخواست کی۔ "یا امیر! میرے بیٹے ابراہیم پر رحم کیجئے۔"

حجاج نے اس کو ایک بار پھر ڈانٹا۔ "تو خاموش بیٹھا رہ۔ میں جب تک سارے مقدموں کے فیصلے نہیں کر چکوں گا تیری درخواست پر غور نہیں کروں گا۔"

ہارون بدحواس، افتاں و خیزاں مقتل میں پہنچا، اس وقت جلاد اپنی تلوار

فضا میں بلند کر چکا تھا اور تلوار کے سائے میں عامر سر جھکائے کھڑا تھا۔ پلک جھپکنے میں تلوار پوری قوت سے نیچے آئی اور عامر کے سر کو تن سے جدا کر کے دوسری طرف نکل گئی۔ ہارون چیخ مار کر گر گیا، وہ بس ایک ہی فقرہ ادا کر سکا "اس کو کیوں مار رہے ہو یہ تو قتل کا مستوجب نہیں تھا۔"

ہارون بے ہوش ہو گیا اور ابراہیم پندرہ دُرّے کھا کر سسکیاں لیتا ہوا بے ہوش باپ اور بے سر بھائی کے لاشے پر بیٹھ گیا۔ وہ سسکیاں لے کر رو رہا تھا اور دیکھنے والوں کو کچھ پتہ نہ تھا کہ یہ سسکیاں دُرّوں کے زخم سے نکل رہی ہیں یا اپنے عظیم بھائی کے عظیم الشان ایثار پر دل کی گہرائیوں سے۔

خانہ بدوش سرفروش

تیان شان کے جنگلات کا سلسلہ مغرب سے مشرق میں دور تک پھیلا چلا گیا تھا۔
ے آگے صحرائے اعظم گوبی کا مغربی کنارا تھا۔ گوبی کا ریگ زار تیان شان کے چیڑ، صنوبر
لی کے درختوں کے سامنے یوں پھیلا ہوا تھا جیسے وہ اپنی آغوش وا کیئے انہیں خوش
بد کہہ رہا ہو، اور تیان شان کے درخت صحرائے اعظم گوبی کو حیرت اور دہشت سے
ے دیکھ رہے ہوں۔ میں اپنی داستان کا آغاز تیان شان کے جنگلات سے بطور
کر رہا ہوں کیونکہ میری زندگی نے اہم ترین موڑ یہیں لیا تھا۔ میں جھیل بیکال کا
ی، شب و روز جنگ و جدال میں گزارنے والا منگول، رحم، محبت، کتابی علم اور
بت اندیشی سے قطعاً نابلد تھا۔ جاوداں نیلے آسمان کے دیوتا ان عالموں کو تباہ و
کر دیں، جنہوں نے ہمیں علم حاصل کرنے پر مجبور کیا۔ جب تک ہم نے علم نہیں
ل کیا تھا، اپنے بڑے بڑے مسائل کسی تذبذب کے بغیر حل کر لیا کرتے تھے لیکن
سے ہم نے پڑھ لکھ لیا تھا، ہمارے مزاج اور طبیعت میں تذبذب، شکوک اور
ندیشی کسی متعدی اور مہلک مرض کی طرح سرایت کر گئے تھے۔

قراقرم کا خاقان منگو خان میرے ماموں کا بیٹا ہے، خاقان کے تین اور بھائی
ہیں، قبلائی خان، ہلاکو خان اور اریق بوغا۔ ہمارا سب سے بڑا خاقان چنگیز خان
اتنی بڑی دنیا فتح کر کے دے گیا ہے کہ آج نیلے جاوداں آسمان کے نیچے ہمارا کوئی
نہیں۔ چنگیز خان کی عظیم روح اس کے جسم سے نکل کر ہمارے یاک کے نو دموں
ے پرچم میں حلول کر گئی ہے، اور ہمارے گھوڑے اس پرچم کے زیر سایہ بڑی
قوموں اور حکومتوں کو روندتے پھر رہے ہیں۔ ہمارے قراقرم میں پوری دنیا کے
جمع ہیں، عیسیٰ کے پرستار، ہندوستان کے بدھ مت والے، عرب کے مسلمان
لک کے کنفیوشس کے پیرو اور طاؤ مذہب کے عاشق۔ یہاں پگوڈا مسجد اور
چے ایک قطار میں کھڑے ہیں، یہاں موسیٰ کے ماننے والے بھی ہیں، اور ان کے
عے بھی گرجا اور مسجد کے درمیان دکھائی دیتے ہیں، مجھے اور میرے جیسے دوسرے
لوں کو انہی لوگوں نے علم سیکھنے پر مائل کیا، یہ ہمیں اکثر و بیشتر پچھلے زمانے کی
ا ایسی باتیں بتاتے رہتے کہ ہم دنگ رہ جاتے۔ ہم جو کچھ کہتے یہ لکھ لیتے اور کافی
ت گزرنے کے بعد، جب وہ بات ہمارے حافظے سے نکل چکی ہوتی تو یہ لوگ پڑھ
ہیں یاد دلاتے، اور ہم حیران ہو کر ان کی صورت دیکھنے لگتے اور یہی وہ چند
رات اور ترغیبات تھیں جن کے زیر اثر ہم نے علم حاصل کیا۔ اور ہمیں لکھنا پڑھنا

آگیا لیکن آہ! مجھے یہ کیا معلوم تھا کہ جس کو یہ متمدن لوگ علم کہتے ہیں، ایک قسم کا ز
جو انسان کی نس نس میں اتر کر اس کے اوصاف مردانہ کو زنگ کی طرح چاٹ جاتا ہے
آدمی کتابی بن کر رہ جاتا ہے۔

ہمارے خاقان منگو خان نے مغرب کے ملک ہلاکو خان کے انتظام میں دے
تھے، اور خاقان کی فوج کا پانچواں حصہ ہلاکو خان کے حوالے کر دیا گیا تھا۔ میں آغاز
ہلاکو خان کی فوج کے ایک حصے کا سردار ہوں۔

تیان شان جس کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے، وہ یادگار علاقہ ہے جس کے
گمزار حصوں میں دنیا کے راندۂ درگاہ اور ٹھکرائے ہوئے نرم مزاج مذاہب کے پ
آکر بس گئے تھے۔ اس چھوٹی سی سرسبز و شاداب کوہستانی بستی میں شاکیہ منی کے
مسیح ناصری کے جاں نثار، اور ایران کے مانی کے پیرو صدیوں سے مل جل کر رہ رہے
مانی کے پیرو روشنی کو خدا سمجھ کر پوجتے تھے اور انہیں تاریکی سے چڑ تھی، یہاں شا
کے برنجی مجسمے تھے جن کی شاکیہ منی کے پرستار پرستش کرتے تھے، مسیح ناصری کے
مند، ناصری کی ماں کی تصویروں کے سامنے جبیں سائی کرتے رہتے۔

میں اپنی پانچ ہزار فوج کے ساتھ شاہراہ ریشم سے قراقرم واپس جا رہا تھا
ساتھ چھکڑوں، اونٹ گاڑیوں اور گدھوں پر لدا ہوا وہ سامان تھا جو کاشغر کے اس
کے حکمرانوں نے ہمارے خاقان کو خراج میں بھجوایا تھا۔ چلتے چلتے جب ہم کوہ پام
آگے نکل گئے تو ہمارے ایک ساتھی نے شمال مشرق کی طرف اشارہ کرتے ہوئے

"خان! اس طرف دشوار گزار کوہستانی راستوں میں کہیں چند ایسی بستیاں بھی ہیں
ہم ابھی تک نہیں پہنچ سکے، سنتے ہیں وہاں بڑی دولت ہے اور ان کے پاس م
کا ایک جنگل پلا ہوا ہے!"

طمع سے میرے منہ میں پانی بھر آیا۔ میں نے کہا: "اگر تیرا خیال غلط نا
اس نے اپنا خنجر میری طرف اچھال دیا۔ بولا: "تو اس خنجر سے میری دا
زبان کاٹ لینا!"

میں نے سامان اور دو ہزار آدمیوں کو یہیں ٹھہرے رہنے کا حکم دیا اور
آدمیوں کے ساتھ اس طرف چل پڑا۔ سنسان پہاڑی پتھریلے راستوں میں ہما
کی ٹاپیں گونج رہی تھیں، ان کی بازگشت سے کوہستان لرز رہا تھا۔ نشیب و فراز
خم اور ہموار، ناہموار راستوں کو عبور کرتے ہوئے ہم بڑھتے چلے گئے ہمارے سا

وہاں جیسے کوہستانی سلسلوں کے اوپر جادوانی نیلا آسمان تھا اس کے نیچے پرندے
تیر رہے تھے جیسے نیلے پانی میں مچھلیاں، ہم نے اس شخص کو اپنے ساتھ لے لیا تھا۔
نے ہمیں ان نامعلوم آبادیوں تک پہنچنے کی ترغیب دی تھی۔ میری ہتھیلی اور انگلیاں
سے کچھ مطالبہ کر رہی تھیں، وہ بار بار مخبر کے خنجر کی ضرورت محسوس کر رہی تھیں اور
شی کی زبان سے، اس کی دروغ گو زبان کو تراشنے کی تحریک پیدا کر رہی تھیں۔ آخر
ہیں وہ دیوار نظر آنے لگی جس کے دوسری طرف انسانی آبادی تھی گھنے درختوں کے
نوں سے یہ دیوار دھبوں کی طرح دکھائی دے رہی تھی، میرے آدمیوں نے راہ میں
م ہونے والے درختوں کو کاٹ چھانٹ کر راستہ بنا لیا اور ہم شہر کی فصیل کے سائے میں
گئے۔ یہاں ایک دیوار پر موٹے موٹے حرفوں میں لکھا ہوا تھا۔

"امن و آشتی کے جویا حضرات کے لئے اس شہر کی آغوش کشادہ ہے۔ خوش
ید۔"

لیکن ہم وہاں امن و آشتی لے کر نہیں گئے تھے اور نہ خوش آمدید کے طلب گار
، ہم نے اپنی کمانوں کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر چلّے میں تیر چڑھائے اور شہریوں کا
نے کر شہر میں داخل ہو گئے۔ شہر کے لوگ سڑک کے آس پاس کھڑے ہو کر ہمیں تماشے
طرح دیکھنے لگے۔ مجھے ان بے وقوفوں پر بہت غصہ آیا کہ یہ ہمارا مقابلہ کیوں نہیں کرتے۔
مزاحمت اور مقابلے کے شہر میں داخل ہو جانا ہمارے لئے باعثِ ننگ و عار تھا۔ ہم
لف راستوں اور سڑکوں سے گزر کر ایک باغ کے صحن میں جا کھڑے ہوئے۔ میرے ساتھی
بزدلوں کا ہنس ہنس کر مذاق اڑا رہے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے بہت سے شہری ہمارے
پاس جمع ہو گئے۔ سفید ٹوپیاں، سفید عبائیں اور سفید پاجامے پہنے ہوئے بے وقوف
بانوں کا ایک وفد ہماری خدمت میں حاضر ہوا اور ہم سے سوال کیا کہ۔ "یہاں ہم کس
نوں سے تشریف لائے ہیں؟"

میں نے جواب دیا۔ "ہم یہاں دولت اور عورت کی غرض سے آئے ہیں، ہمارے
تھی کافی عرصے سے عورت کو ترس رہے ہیں کیا تم لوگ اچھے میزبانوں کی طرح ہمیں
رتیں نہیں فراہم کرو گے؟"

وہ سب بیماروں کی طرح آہستہ سے پیچھے ہٹے اور آپس میں کھسر پھسر کرنے لگے
ر بولے۔ "معزز صاحبان! آپ کی خدمت میں کسی نہ کسی طرح دولت تو حاضر و پیش کی
سکتی ہے، لیکن عورتوں کا مسئلہ بڑا ٹیڑھا ہے اس سے ہمیں معذور سمجھا جائے!"

میں نے وفد کو جواب دیا۔" ہم کسی چیز کی درخواست کم تر ہی کرتے ہیں، مطالبے خود ہی پورے کر لیتے ہیں، اس لئے ہمیں ہماری بات کا ہاں یا نہیں، میں دیا جائے!"

وفد دیر تک مجھے باتوں میں الجھائے رہا اور اس درمیان ان کے کئی ہزا ہتھیاروں سے لیس ہو کر ہمارے مقابلے پر آگئے۔ یہ دغا بازی ہمیں پسند نہ آئی او ان پر بھرپور حملہ کر دیا۔ تیروں کی سنسناہٹ، تلواروں کی شپاشپ، نیزوں کی کھنک گھوڑوں کی ہنہناہٹ نے قیامت کا منظر پیدا کر دیا تھا اور لوگوں کی چیخ پکار نے سر پر اٹھا رکھا تھا۔ ہم نے ان کے مردوں کو حکم دیا کہ وہ سب قطاروں میں کھڑے لیکن انہوں نے ہمارے حکم کی پروا کیے بغیر جنگ جاری رکھی اور ہمارے کئی آدمی ہماری آنکھوں میں خون اتر آیا اور ہم نے ان سب کو نیزوں، تلواروں اور تیروں کی لے لیا اور ذرا سی دیر میں ان کی بڑی آبادی کو جہنم واصل کر دیا یہ کام چور، کاہل، کے اندر رہنے بسنے والے شہری لوگ ضرورت سے زیادہ کتابی بن چکے تھے۔

داویلا کرتے ہوئے لوگوں نے جان کی امان کی درخواست کی۔ میں نے انہ چیخ کر حکم دیا کہ "اگر امان چاہتے ہو تو آبادی کے تمام مرد اپنے ہتھیار ہمارے حوا میدان میں کھڑے ہو جائیں!"

چند گھنٹوں کے اندر ہمارے حکم کی پوری پوری تعمیل کر دی گئی، یہ تع تقریباً بیس ہزار تھے۔ یعنی ہماری سپاہ سے تقریباً سات گنے زیادہ، مجھے ان کی تعجب ہوا اور آخر کار اس نتیجے پر پہنچا کہ یہ لوگ تھے جو زندگی سے کم ہی دلچسپی میں نے ان بزدلوں کو حکم دیا کہ وہ ایک دوسرے کے ہاتھوں کو پیچھے کمر پر باندھ حکم کی بھی فوراً ہی تعمیل کر دی گئی۔ آخر میں چند آدمی بچ گئے۔ جن کے ہاتھ نہیں تھے۔ میں نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ ان سب کو قتل کر دیا جائے۔ میرے آدمی ا ٹوٹ پڑے اور تلواروں سے ان کی گردنیں الگ کرنے لگے، وہ لوگ چیخ چیخ کر اپنے مردوں کا یہ حشر دیکھ کر ان کی عورتیں روتی ہوئی ہماری طرف بڑھیں لیکن سو آدمی ان کی راہ روک کر کھڑے ہو گئے اور عورتوں کو دہشت زدہ کرنے کے کے پیٹ بھی چاک کر دیے، میدان میں چاروں طرف خون ہی خون نظر آنے لگا لاشے پھڑک رہے تھے، ادھر سے فراغت پا کر ہم ان کے گھروں میں گھس گئے جو بھی ہاتھ لگا قبضے میں کیا۔ میں نے اپنے آدمیوں کو یہ حکم بھی دے رکھا تھا کہ تما

ھیڑ عمر اور بوڑھی عورتوں کو قتل کر دیا جائے اور جوان عورتوں اور لڑکیوں کو قبضے لیا جائے۔ میں خود دس سپاہیوں کے ساتھ گھروں کی تلاشی لیتا پھر رہا تھا کہ سپاہی ایک ادھیڑ عمر عورت کو پکڑ لائے اور مجھے بتایا کہ "یہ عورت کہتی ہے کہ اگر چھوڑ دیا جائے تو وہ اس کے عوض ایک نہایت قیمتی لعل ہمارے حوالے ے گی!"

میں نے اس عورت سے پوچھا۔" جس لعل کا تو ذکر کر رہی ہے۔ اس وقت اں ہے؟"

اس عورت نے جواب دیا۔" اسے میں نے نگل لیا ہے، اور مجھے اتنی قدرت ل ہے کہ جب چاہوں پیٹ سے نکال لوں!"

مجھے عورت کے جواب پر ہنسی آگئی۔ میں نے جواب دیا۔" او احمق عورت! اتنی ت تو مجھے بھی حاصل ہے کہ تیرے پیٹ سے لعل نکال لوں!"

یہ کہتے ہوئے میں نے اپنی تلوار کو ادھر ادھر گھما کر پیٹ کو دو حصوں میں تقسیم یا عورت چیخ مار کر گر گئی۔ اس کی آنتیں باہر نکل آئیں اور سرخ سرخ خون فوارے کی ابل پڑا۔ میں نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ "اس کے پیٹ میں لعل تلاش کیا ئے!"

یہ دیکھ کر مجھے بڑا تعجب ہوا کہ عورت جھوٹی نہیں تھی، اس کے پیٹ میں واقعی لعل موجود تھا۔ مجھ پر یہ ایک نیا انکشاف تھا کہ عورتیں لعل جیسی قیمتی چیز اپنے پیٹ بھی چھپا سکتی ہیں، میں نے غصے میں یہ حکم جاری کیا کہ تمام عورتوں کے پیٹ چاک کر گھروں کی طرح ان کے معدوں کی بھی تلاشی لی جائے کیونکہ یہاں کی عورتیں ضرورت سے دہ چالاک معلوم ہوتی ہیں۔

میں ادھر ادھر گھومتا پھر رہا تھا۔ اسی عالم میں، میں ایک ایسے مکان میں گھس جہاں کی فضا عود و لوبان کی خوشبو سے معطر تھی۔ مکان تقریباً خالی تھا کئی خالی کمروں گزر کر جب میں ایک ہال کمرے میں داخل ہوا تو وہاں میں نے ایک عمر رسیدہ شخص کو تصویر کے آگے سجدے میں گرا دیکھا وہ غالباً رو رہا تھا۔ اس کی ٹانگیں گھٹنوں پر مڑی ہوئی تھیں اور دونوں ہاتھ گھٹنوں کے آگے فرش پر ہتھیلی کے بل ٹیکے ہوئے ے، دونوں ہتھیلیوں کے درمیان پیشانی کے بل سر زمین پر ٹکا تھا۔ اور دونوں پیر پنجوں سہارے زمین پر تھے اور ایڑیاں اوپر اٹھی ہوئی تھیں، اس پر ہمارے داخلے کی

آہٹ کا ذرا بھی اثر نہ ہوا' ہمارا خیال تھا کہ وہ کم بخت ہمارا استقبال کرے گا اور اپنی د
کا پتہ بتلائے گا لیکن وہ کسی گونگے بہرے کی طرح ہماری طرف سے غافل رہا۔ کونے میں لکڑ
کا ایک ہتھوڑا رکھا ہوا تھا جس سے غالباً پیتل کے گھنٹے پر چوٹ لگائی جاتی تھی، میں نے
ہتھوڑا اٹھا لیا اور اسے فضا میں بلند کر کے' پوری قوت سے اس بوڑھے کی ریڑھ کی
پر رسید کیا۔ ہڈی ٹوٹ گئی اور بوڑھا مچھلی کی طرح تڑپنے لگا۔ میرے آدمی اس کے رقص
لطف اندوز ہونے لگے۔

دوسرے کمرے سے اچانک ایک لڑکی روتی، چیختی چلاتی ہمارے کمرے
داخل ہوئی اور اس بوڑھے کے متحرک جسم سے چمٹ کر رونے لگی۔ اس کی آواز رو
اتر جانے والے نغمے کی طرح میرے دل میں اتر گئی۔ میں نے آگے بڑھ کر لڑکی کو اپنی ط
کھینچ لیا اور اپنے ساتھیوں کو حکم دیا کہ "بوڑھے کا پیٹ چاک کر دیا جائے اور معد
میں دیکھا جائے کہ وہاں کوئی لعل تو نہیں چھپا ہے!"

اسی دوران میرے چند آدمیوں نے مجھے یہ مشورہ دیا کہ اگر تمام عورتوں
پیٹ چاک کر دیے گئے تو ان کی عورتوں والی ضرورت کس طرح پوری ہوگی۔ میں
ان سے دریافت کیا۔ "اب تک کتنی عورتوں کے پیٹ سے لعل یا کوئی دوسری
چیزیں نکل چکی ہیں؟"

انہوں نے جواب دیا۔ "اس عورت کے سوا کسی ایک کے پیٹ سے
نہیں نکلا!" میں نے انہیں حکم دیا۔ "اب جوان عورتوں اور لڑکیوں کے پیٹ نہ چاک
جائیں، بوڑھی عورتوں اور بچوں کو البتہ زندہ نہ چھوڑا جائے!" میں نے یہ حکم بھ
"یہ کام کم سے کم وقت میں انجام دیا جائے!"

یہاں سے ہمیں کئی ہزار زندہ عورتیں اور لڑکیاں ہاتھ آئیں، آخر میں
اپنا کام اس طرح آسان کیا کہ پوری بستی کو آگ لگا دی ہم نے یہ طریقہ اس لئے
کیا کہ اگر کچھ لوگ زندہ بچ گئے ہوں تو آگ ان کا کام تمام کر دے، ہمیں یہاں سے
کچھ ملا۔ ہم نے ان کے مویشیوں کے ریوڑ بھی اپنے قبضے میں کئے اور انہی کے گھوڑ
چھکڑوں پر ان کا سامان لاد کر شہر سے باہر نکلے، باہر نکلتے ہی میری نظر ایک بار پھ
کی اس عبارت پر پڑ گئی۔

"امن و آشتی کے جویا حضرات کے لئے اس شہر کی آغوش کشادہ
خوش آمدید!"

میں نے اپنے ایک سپاہی کو جو کچھ لکھنا پڑھنا بھی جانتا تھا حکم دیا

رت کے نیچے لکھ دو۔

"امن و آشتی کا انجام دیکھنے کے جویا حضرات کے لئے اس شہرِ خموشاں کی
وش کشادہ ہے، خوش آمدید!"

میرے دو ہزار سپاہی شاہراہِ ریشم کے کنارے ڈیرہ ڈالے ابھی تک پڑے
۔ انہوں نے ہمیں دیکھتے ہی خوشی میں شور و غل مچانا شروع کیا۔ جس شخص نے اس بستی
حملہ آور ہونے کی ترغیب دی تھی، وہ ہمارے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ اس نے اپنے خنجر
واپسی کا مطالبہ کیا اور یہ بھی کہا کہ مال و دولت کی تقسیم میں وہ دوہرے حصے کا مستحق
ے میں نے حامی بھر لی کہ ایسا ہی ہوگا وہ فکر نہ کرے۔

میں نے شاہراہِ ریشم کے کنارے دنیا کی چھت (پامیر) کے مشرق میں دو
ں کے لئے پڑاؤ ڈال دیا۔ میدان میں دور تک عورت ہی عورت نظر آنے لگے۔ مویشی
ٹے گئے اور پتھروں کے چولہوں پر انہیں سینکا بھونا جانے لگا۔ میدان سے سرمئی دھویں
ہلکا سا بادل اٹھا اور ہمارے سروں پر منڈلانے لگا آہستہ آہستہ یہ اتنا گہرا اور غلیظ ہو
یا کہ سورج کی روشنی ماند پڑنے لگی۔

لڑکی کا نام ماریہ تھا اور جس بوڑھے کو ریڑھ کی ہڈی توڑ کر میں نے قتل کر دیا
ا' وہ ماریہ کا باپ تھا، ماریہ کے بقول اس کا ایک محبوب بھی تھا، جو ان دنوں بیت
قدس میں بیت اللحم اور گلگتا کی زیارت کو گیا ہوا تھا۔ بیت اللحم، ناصرہ کا وہ گھر جہاں ان
مسیح پیدا ہوا تھا۔ اور گلگتا وہ جگہ تھی، جہاں ناصری صلیب پر چڑھایا گیا تھا۔ گلگتا
مطلب ہے کھوپڑیوں کا ڈھیر۔ میں نے ماریہ کو ڈانٹا اور پوچھا کہ کیا وہ اب بھی یہ امید
تی ہے کہ وہ اپنے محبوب کو حاصل کر سکے گی۔

ماریہ نے نفی میں گردن ہلا دی۔ میں نے ماریہ سے وعدہ کیا کہ اگر اس کا محبوب
بھی بھولا بھٹکا اس کی تلاش میں قراقرم آ گیا تو وہ اسے شامانوں (مذہبی پروہتوں اور
ساحروں) کے ساتھ رہنے کی اجازت دے دے گا۔ میں نے ماریہ کو اپنی دلہن بنا لیا۔
یری شادی میں خاقان منگو خان، ہلاکو خان اور ادیق بوغا نے بھی شرکت کی، قبلائی
ان چین کی مہم پر گیا ہوا تھا۔ اس لئے وہ نہیں شریک ہو سکا۔ ہمارے ماموں کے
بنوں بیٹے چینی ریشم کے زیر جامے پر بھیڑ کی کھالیں پہنے ہوتے تھے، ان کے سروں
ر جو ٹوپیاں منڈھی ہوئی تھیں، ان میں موتی جڑے تھے، ان کے بڑے بڑے سروں
پر بڑے بڑے بال تھے، اور ٹوپیوں کے نیچے سے دو گندھی ہوئی موٹی موٹی چوٹیاں

نکل کمان کی پشت پر پڑی ہوئی تھیں ان میں نہایت قیمتی جواہرات پھنسے ہوئے تھے مار یہ بظاہر خوش بہت تھی لیکن اس بات کا انکشاف تو بہت بعد میں ہوا کہ یہ چالاک اور ہوشیار لڑکی کتنی عقل مند اور مکار تھی، میں چاہتا ہوں کہ اب میں جو کچھ لکھنے والا ہو اسے نہایت توجہ اور دلچسپی سے پڑھا جائے کیونکہ اس ربط اور تسلسل کے ذریعے میں انجام تک پہنچنے والا ہوں، ان سے درمیانی کڑیوں سے سرسری گزرنے کے بعد اچھی طر لطف اندوز نہ ہوا جا سکے گا۔

میں نے ماریہ کو اکثر تنہائی میں مسیح ناصری کی پرستش کرتے دیکھا وہ مسیح خدا کا بیٹا کہتی تھی، اس سے پہلے بھی جو ناصری قراقرم میں رہ رہے تھے، ان کا بھی اصرار تھا کہ مسیح ناصری خدا کا بیٹا ہے لیکن ہمیں اس کے ماننے میں تامل تھا، اگر مسیح واقعی خدا کا بیٹا تھا تو زندگی کے آخری لمحات میں اسے اس کے باپ نے تنہا کیو چھوڑ دیا تھا۔

میں نے تھوڑا سا تو پہلے ہی پڑھ لکھ لیا تھا لیکن ماریہ نے اس میں کچھ زیا اضافہ کر دیا۔ وہ علم اور تہذیب کی اہمیت پر بے تکان بولتی رہتی۔ وہ ہمیں بتا انسانی خون خرابہ اچھی چیز نہیں ہے، وہ یہ بھی چاہتی تھی کہ میں یورت کے بجائے پخ مکان تعمیر کرالوں اور اس میں شہریوں کی طرح رہنے لگوں لیکن مجھے اپنے نانا چنگیز خان ہدایت ابھی یاد تھی کہ "پکے مکانات بنوا کے چینیوں کی طرح مکانوں میں ہرگز نہ رہنا کیو اس طرح تم کمزور ہو جاؤ گے۔" یہ اس خانِ اعظم کا حکم تھا جس کی عظیم روح ہمارے کے نو دموں والے پرچم میں اب بھی موجود تھی ہم اس کی علم والی بات کو تو ہر طرح ماننے تیار تھے لیکن تہذیب کی بات بالکل سمجھ میں نہ آتی، وہی تہذیب نا؟ جو انسان کو مکار اور کل (مشین) بنا دیتی ہے۔ میں نے ماریہ کو ڈانٹ دیا اور کہا۔ "ماریہ! خبردار جو نے اب کبھی تہذیب کی بات کی، تہذیب ہمیں غلامی کا عادی بناتی ہے اور ہم اور دو خیموں کے شہر) کے رہنے والے لوگ تہذیب کے چکر میں غلامی کا جوا اپنی گردن میں ڈال لیں!"

میں ماریہ سے عشق کی حد تک محبت کرتا تھا لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہ کہ میں دوسری عورتوں سے کوئی دلچسپی ہی نہ لیتا تھا، مجھے بعض دوسری عورتیں پسند آتیں لیکن ماریہ کو میری یہ عادت پسند نہ آئی۔

میرا باپ ابھی زندہ تھا اور قبلائی خان کے ساتھ چین کی مہمات میں گیا

لیکن کچھ لوگ ایک دن گدھے کی پشت پر لاد کر اس کی لاش لے آئے، میرا باپ کسی لڑائی میں کام آ گیا تھا۔ ہمارے یورت کے سامنے جب اس کی لاش لا کر گدھے سے اتاری گئی تو ہماری عورتوں نے لاش پر بین کیا، اور دیر تک سر کے بال نوچتی کھسوٹتی رہیں، ہم نے باپ کی لاش دریائے کیرولان اور دریائے تولا کے چشموں کے درمیان، برخان کلدون دکوہستان قوت واقتدار) کے ڈھلان میں دفن کر دی۔ یہاں صنوبر کے درختوں کے بیچ سے دھوپ چھن چھن کر آتی تھی، میرے دل پر بھی باپ کی موت کا بڑا اثر تھا لیکن ساتھ ہی ایک خوشی بھی تھی، میرے باپ نے کئی شادیاں کی تھیں، اس کی آخری شادی کرائیت قبیلے کی ایک نو عمر امیرزادی تاشی سے ہوئی تھی، تاشی کی عمر بیوگی کے وقت مشکل سے بیس برس رہی ہوگی، یہ میری سوتیلی ماں تھی لیکن میں اس سے محبت کرتا تھا، اور اس سے شادی کرنے کی خواہش رکھتا تھا، باپ کی موت نے راہ ہموار کر دی تھی، تاشی ہمارے باپ کے یورت میں دوسری کئی ماؤں کے ساتھ رہتی تھی۔ میں برخان کلدون سے سیدھا اپنے باپ کے یورت میں پہنچا وہاں ہلاکو خان اپنی بیوی دوقوز خاتون کے ساتھ پہلے ہی پہنچ چکا تھا۔ دوقوز خاتون بھی پہلے ہلاکو خان کی سوتیلی ماں تھی لیکن باپ کی موت کے بعد وہ ہلاکو کی بیوی بن گئی تھی۔

ہلاکو خان نے تسلی دیتے ہوئے مجھے بہت سمجھایا اور یہ بھی کہا کہ ایران اور بغداد کی مہم پر روانگی کی تیاری شروع کر دی جائے۔ ہلاکو خان کو خاقانِ اعظم منگو خان نے یہ فرمان جاری کیا تھا کہ "الموت کے شیخ الجبال کو پہلے ہمارے پاس روانہ کر دو اور اس کے سارے قلعے اور پناہ گاہیں تباہ و برباد کر دو"۔ ہلاکو خان اس مہم کی تیاری میں لگا ہوا تھا اور چونکہ میں خود بھی ہلاکو خان کی فوج سے تعلق رکھتا تھا، اس لئے واقعی غم غلط کرنے کو میرے لئے تاشی اور ماریہ کی محبت کافی تھی۔

میں نے ہلاکو خان اپنے بھائی کے سامنے ہی تاشی کو رعب میں لے لیا اور کرخت آواز میں کہا۔ "تاشی! اب تو میری ماں نہیں رہی، بلکہ آج سے میری بیوی ہے، چل میرے ساتھ میرے اپنے یورت میں، اور دلہن بن کر رہ۔"

ہلاکو خان نے ہنس کر تاشی سے کہا۔ "تو پہلے کی بہ نسبت اب زیادہ اچھی لگ رہی ہے، پہلے تو ایک بوڑھے کی بیوی تھی اور اب اس بوڑھے کے بیٹے کی دلہن بننے والی ہے!"

یہ کہہ کر ہلاکو خان اپنی جگہ سے اٹھا اور جھومتا ہوا ہمارے قریب آ کر بولا۔ "آغائی

خان! تو خوش قسمت ہے کہ تیان شان سے تو ماریہ جیسی لڑکی لایا اور اسے اپنی دلہن بنا لیا اور اب تجھے تاشی ملنے والی ہے تاشی بھی کچھ کم عقل مند لڑکی نہیں ہے!"

میں نے پہلی بار تاشی سے بے تکلفی کا اظہار کیا جس کا تاشی نے بھی گرمجوشی سے جواب دیا۔ ہلاکو خان، دو خاتون اور یورت میں موجود دوسرے مہمانوں نے اپنی رائیں پیش کر مبارک باد دی اور پھر ہم نے ان سب کی شراب اور گھوڑی کے دودھ سے تواضع کی، تاشی شوخ رنگ کے چمڑے کا پاجامہ اور چوڑا کوٹ پہنے ہوئے تھی، کمر گہرے نیلے رنگ کے کمربند سے جکڑی ہوئی تھی، اور سینے پر ایک رومال بندھا تھا۔ ہم اپنے باپ کے یورت کافی دیر رک کر اپنے یورت کی طرف چل پڑے، تاشی میری رفاقت میں تھی اور میں اس حالت میں جیسے ہی اپنے یورت میں داخل ہوا ماریہ مجھے دیکھتے ہی سٹپٹا گئی۔ تلملا کر کھڑی ہو گئی اور حیرت اور غم کی ملی جلی کیفیت میں سوال کیا۔ "یہ کیا ہے، کیا تاشی تیری ماں نہیں ہے؟"

میں نے ہنس کر جواب دیا۔ "نہیں اب نہیں ہے، پہلے کبھی تھی!"

ماریہ نے بے چینی سے پوچھا۔ "آغائی خان! کہیں تو نشے میں تو نہیں؟"

"میں بالکل ہوش و حواس میں ہوں، تو کہنا کیا چاہتی ہے؟"

ماریہ نے جواب دیا۔ "تیرے باپ کی بیوی تیری بیوی کس طرح بن گئی؟"

میں نے جواب دیا۔ "باپ کی موت سے۔ تاشی میرے باپ کا ورثہ ہے جو مجھے مل گیا!"

ماریہ نے جوش میں چلا کر کہا۔ "اسے چھوڑ دو، ورنہ میں روٹھ جاؤں گی۔ یہ نہیں برداشت کر سکتی!"

میں نے بھی اسے ڈانٹ دیا اور گرج کر کہا۔ "تو کیا نہیں برداشت کر سکتی احمق لڑکی! کیا تجھے یہ بات ابھی تک نہیں معلوم کہ میں تاشی سے عشق کرتا ہوں!"

ماریہ نے جل کر کہا۔ "تم جھوٹے ہو، یہی بات تم نے مجھ سے بھی کہی تھی، تمہاری وہ بات درست تھی جو تم نے مجھ سے کہی تھی، یا یہ جواب تاشی کے لئے کہہ رہی ہو؟"

میں نے جواب دیا۔ "ہم لوگ جھوٹ نہیں بولتے۔ دونوں ہی باتیں درست ہیں!"

ماریہ نے بے مروتی سے کہا۔ "یہ کس طرح ممکن ہے کہ دونوں ہی باتیں درست

ہوں، بھلا ایک دل میں دو عورتیں کس طرح بسائی جا سکتی ہیں؟"

مجھے اس پڑھی لکھی، شہری لڑکی کی احمقانہ بات پر ہنسی آگئی، میں نے کہا۔ "ایک دل میں دو تو کیا ہزار عورتیں بسائی جا سکتی ہیں میرا دل آغائی خان کا یورت ہے ایک خان کا یورت، اس میں جو بھی آئے گا میرا مہمان ہو گا۔ تاشی بھی میری مہمان ہے، تو آگے بڑھ کر اس کی پیشوائی کر!"

لیکن ماریہ اپنی جگہ سے ہلی تک نہیں، میں غصے میں آگے بڑھا اور ماریہ کو بالوں سے پکڑ کر گھسیٹتا ہوا تاشی کے قدموں تک لے گیا اور اسے زمین پر گرا دیا ماریہ کی ناک سے خون بہہ نکلا اور کئی دانتوں کے ہل جانے سے وہ سسکیاں بھرنے لگی۔ میں نے اسے سختی سے حکم دیا۔ "ماریہ! تیرے حق میں یہی بہتر ہے کہ تو تاشی کا احترام بجا لا اور اس سے معافی کی طلب گار ہو!"

وہ اٹھی اور تاشی کے آگے جھک گئی۔ اس نے تاشی سے معافی مانگی اس کے بعد مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگی۔ "آغائی خان! تم مجھے معاف کر دو، میں نے تمہارا دل دکھا دیا اور شاید تمہارے ساتھ ساتھ تاشی کا بھی جبکہ ناصری نے یہ تعلیم دی ہے کہ کسی کا دل مت دکھاؤ اور جو تمہارے ایک طمانچہ رسید کرے، تم اس کے آگے اپنا دوسرا گال بھی بڑھا دو، میں نے تمہاری حکم عدولی کر کے مسیح کی حکم عدولی کی، خدا مجھے معاف کرے!"

میں نے دیکھا اس کے دونوں رخسار آنسوؤں سے تر تھے مجھے اس پر رحم آیا اور میرے دل میں اس کی محبت بیدار ہو گئی۔ میں نے خود بھی اس سے اپنی زیادتی پر شرمندگی کا اظہار کیا۔ جب میں اپنی پشیمانی اور ندامت کا لڑکھڑاتی آواز میں اعلان کر رہا تھا۔ اس وقت میری قوتِ گویائی اور قوتِ ارادی میرے ساتھ نہ تھیں، میری معذرت اور پشیمانی کا ماریہ پر بڑا اثر ہوا۔ بولی۔ "تم سب کو ایک نہ ایک دن یہ بات ماننی ہی پڑے گی کہ گناہ بھی ایک چیز ہے ضرور!"

میں نے طیش میں پوچھا۔ "تو ہزار بار گناہ کا نام لے چکی ہے تو آج مجھے یہ بتا دے کہ یہ گناہ کیا چیز ہے؟"

ماریہ نے جواب دیا۔ "ہر وہ کام جس سے ابن اللہ اور اللہ نے منع فرمایا ہے گناہ ہے، تمدن کو غارت کرنا اور نسل انسانی کو تہ تیغ کر دینا بدترین گناہ ہیں، ان افعال سے توبہ کر لو۔"

میں نے کوئی جواب نہ دیا کیونکہ میں خوب اچھی طرح اس تلخ حقیقت سے آگاہ تھا کہ اگر نسلِ انسانی پر ظلم و جور نہ ڈھایا جاتے اور انسانی حلم و مروّت اور خدا ترسی اور نیکی سے کام لیا جاتے تو دنیا کا بیشتر حصّہ اپنے گلے سے محکومی اور غلامی کا جوا اتار پھینکے اور ہمارے یورتوں میں قحط اور تنگ حالی کا راج ہو جاتے۔

میں نے تاشی اور ماریہ کو ایک ساتھ تنبیہہ کی کہ وہ دونوں مِل جل کر رہو اور پھر وہ دونوں میں زیادہ بے تکلفی

اور یگانگت پیدا کرنے کی خاطر خیمے سے باہر چلا آیا۔

خاقانِ اعظم منگو خان نے اپنے بھائی ہلاکو خان کو حکم دیا کہ وہ اپنے اردو (لشکر) کو لے کر شیخ الجبال کے گھونسلوں جیسے قلعوں کا رخ کرے، اور انہیں تباہ و برباد کر کے شیخ الجبال کو اس کے پاس روانہ کر دے اور ساتھ ہی یہ حکم بھی دیا کہ اس مہم سے فارغ ہونے کے بعد ہلاکو خان مسلمانوں کے شہر بغداد میں گھس جائے اور پانچ سو سالہ عباسی خلافت کو مطیع یا تباہ و برباد کر دے، خاقانِ اعظم منگو خان اگر چاہتا تو یہ جنگی مہم مغربی ملکوں کی طرف بھیج دیتا اور مسلمانوں کی عباسی خلافت اور شیخ الجبال کے گھونسلوں جیسے قلعے ہماری یورش و یلغار سے محفوظ رہتے لیکن یہ سب کچھ ایک نہایت سوچے سمجھے منصوبے کے ماتحت ہو رہا تھا۔ جب سے ہم منگولوں نے جاودانی نیلے آسمان کی کرم گستری سے دنیا کے بڑے بڑے تاجداروں کو خاک میں ملایا تھا اور بڑے بڑے سرکشوں کی پیشانیاں اپنے بلند اونچی یورتوں کی چوکھٹوں پر جھکوا دی تھیں، دنیا بھر کے مذاہب کے پیشواؤں نے اردو بالیغ (قراقرم) میں مستقل قیام اختیار کر لیا تھا۔ ان میں مسیح ناصری، شاکیہ منی، موسیٰ اور مانی کے پرستاروں کے علاوہ مسلمان بھی شامل تھے جو عرب کے محمد (ص) کو دنیا کا آخری پیغمبر کہتے تھے اور مکّے میں خدا کے گھر کی طرف منہ کر کے عبادت کیا کرتے تھے۔ ہم ان پر ہنستے ہیں کہ ان کا خدا کیسا ہے جس نے پوری دنیا میں صرف مکّے میں اپنا گھر بنایا۔ اس نے ہمارے اردو بالیغ دیوروں کے شہر قراقرم) میں اپنا گھر کیوں نہ بنایا۔

مسیح ناصری کے ماننے والے بہت شاطر ہیں انہوں نے کچھ جھوٹے سچے شعبدے دکھا کر ہماری عورتوں کو ناصری کی طرف مائل کر دیا ہے چنانچہ خاقانِ اعظم منگو خان، ہلاکو خان، قبلائی خان اور اریق بوغا کی ماں ناصریوں کے انداز میں عبادت کرتی ہے اور اس کے پاس مسیح ناصری اور اس کی ماں مریم کی کئی تصویریں موجود ہیں، جن کے روبرو وہ

سجدہ کرتی ہے، اس کے علاوہ ہلاکو خان کی بیوی دوقوز خاتون بھی عیسائی ہو چکی ہے اور اس کے خیمے کے ساتھ ہی اس کا چیپل بھی چلتا ہے، ان عورتوں کو ناصریوں نے یہ باور کرا دیا ہے کہ مسلمان ظالم اور جھوٹے ہیں اگر ان کی طاقتوں کو تباہ و برباد نہ کیا گیا تو یہ لوگ ایک نہ ایک دن پوری دنیا اور خاص کر منگولوں کے لئے عذابِ جان بن جائیں گے، جب عورتوں نے ہمیں یہ باور کرا دیا تو ہم لوگ بھی شیخ الجبال اور عباسی خلیفہ کی سرکوبی اور بیخ کنی پر آمادہ ہو گئے۔ ہمارے ارادوں اور نئی مہم کا جب ماریہ کو علم ہوا تو وہ بھی بہت خوش ہوئی۔ وہ اپنے چیپل میں گئی اور ناصری کی اس تصویر کے روبرو سجدہ ریز ہو گئی جس میں ناصری کو دو مصلوب چوروں کے درمیان صلیب پر چڑھا دکھایا گیا ہے، اس نے بھرائی آواز میں مصلوب ناصری سے کہا۔ "اے مقدس مسیح! کافروں (مسلمانوں) کے مقابلے میں منگول وحشیوں کو عزت و کامرانی عطا فرما۔"

میں نے ماریہ کو پیچھے سے پکڑ لیا اور کہا "ماریہ! کیا تجھے اب تک یہ بات نہیں معلوم کہ تاشی کی خادمہ کلثوم مسلمان ہے، پھر تاشی یہ کس طرح پسند کرے گی کہ اس کی خادمہ کے دین کو ذلیل و خوار کیا جاتے!"

ماریہ نے اپنا گریبان چھڑانے کی کوشش کی، اور اس کوشش میں اپنا گریبان چاک کرا لیا، بولی "کلثوم ساحرہ ہے اور سادہ لوح تاشی کو یہ کیا معلوم کہ کلثوم اپنے جادو کے زور سے ایک نہ ایک دن تاشی کی جگہ خود لے لے گی اور آغائی خان کلثوم پر جان چھڑکنے لگے گا کیونکہ آغائی خان کا دل، دل نہیں خان کا یورت ہے جس میں بہت سی لڑکیاں اور عورتیں بس سکتی ہیں!"

میں ماریہ کے اس تازہ انکشاف سے ڈر گیا۔ میں نے سوچا کہ کلثوم اگر واقعی ساحرہ ہے تو بہت بری بات ہے اور اس کا زندہ رہنا سب کے لئے بہت برا ہے لیکن اس کے ساحرہ ہونے کا ثبوت لئے بغیر اسے کوئی سزا کس طرح دی جا سکتی تھی۔ میں پریشان حال جب اپنے یورت میں داخل ہوا تو تاشی کو بناؤ سنگار کرتے دیکھا۔

"تاشی! ایک بات تو بتا، کیا یہ درست ہے کہ کلثوم ساحرہ ہے اور ہم پر کوئی بڑا جادو کرنے والی ہے!"

"بکواس!" وہ ٹھہر ٹھہر کر کہنے لگی اس کا چہرہ سرخ ہو گیا پھر شیرنی کی طرح دہاڑ کر بولی "کہیں تم سے یہ بات ماریہ نے تو نہیں کہی جو مسلمانوں کی دشمن ہے؟"

میں نے اقرار کر لیا، تاشی اور زور سے چیخی۔ "خان! تم اس لڑکی کو سمجھنے کی کوشش کرو یہ منگول بچوں کو شہری بنانا چاہتی ہے، یہ تمہیں پڑھا لکھا کر بزدل بنا دینا چاہتی ہے، اس بات کی بھی کوشش کرے گی کہ تم یورتوں کے شہر سے نکل کر کسی ایسے شہر میں جا بسو جہاں اونچے اونچے پکّے مکانات ہوتے ہیں، جہاں کے رہنے والے جھوٹ بولتے ہیں اور اپنے قول اور فعل میں مطابقت نہیں رکھتے!"

شور و غل سن کر ماریہ بھی آ گئی اور اس نے خود پر لگائے جانے والے الزامات کی تردید نہیں کی، وہ تاشی کے روبرو ڈٹ کر کھڑی ہو گئی، اور کہنے لگی۔ "تمہارا نانا چنگیز خان ایک بہت بڑا آدمی تھا، یہ بڑے لوگ کہیں کہیں بس اتفاق سے پیدا ہو جاتے ہیں، اس نے گھوڑے کی پشت پر بیٹھے بیٹھے جب آدھی دنیا فتح کر لی تو چین کے عقل مندوں نے اسے یہ مشورہ دیا کہ خان! تم نے جن ممالک کو گھوڑے کی پشت پر بیٹھ کر فتح کیا ہے، ان پر گھوڑے کی پشت سے حکومت نہیں کر سکتے۔ چنگیز خان عقل مند انسان تھا۔ اس نے داناؤں کی یہ بات مان لی اور قراقرم سے اپنے مفتوحہ علاقوں پر حکومت کرنے لگا۔ میں یہی بات آغانی خان سے کہوں گی کہ وہ اور اس کی نسلیں ہمیشہ یورتوں میں نہیں رہ سکتیں۔"

تاشی نے غصّے میں ماریہ کو دھکا دے دیا۔ ماریہ، شہری لڑکی اس کے دھکے کی تاب نہ لا کر دور تک لڑکھڑاتی چلی گئی اور اس کا سر یورت کے بانس سے زخمی ہو گیا۔ میں نے تاشی کو مارنے کے لئے ہاتھ اٹھایا ہی تھا کہ یورت میں ہلاکو خان اور اس کی بیوی دوقوز خاتون داخل ہو گئے ہلاکو خان نے مجھے دھکا دے کر ایک طرف کر دیا اور مجھے ملامت کرنے لگا، اس نے درشت لہجے میں کہا۔ "آغانی خان! تو تاشی کو کس طرح مار سکتا ہے جب یہ تیری ماں رہ چکی ہے۔" پھر اپنی بیوی کی طرف اشارہ کرتا ہوا بولا۔ "دوقوز! میری بیوی ہے لیکن بیوی بننے سے پہلے یہ بھی میری ماں تھی۔ شب کی خلوتوں اور تعیشی لمحات میں یہ میری بیوی ہوتی ہے

دن کے اجالے میں اور فکر یہ لمحات میں یہ میری مشیر ہوتی ہے، یہ سمور کے فرش پر میرے برابر بیٹھتی ہے، اور اس کی عقل پر میرا تصرّف اور اختیار ہوتا ہے، کیا تاشی کو تو نے اس کے حقوق ادا کر دیے؟"

میرے جواب دینے سے پہلے ہی تاشی نے احتجاجاً کہا۔ "خان! یہ ناصری کی بیٹی آغانی خان کو ورغلاتی رہتی ہے، یہ کہتی ہے کہ آغانی کو شہروں میں رہنا چاہیئے یہ ہماری زندگی کو جانوروں اور درندوں کی زندگی قرار دیتی ہے اور خان! تمہیں خانِ اعظم چنگیز خان کا

نوں تو یاد ہوگا کہ ہم میں سے جو بھی بچھڑ کر کہیں اور جا بسے گا۔ اس کا حشر اس پتھر جیسا ہو گا جو گہرے پانی میں جا گرے یا اس تیر جیسا جو کہیں اونچی اونچی گھاس میں گم ہو جائے، وہ نیست و نابود ہو جائے گا!"

ہلاکو خان نے تائید میں سر ہلایا اور کرائیت قبیلے کی دوقوز خاتون بھی تاشی کی حمایت میں زور زور سے گردن ہلانے لگی!

ماریہ یورت کے ایک کونے میں بیٹھ کر رونے لگی، پھر وہاں سے اٹھ کر اپنے چیلپ میں چلی گئی۔

ہلاکو خان اس لئے آیا تھا کہ وہ شیخ الجبال اور بغداد پر حملے کی تیاریاں مکمل کر چکا تھا اور روانگی سے پہلے وہ خانِ اعظم کے مدفن پر شاندار قربانی دینا چاہتا تھا دوقوز خاتون تاشی سے باتیں کرنے لگی، باتوں کے دوران جب دوقوز خاتون کو یہ پتہ چلا کہ ماریہ اپنے چیلپ میں گئی ہوئی ہے تو وہ بھی وہیں چلی گئی اور جب واپس آئی تو اس نے پہلا سوال کلثوم کی بابت کیا، پوچھا۔ "تاشی! کیا کلثوم مسلمان ساحرہ ہے؟"

تاشی نے جواب دیا۔ "وہ ساحرہ نہیں، میری کنیز ہے اور مسلمان بھی!"

دوقوز خاتون نے نفی میں گردن ہلائی، کہنے لگی۔ "تو مسلمانوں کو نہیں جانتی، یہ ساحر ہوتے ہیں!"

ہلاکو خان، دوقوز خاتون کے زیر اثر تھا۔ اس نے بھی بیوی کا ساتھ دیا اور مجھے حکم دیا۔ "آغانی خان! کلثوم کو میرے شامانوں کے روبرو پیش کرو وہ اس سے اس کے ساحرہ ہونے کا راز اگلوانے کی کوشش کریں گے کیونکہ اگر اس نے ہمارے یورتوں کے اندر ہی کوئی سحر کر دیا تو ہم اپنی نئی مہمات میں کامیابیاں کس طرح حاصل کریں گے!!"

تاشی نے جب یہ دیکھا کہ زمانے کی ہوا اس کے خلاف ہو چکی ہے تو اس نے مصلحت اندیشی سے خاموشی اختیار کر لی لیکن اسے اب یہ پورا یقین ہو چکا تھا کہ ساحرہ کلثوم نہیں، ماریہ ہے جس نے چیلپ میں دوقوز خاتون کو مسحور کر لیا تھا۔

تاجروں کا ایک قافلہ ہماری آبادی میں طرح طرح کی چیزیں بیچتا پھر رہا تھا ان کے پاس آگ جلانے کے پتھر، چینی ریشمی کپڑے، منقش چمڑے، چاندی کے ہار، اور خوبصورت جوتے ہماری دلچسپی کا باعث بن گئے تھے۔ منگول عورتیں انہیں نہایت شوق سے دیکھتیں اور جن میں خریدنے کی استطاعت تھی، اپنی پسندیدہ چیزیں خرید لیتیں، یہ تاجر ہمارے یورتوں کے آگے پیچھے آوازیں لگاتے گھومتے رہتے، ان سے تاشی اور ماریہ نے بھی کچھ چیزیں

خریدیں مجھے ان تاجروں سے سخت نفرت تھی، کیونکہ میرا تجربہ تھا کہ یہ لوگ بڑے دغاباز ہوتے ہیں، ہم انہیں ٹوپی کمر بند والے کہتے تھے۔

دریائے کیرولان اور دریائے تولا کے درمیان برخان کلدون (کوہستان قو اقتدار) کے جنوب میں خاقان اعظم منگو خان، ہلاکو خان اور اریق بوغا اپنے نویانوں ا ترخانوں (فوجی اور غیر فوجی عہدے دار) کے ساتھ جمع ہوتے ہیں وہ عظیم الشان کا درخت ہے جس کے نیچے ہمارا خان اعظم چنگیز خان نشست کی حالت میں دفن تھا ہمارے سامنے حدِ نظر تک انسان ہی انسان پھیلے ہوئے تھے، یہ اپنے سروں کو گردنوں ڈھانپ لینے والی چمڑے کی ٹوپیوں سے چھپاتے اور سمور کے لبادوں سے سینے اور پی کو ڈھانپے ہوئے اِدھر اُدھر بھاگے پھر رہے تھے، ان کے پاجامے بھی چمڑے کے ان میں جو اعلا منصب کے مالک تھے ان کے لبادوں میں قیمتی جواہرات وغیرہ ہوتے تھے۔

ایک طرف ہزاروں جانور کٹے پڑے تھے اور ان کے بھونے جانے کا ا ہو رہا تھا۔ دوسری طرف ہزاروں چھکڑوں پر شراب کے مٹکے رکھے ہوئے تھے، ان کے باہر دو طرفہ آگ کے الاؤ روشن تھے، جن کے تیز تیز شعلے فضا میں لہرا رہے تھے، دھواں ایک چادر کی شکل میں اٹھ کر فضا میں پھیلتا جا رہا تھا۔ خاقان اعظم کے یورت پہلو میں ایک بہت بڑا یورت ایستادہ تھا جس میں چالیس سفید گھوڑے اور چالیس حسین لڑکیاں قید تھیں یہ لڑکیاں چین، ختا، ماوراء النہر، ایران اور ایشیائے کوچک کے شہروں سے لائی گئی تھیں، اور انہیں خان اعظم کے مدفن پر بطورِ نذر پیش کرنا تھا

یہ موسم بہار کے ایام تھے، ہوا میں خوشگوار خنکی تھی، قربانی کی رسم سے گھوڑ دوڑ ہوئی۔ جس میں لڑکوں تک نے حصہ لیا اور بارہ میل کا چکر کاٹ کر خان اِ مدفن کو بوسے دیئے پھر خاقان اعظم کے حکم سے ڈھول تاشے بجنے لگے، میں ہلاکو خان ساتھ گھوڑوں اور حسین عورتوں کے یورت کی طرف بڑھا۔ خاقان اعظم اپنی بیوی تانی کے ساتھ اپنے یورت کے در پر کھڑا ہماری نگرانی کر رہا تھا۔ ہماری بیویاں بھی کے در پر کھڑی ادائیگی رسم کا تماشا دیکھ رہی تھیں، میں اور ہلاکو خان جب گھوڑوں ا لڑکیوں کو یورت سے لے کر باہر نکلے تو گرد و پیش اتنا ہجوم بڑھ چکا تھا کہ خاقان کے حکم پر انہیں ڈنڈے مار مار کر راستے سے ہٹانا پڑا۔ چالیس آدمی چالیس گھوڑ لگامیں پکڑے آہستہ آہستہ چل رہے تھے، ان کے پیچھے حسین لڑکیاں تھیں، ان کے

اور دہشت سے سفید پڑ گئے تھے، اور ان کے پیروں میں اتنی طاقت بھی باقی نہ رہی کہ خود سے وہ چل سکتیں، ہمارے طاقت ور سپاہی انہیں بالوں سے پکڑ کر گھسیٹ تھے، شدتِ کرب اور خوفِ مرگ سے وہ بین کر رہی تھیں، ان کی پنڈلیوں اور ایڑیوں سے بہہ رہا تھا۔ بعض مچل رہی تھیں اور کچھ خاموش تھیں، جو خاموش تھیں، وہ بے ہوش کی تھیں، آگے چل کر خاقان اعظم، اس کی بیوی قتوق تانی، ہلاکو خان کی بیوی دوقوز ن اور میری بیوی تاشی بھی ہم میں شامل ہو گئیں، ان میں خاقان اعظم اور اس کی سب سے آگے تھے۔ تاشی میرے قریب آئی تو میں نے اس سے پوچھا۔

"ماریہ کہاں ہے؟"

تاشی نے نفرت سے جواب دیا۔ "یورت میں!"

میں نے پوچھا۔ "وہ کیوں نہیں آئی؟"

تاشی نے جواب دیا۔ "وہ کہتی ہے کہ جاودانی نیلے آسمان نے منگولوں کو جسم اور غ عطا کئے تھے، انہوں نے جسم سے تو کام لیا اور دماغ کو زنگ لگا دیا۔ لیکن جن کے ن جسم کے ساتھ ہی دماغ بھی ہے وہ ان تقریبوں میں کس طرح حصہ لے سکتا ہے؟"

اگر قربانی کا مسئلہ نہ ہوتا تو میں اسی وقت ماریہ کے پاس جاتا اور اسے زبردستی کر آتا۔ میں نے تاشی کو چپ کرنے کے لئے کہا۔ "ماریہ کو اپنے علم اور عقل پر بہت غرور میں اس کا بہت اچھا جواب دوں گا!" پھر تاشی سے پوچھا۔ "کلثوم کہاں ہے؟"

تاشی نے جواب دیا۔ "یورت میں، میں اسے قصداً اپنے ساتھ نہیں لائی، جب تم پس چلوگے تو جاودانی نیلے آسمان کی برکت سے میں تمہیں ایک بہت اچھا تماشہ کھاؤں گی!"

ابھی میں کوئی جواب بھی نہ دے سکا تھا کہ ہلاکو خان میرے قریب آیا اور تاشی ے کلثوم کی بابت سوال کیا۔ تاشی سے یہ جاننے کے بعد کہ وہ یورت میں ہے، ہلاکو خان نے سختی سے کہا۔ "ہاں اس بات کا خیال رہے کہ وہ مسلمان ساحرہ کہیں فرار نہ ہو جائے۔ ل شامانوں کے روبرو اسے بھی پیش کر دیا جائے گا اور پھر کیا ہوگا یہ کوئی نہیں جانتا!"

تاشی نے ہلاکو خان سے کہا۔ "خان! کلثوم تنہا نہیں مرے گی، اس کے ساتھ ایک جان اور جائے گی!"

ہلاکو خان ہکا بکا رہ گیا وہ سمجھا تاشی خود بھی کلثوم کے ساتھ مرجانا چاہتی

ہے، بولا۔ "تو کیسی منگول زادی ہے، جو ایک ناپاک مسلمان ساحرہ کے ساتھ
چاہتی ہے!"

تاشی نے سرد مہری سے جواب دیا۔ "خان! تمہاری بات کا کل ہی جوا
دوں گی!"

خانِ اعظم چنگیز خان کی قبر ڈھلان پر واقع تھی، وہاں موٹی موٹی لکڑیوں
گرز نما ڈنڈے پہلے ہی سے مہیا کر دیے گئے تھے۔

خاقانِ اعظم آگے بڑھا اور اس کے حکم پر یکے بعد دیگرے چالیس گھو
ذبح کر دیے گئے، ان گھوڑوں کا خون بہہ بہہ کر صنوبر کی جڑ اور خانِ اعظم چنگیز خان
قدموں میں جمع ہونے لگا۔ گھوڑوں کی قربانی کے بعد ہم لوگوں کے روبرو چالیسوں ل
پیش کی گئیں۔ خاقانِ اعظم نے ایک لڑکی کو گلے سے پکڑ کر اٹھایا تو وہ قربانی کے جان
طرح بدکنے لگی لیکن طاقتور خاقان نے اسے دونوں ہاتھوں سے دبوچ لیا اور گلا دبا
لڑکی کا جسم تھر تھرانے لگا، اور وہ دونوں پیر گھسنے لگی، اس کی دونوں آنکھیں ابل ک
آ گئیں، اور زبان دانتوں کے درمیان سے نکل کر پھنس گئی۔ خاقان نے پھر لٹکتا ہوا لا
خانِ اعظم کے پائنتی گھوڑوں کے خون کے گڑھے میں پھینک دیا۔ لڑکی کا سر خون کے
میں چلا گیا اور بقیہ حصہ اوپر رہ گیا، وہ اوندھے منہ پڑی ہوئی تھی۔ خاقانِ اعظم
پر گرز نما ڈنڈے بردار آگے بڑھا اور ڈنڈے کی ضربوں سے اس کی ریڑھ کی ہڈیاں
لگا۔ چند ہی ضربوں میں وہ لڑکی بغیر ہڈیوں کے لاشے کی طرح لجلجی سی ہو گئی۔

وہ لڑکیاں جنہیں قربان ہونا تھا خوف اور دہشت سے یا تو بے ہوش ہ
یا پھر نیم جان رہ گئیں اور اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھیں، ان سب کو یکے بعد دیگر
طرح قربان کر دیا گیا۔ قربانیوں سے فارغ ہو کر ہم اپنے یورتوں میں واپس پہنچے اور گو
خوری کا دور شروع ہوا لوگ گوشت کے ٹکڑے حلق کے نیچے اتارے چلے جا رہے تھے
زیادہ سے زیادہ کھانے کی ہوس تھی جب وہ بہت زیادہ کھا چکنے کے بعد یہ محسوس
کہ اب پیٹ میں گنجائش نہیں رہی تو وہ چپ چاپ یورت سے باہر نکل جاتے اور ر
کے پھر واپس آ جاتے اور پھر کھانے لگتے، کھانے کے بعد شراب کا دور چلا اور میں نے
تک پی لی کہ اپنے قدموں سے میں خانِ اعظم کے مدفن سے واپس نہ جا سکا، خاقا
اور ہلاکو خان کو بھی ان کے خدمت گار اپنے کاندھوں پر ڈال کر ان کی اقامت گا
تک لے گئے۔

دوسرے دن ہلاکو خان کئی شامان لے کر میرے یورت میں داخل ہوا۔ اس کی
ں دوقوز خاتون اس کے ساتھ تھی۔

ہلاکو خان نے مجھ سے پوچھا۔ "کلثوم کہاں ہے، شامان آ گئے ہیں، وہ اس کے ساتھ
نے نہ ہونے کی تصدیق یا تردید کریں گے!"

تاشی سینہ سپر ہو گئی۔ اس نے جواب دیا۔ "میں نے اسے ہٹا دیا ہے۔ جب میں
ریہ جانتی ہوں کہ وہ ساحرہ نہیں ہے تو خان تم شامانوں کو خواہ مخواہ لے آئے!"

ہلاکو خان نے ڈانٹ پلائی۔ "شیطان کی جنی! بکواس بند کر اور اس مسلمان
حرہ کو حاضر کر!"

دوقوز خاتون نے بھی بے مروتی اختیار کی، کہنے لگی۔ "میری ہمدردیاں بھی ماریہ
ساتھ ہیں کیونکہ وہ ایک چیپل رکھتی ہے اور اس میں ناصری کی تصویریں ہیں جس کی
عبادت کرتی ہے!"

میں نے بھی تاشی کو ڈانٹا اور اس سے کلثوم کا پتہ پوچھا۔ لیکن اس موقعے پر
شی کا اطمینان قابلِ داد تھا۔ وہ ذرا بھی پریشان نہ تھی۔ یورت کے بغلی حصے سے ماریہ بھی
لئی، وہ اپنے چیپل سے اٹھ کر آئی تھی۔ اس کا چہرہ اترا ہوا تھا، اس نے اداس اور سوگوار
ظروں سے مہمانوں کی طرف دیکھا اور تاشی کے پیچھے دبک کر کھڑی ہو گئی۔ ہلاکو خان اور اس
ساتھ آئے ہوئے شامان، کلثوم کے منتظر تھے۔

تاشی نے مڑ کر ماریہ کو تیز نظروں سے دیکھا اور کہا۔ "ماریہ! تم کیا کہتی ہو؟ کیا تم
ب بھی یہی کہتی ہو کہ کلثوم جادوگر ہے؟"

ماریہ نے بیان بدل دیا۔ بولی۔ "میں اپنے الفاظ واپس لیتی ہوں، کلثوم نہایت ہی
ک باز اور سچی عورت ہے مجھے اس کے بارے میں ذرا غلط فہمی ہو گئی تھی!"

دوقوز خاتون نے ماریہ کو درشت لہجے میں مخاطب کیا، بولی۔ "جب تو نے اس
سلمان زادی کو ایک بار ساحرہ کہہ دیا تھا تو تجھے آخر وقت تک اپنے بیان سے منحرف نہیں
ہونا چاہیے تھا!"

ماریہ نے افسردگی سے تاشی کی طرف دیکھا اور نظروں ہی نظروں میں سوالات کرنے
لگی کہ "تم کیا کہتی ہو؟ میں خاموش رہوں یا کچھ بولتی رہوں؟"

تاشی نے جواب دیا۔ "میں کچھ نہیں جانتی جس طرح تو نے اسے یورتوں کے شہر

میں منہ دکھلانے کے لائق نہیں رکھا، اسی طرح میں چاہوں تو تجھے خوار کر دوں!"

ماریہ نے پھر خوشامدانہ درخواست کی۔ "لوگو! سچ کہتی ہوں، ناصری نے فرما جو شخص تمہیں بیگار میں ایک میل لے جائے تم اس کے ساتھ خندہ پیشانی میل چلے جاؤ۔ اس مقدس قول کی روشنی میں، میں درخواست کرتی ہوں کہ کلثو کوئی سزا نہ دی جائے!"

لیکن ہلاکو خان کہاں ماننے والا تھا۔ وہ بدستور کلثوم کی طلبی پر مُصر تاشی نے تنگ آ کر حکم دیا کہ "کلثوم کو معزز خان کے روبرو پیش کر دیا جائے!" کے بعد درخواست کی۔ "خان! میں اپنے عقیدے کے اعتبار سے جو کچھ بھی وہ اپنی جگہ لیکن میں تم لوگوں سے ایک درخواست کروں گی، میرا خیال ہے تم اسے مان لوگے!"

ہلاکو خان نے کوئی جواب نہ دیا۔ تاشی کے حکم پر ایک عورت کلثو لینے چلی گئی۔

تھوڑی دیر بعد کلثوم اس طرح حاضر کی گئی کہ اس کے ساتھ ایک ا تھا۔ سرخ و سفید، دبلا پتلا بیس بائیس سالہ نوجوان، وہ جیسے ہی سامنے آیا اور کی اس سے نظریں ملیں وہ چیخ مار کر اپنے جیپل میں چلی گئی۔ تاشی مسکرا رہی ہلاکو خان، دوقوز خاتون اور میں، شامانوں کے ساتھ اس اجنبی کو حیرت اور سوال نظروں سے دیکھنے لگے۔

میں نے تاشی سے پوچھا۔ "تاشی یہ کون ہے؟"

"ایک تاجر اور ماریہ کا عاشق!" تاشی بہت خوش تھی۔ "یہ تاجر معلوم نہیں کہ سے ماریہ کو تلاش کرتا ہوا آیا۔ یہ اپنا سامان بیچنے کے بہانے کئی دن سے میرے یورت کے لگا رہا تھا، پھر میں نے اسے ماریہ سے باتیں کرتے دیکھ لیا۔ اتفاق کی بات ہے کہ یہ توجو زبان میں ماریہ سے باتیں کرتا تھا کلثوم اس سے اچھی طرح واقف ہے اور اسی نے مجھے بتایا کہ یہ نوجوان تاجر ماریہ کا عاشق ہے اور ماریہ کی تلاش میں یہاں تک ایک تاجر روپ میں آ گیا ہے۔ میں نے اسے دھوکے سے بلا کر ایک یورت میں قید کر دیا، اور میں خان سے انصاف کی طالب ہوں، اس اجنبی نے آغائی خان کی بیوی ماریہ کو ورغ اور یہاں سے نکال لے جانے کا منصوبہ بنایا کیا یاسا (چنگیزی قانون) میں اس جرم کی سزا نہیں!"

ہلاکو خان نے فکر میں ڈوب کر سر اٹھایا اور کلثوم سے پوچھا۔ "کیا تو اس اجنبی کی بان سے واقعی واقف ہے؟"

کلثوم نے اثبات میں سر ہلا کر جواب دیا۔ "خوب اچھی طرح!"

ہلاکو خان نے کہا۔ "اچھا تو اس نوجوان سے مسیح ناصری کی قسم دے کر پوچھ کہ کیا یہ واقعی ماریہ کے اغوا کی نیت سے یہاں آیا تھا!"

کلثوم نے شامی عربی میں اس نوجوان سے باتیں کیں، ہلاکو خان اور میں انتہائی توجہ سے کچھ نہ سمجھنے کے باوجود ان کی باتیں سنتے رہے کچھ دیر بعد کلثوم نے منگولوں کی زبان میں کہا۔ "معزز خان! یہ نوجوان اپنے جرم کا اقرار کرتا ہے!"

ہلاکو خان نے جھگڑا چکانے کے انداز میں شامانوں سے کہا۔ "ذرا تم لوگ کلثوم کا جائزہ تو لو کہیں یہ مسلمان ساحرہ چپکے چپکے ہم پر جادو تو نہیں کر رہی؟"

نوکیلی اور سفید داڑھی والا شامان کلثوم کی طرف بڑھا اور اس سے کہنے لگا۔ "لڑکی! اگر تو سب کچھ سچ سچ بتا دے تو یہ تیرے لئے بڑی اچھی بات ہوگی، بتا، کیا تو واقعی ساحرہ ہے؟"

کلثوم نے نفی میں سر ہلا کر جواب دیا۔ "میں ساحرہ نہیں ہوں!"

شامان نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ "تو جھوٹ بولتی ہے تو ساحرہ ہے!"

"میں جھوٹ نہیں بولتی، میں ہرگز ساحرہ نہیں!"

ہلاکو خان نے کہا۔ "کیا یہ جھوٹ ہے کہ تو نے ہمارے یورتوں پر جادو کر دیا ہے تاکہ جب ہم مسلمانوں سے جنگ کریں تو تیرا جادو مسلمانوں کا ساتھ دے اور ہمیں ہلاکتوں کا سامنا کرنا پڑے!"

کلثوم نے دلیری سے جواب دیا۔ "یہ مجھ پر سراسر تہمت ہے، اتہام ہے!"

شامان نے چمڑے کا تھیلا نیچے رکھ دیا اور اس میں سے ایک ہتھوڑا اور بہت ساری میخیں نکالیں، پھر کلثوم سے کہنے لگا۔ "یہ میخیں جادو کا اثر زائل کر دیتی ہیں اگر تو نے جادو کیا ہے اور خوف سے اقرار نہیں کر رہی تب بھی ہم پر یہ فرض ہے کہ ہم اپنا علاج جاری رکھیں!"

اس کے بعد دوسرے شامانوں کو حکم دیا کہ وہ فوراً آگے بڑھیں اور کلثوم کو نیچے گرا کر داب لیں، اس حکم کی فوراً تعمیل کی گئی۔ کلثوم پچھاڑ دی گئی۔ بڑا شامان ہتھوڑا اور چند میخیں لے کر کلثوم کے پیروں کے پاس جا کر کھڑا ہوا۔ اس نے ایک میخ کلثوم کے داہنے

پیر کے تلوے میں ٹھونک دی۔ کلثوم نے چیخ ماری اور زمین پر لوٹنے لگی۔ ہم لوگ بھی گھبرا گئے۔ اور کلثوم دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔ جب اس نے یہ اچھی طرح یقین کر لیا کہ شامان اسے جیتا نہ چھوڑیں گے تو اس نے زندگی کے لئے جھوٹ کا سہارا لیا ہلاکو خان سے سوال کیا۔

"خان! اگر میں سچ بول دوں تو کیا تم لوگ میری جان بخشی کر دو گے؟

ہلاکو خان نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

کلثوم نے جھوٹ موٹ کہہ دیا۔" ہاں میں بے شک ساحرہ ہوں اور میں نے ا‍ن کے پورتوں پر جادو کر دیا ہے؟"

ہلاکو خان کا چہرہ کھلا ہوا تھا اس نے سر کے ہلکے سے اشارے سے حکم دیا۔" سزا جاری رہے!"

دوسرے شامانوں نے کلثوم کو داب لیا اور بوڑھا نوکیلی داڑھی والا شامان اپنے ہتھوڑے کی ضربوں سے میخیں ٹھونکتا رہا۔ اس کے دونوں پیر، دونوں ہاتھ اور ٹھوڑی کے نیچے میخیں ٹھونک دی گئیں، کلثوم اس طرح چیخیں مار مار کر رو رہی تھی جیسے ذبح ہونے والی بکریاں ممیاتی ہیں، ابھی کلثوم کا دم بھی نہ نکلا تھا کہ ہلاکو خان نے نیا حکم دیا۔" کلثوم کو کس چمڑے کے تھیلے میں سی دیا جائے!"

اسی وقت شامانوں نے چمڑے کے تھیلے کو خوب صاف کیا اور اس میں کلثوم کو سبزی کی طرح ٹھوس دیا، پیر اور ہاتھوں کی ہڈیاں آڑے آ رہی تھیں، شامانوں نے انہیں توڑ دیا اور تھیلے میں بند کر کے اس کا منہ سی دیا اور پھر اس تھیلے کو ہلاکو خان ہی کے حکم پر تالاب میں ڈبو دیا گیا۔ اب ہم سب کلثوم کے سحر سے محفوظ ہو گئے تھے۔

اب اجنبی تاجر، ماریہ کے عاشق کی باری تھی، میں آگے بڑھا اور اس کے منہ پر ایک طمانچہ رسید کر دیا۔

میں نے پوچھا" نوجوان تاجر! کیا وہ الزام جو تجھ پر لگایا گیا درست ہے؟"

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

میں نے ہلاکو خان سے کہا۔" یہ اگر واقعی ماریہ کا عاشق ہے تو اسے ہماری زبان ضرور آتی ہو گی، کیونکہ ماریہ بھی ہماری زبان جانتی ہے!"

ہلاکو خان نے جواب دیا۔" یہ مہذب لوگ جھوٹے بہت ہوتے ہیں، مکار اور عیار!"

میں نے اجنبی تاجر سے پھر سوال کیا۔" تجھ پر ناصری کی رحمتیں نازل ہوں، کیا

...ی کی قسم کھا کر سچ نہیں بول سکتا!"

تاجر کچھ پسیجا۔ میں نے پھر کہا۔" کیا تو واقعی ماریہ سے محبت کرتا ہے اگر یہ بات ہے تو میں تجھے یقین دلاتا ہوں کہ تو سب کچھ سچ سچ بتا دے ہم راست گوئی پر تجھے بہت بڑا انعام دیں گے!"

تاجر نے پوچھا۔" کیسا انعام؟ کون سا انعام؟ کیا تم لوگ ماریہ کو میرے ...ے کر دو گے؟"

"شاید!" میں نے جواب دیا۔" اگر تو ہمیں یہ یقین دلا سکے کہ تو نے جو کچھ کہا وہ سچ ...ز شاید میں اپنی ماریہ بھی تیرے حوالے کر دوں!"

نوجوان تاجر میرے دام میں پھنس گیا۔ کہنے لگا۔" ماریہ میری منگیتر ہے۔ جب تم یہاں لٹتے ہو، میں بیت المقدس گیا ہوا تھا۔ وہاں میں نے ناصرے میں بیت اللحم کی زیارت اور پھر حضرت مسیحؑ کی قربان گاہ گلگتا چلا گیا جب واپس آیا تو اس سانحے کا علم ہوا میں اسی نیت سے آیا تھا کہ کسی طرح اسے یہاں سے نکال لے چلوں لیکن قسمت میں ناکامی تھی۔" پھر تاشی کی طرف اشارہ کرتا ہوا بولا۔ اس ذلیل عورت نے معلوم نہیں کس ...ے ہمارے ارادوں کو بھانپ لیا۔ آج میں گرفتار تم سب کے سامنے کھڑا اپنی موت منتظر ہوں!"

ہلاکو خان نے دوقوز خاتون کی طرف دیکھا کہ وہ اس مسیحی عاشق کے لئے کیا سزا دیر کرتی ہے کیونکہ دوقوز خاتون عیسائیوں کی طرح عبادت کرتی تھی اور مسلمانوں کے مقابلے ...ا ناصریوں کے ساتھ اس کا ترجیحی سلوک رہتا تھا۔

تاشی بھی اس کی نیت بھانپ گئی۔ اس نے احتجاج کیا۔" خان! اگر اس تاجر کی ...بت انصاف سے کام نہ لیا گیا تو میں یہ مقدمہ خاقان اعظم کے پاس لے جاؤں گی، خاقان اعظم ...م سب کی عزت آبرو کا محافظ اور جان و مال کا مالک ہے!"

دوقوز خاتون نے ناصری سے سوال کیا۔" اگر تجھے چھوڑ دیا جائے تو کیا تو یہاں سے ...یشہ کے لئے چلا جائے گا؟"

ناصری نے نفی میں گردن ہلا دی۔

تاشی نے نیا مسئلہ اٹھایا۔ بولی۔" ماریہ کو بھی یہیں بلا یا جائے اور اس مقدمے کی کارروائی اس کے سامنے ہونی چاہیئے!"

میں نے بھی تائید کی، اور بھاگ کر حیلی میں داخل ہو گیا۔ میں سخت مشتعل تھا اور

اگر ہلاکو خان اور دوقوز خاتون آڑے نہ آتے تو میں ماریہ کی سخت پٹائی کرتا۔ چنانچہ
چیپل میں یہ ارادہ کرکے داخل ہوا تھا کہ ماریہ کو بالوں سے پکڑ کر گھسیٹتا ہوا باہر لاؤں
میرے پیچھے دوقوز خاتون بھی پہنچ گئی اور با آواز بلند کہا۔ "چیپل میں نہ تو کسی پر ظلم کیا
سکتا ہے نہ کسی کو سزا دی جا سکتی ہے بہتر ہے کہ ماریہ کو نرمی سے چلنے کا حکم دیا جائے
میں نے غصے میں جواب دیا۔ "میں ناصری نہیں ہوں اس لئے مجھ پہ یہ واجب
نہیں آتا کہ میں چیپل کا احترام کروں!"
پیچھے سے ہلاکو خان کی تحکمانہ آواز سنائی دی۔ "خارش زدہ کتے کی اولاد! دو
خاتون تیری مالکہ ہے جیسا یہ کہتی ہے اس پر عمل کر۔"
میں نے ماریہ کو گدی سے پکڑ لیا اور کھینچ کر باہر لے آیا۔ میں نے اسے اس
عاشق کے روبرو کھڑا کر دیا اور ہلاکو خان اور اس کی بیوی سے کہا۔ "خان! یہ میرا مجرم
یاسا کا قانون میں بھی جانتا ہوں، اپنے مقدمے کا فیصلہ میں خود کروں گا اور سزا بھی
خود دوں گا!"
ہلاکو خان نے ماریہ کے رخسار پر طمانچہ رسید کیا اور مجھ سے کہا۔ "آغا بی!
تیرا بڑا بھائی ہوں، کیا تو یہ سمجھتا ہے کہ میں انصاف نہیں کر سکوں گا۔ یورتوں کا شہر قراقرم
اور انصاف ہی کی وجہ سے تو آباد ہے کیا یہاں کا کوئی بھی شخص یہ پسند کرے گا کہ اس
کو ظلم اور ناانصافی سے تباہ و برباد کرا دیا جائے۔ مقدمے کا فیصلہ میں کر دوں گا، فیصلے
عمل درآمد تو کرے گا!"
ہلاکو خان کے طمانچے نے ماریہ کے گال سے خون سا چھلکا دیا۔ دوقوز خاتون کو
سے ہمدردی تھی، آگے بڑھ کر تسلی دی، اور کہا۔ "ماریہ! تو اپنے عاشق سے کہہ کہ وہ تیرے
عشق سے دستبردار ہو جائے میں ناصریوں کا احترام کرتی ہوں، خان میرے کہنے سے تیرے
کو معاف کر سکتا ہے!"
لیکن ہلاکو خان نے دوقوز خاتون کو بھی ڈانٹ دیا۔ "دوقوز! کیا تو نے یہ
بات نہیں سنی کہ قراقرم حق و انصاف کی سرزمین ہے یہاں یاسا کے قانون کے مطابق
کیا جائے گا۔"
تاشی ابھی تک خاموش تھی۔ اس نے پہلی بار دوقوز خاتون کی کھلم کھلا مخ
کی، کہنے لگی۔ "تو نے کلثوم کو بلاوجہ ساحرہ قرار دے کر قتل کرا دیا تو خواہ مخواہ ناصریوں
اور مسلمانوں کی مخالفت کرتی ہے اگر تو یہ سمجھتی ہے کہ جادو والی نیلا آسمان ناصریوں کے

پھر خاقان اعظم کو مجبور کر کہ وہ بھی یاسا کو چھوڑ کر ناصری ہو جائے!"
ہلاکو خان نے دونوں عورتوں کو ڈانٹا۔ "تم دونوں ہماری مائیں تھیں لیکن اس
ہم دونوں تمہارے شوہر ہیں، اس لئے ہم تمہیں حکماً خاموش رہنے کی تاکید کرتے ہیں!"
ہلاکو خان کے حکم سے سرتابی!! کس کی مجال تھی جو کرتا۔ دونوں چپ ہو گئیں۔
ہلاکو خان نے مجھے حکم دیا کہ ماریہ کے عاشق ناصری کو میں جس طرح چاہوں ہلاک
کرتا ہوں۔
تاشی کی خوشی اور ماریہ کی غم سے چیخیں نکل گئیں، میں نے منصف ہلاکو خان اور
خاتون کو عزت سے بٹھایا اور انہیں گھوڑی کا دودھ پیش کیا۔ وہ دونوں دودھ
میں محو ہو گئے۔ میں نے دو تلواریں نکالیں اور ناصری سے دریافت کیا۔ "کیا تجھے لڑائی
آتی ہے؟"
اس نے انکار میں گردن ہلا دی۔
میں، ماریہ، تاشی اور ناصری کو ساتھ لے کر یورت سے نکلنے لگا اور ہلاکو خان سے
"اگر تم دونوں چاہو تو باہر نکل کر اس ناصری کا حشر دیکھ سکتے ہو!"
وہ دونوں فوراً نہیں اٹھے، میں نے ایک تلوار ناصری کے حوالے کی اور دوسری اپنے
ہاتھ میں لے کر اس کے مقابل کھڑا ہو گیا: میں نے اسے حکم دیا ــــــــ "ناصری! تو مرد
اس لئے میں چاہتا ہوں کہ تو مجھ سے مقابلہ کر، تیری موت تو یقینی ہے لیکن میں تجھے
مردانہ وار موت کی دعوت دیتا ہوں!"
میرا خیال تھا کہ وہ کم ہمت ناصری تلوار نہیں اٹھائے گا لیکن اس نے تلوار اٹھا لی
اس کے اس رویے پر میں حیرت زدہ بھی ہوا اور پریشان بھی، وہ تلوار لے کر تاشی اور ماریہ
کی طرف، الٹے قدموں ہٹا، میں یہ سمجھا کہ وہ دونوں کے پیچھے پناہ کی تلاش میں جا رہا ہے لیکن
اس نے خلاف توقع ماریہ کو زخمی کر دیا یہ محض اتفاق کی بات تھی کہ ہلاکو خان اس وقت یورت
سے باہر نکل رہا تھا اور اس نے ناصری کی کنپٹی پر گھونسا مار کر گرا دیا۔ ماریہ کا شانہ زخمی ہو گیا
تھا وہ چیخ مار کر یورت میں چلی گئی۔ میں بے ہوش ناصری پر درندے کی طرح ٹوٹ پڑا۔
اس کے بعد اس کے ناک کان کاٹ لئے، اس کی انگلیاں، اس کی زبان
کھینچ ڈالی، مجھے یہ معلوم تھا کہ وہ مرا نہیں، بلکہ بے ہوش ہے اس لئے میں اس کے ہوش
میں آنے پر تڑپنے تھرکنے کا منظر دیکھنا چاہتا تھا بلکہ ماریہ اور تاشی کو بھی دکھانا
چاہتا تھا۔

ہلاکو خان اور دوقوز خاتون واپس چلے گئے۔ میں نے اندر جا کر ماریہ کے
دوا لگائی اور دولتوں کو لے کر باہر آ گیا۔ ماریہ نے غیر معمولی صبر و ضبط کا ثبوت دیا
ہوش میں آتے ہی آہیں بھرنے لگا اور اس کا جسم قربان کئے ہوتے جانور کی طر
تھر کنے لگا۔ ماریہ نے شاید جبر کے ساتھ یہ منظر دیکھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ شاید اپنے
عاشق کے قاتلانہ رویے سے بہت ناخوش تھی اور تلوار کے گھاؤ نے اس کے دا
ناصری کی محبت بھاپ کی طرح اڑا دی تھی۔

مسلمانوں کا سب سے بڑا بادشاہ مغرب کے کسی بغداد نامی شہر میں عید
میں مشغول تھا۔ ہلاکو خان ایک لاکھ بیس ہزار فوج لے کر شاہراہ ریشم سے چل پڑا۔
بیوی دوقوز خاتون بھی اس کے ساتھ تھی اور اس کا چھوٹا سا چیل بھی ساتھ چل
تاشی اور ماریہ بھی میرے ساتھ تھیں، تاشی نے ماتھے کے بال مونڈ دیے تھے او
گوندھ لی تھی، ہمارے بیشتر یورت سفید اون کے تھے، ان کا ڈھانچا لکڑیوں کا ہ
سفید اون کا یورت منڈھ دیا گیا تھا۔ یہ بھی دا گاڑیوں پر لاد دیے گئے، گاڑیو
پہیوں کا درمیانی فاصلہ، دونوں ہاتھوں کے پھیلانے سے جو فاصلہ بنتا ہے اس سے
گنا زیادہ تھا۔ ایک ایک یورت کو بیس بیس یا تیس یا بتیس بیل کھینچ رہے تھے
دریاؤں کے حائل ہونے کی صورت میں اونٹ گاڑیاں بھی ساتھ رکھی گئی تھیں تاکہ
کو عبور کرنے کے لئے یورتوں کو اونٹ گاڑیوں پر منتقل کیا جا سکے۔ ہماری عورتیں او
ان یورتوں میں یک جا تھے، یورتوں کے اندرونی سطح پر طرح طرح کی تصویریں بنی
انگور کی بیل، چڑیاں، گھوڑے، اونٹ اور تبت کے یاک کی تصویریں یقیناً ہماری
کے دل بہلا رہی ہوں گی۔

خاقان اعظم اور دوسرے معزز لوگ ہمیں رخصت کرنے کے لئے گھو
بیٹھ کر ساتھ ساتھ چلے، یہاں تک کہ ہم لوگ اپنی آبائی چراگاہ میں داخل ہو گئے
ہمیں دور ہی سے یاک کی نو دموں والا پرچم زمین پر گڑا ہوا دکھائی دیا۔ اس پر
ہمارے خان اعظم چنگیز خان کی عظیم سولدہ (روح) حلول کر چکی تھی اور اس سے
اور مدد حاصل کئے بغیر ہم آگے کس طرح بڑھ سکتے تھے، خاقان اعظم، پرچم کے
پہنچ کر گھوڑے سے اتر پڑا اس کی پیروی میں ہم لوگ بھی گھوڑوں کی پشت سے
گئے۔ خاقان اعظم نے اپنے بھائی ہلاکو خان کو حکم دیا۔ "پرچم کو بوسہ دے کر

ستدعا کر!"
ہلاکو خان نے حکم کی تعمیل میں پرچم کو بوسہ دیا اور گردن کو اکڑا کر دعا مانگی۔
خان کی عظیم سولدہ! کیا تو ہمیں دیکھ رہی ہے؟ کیا تجھے یہ نہیں معلوم کہ ہم کہاں جا رہے
کیا ہم نے تیری آخری آرام گاہ کے قدموں میں چالیس گھوڑوں اور چالیس حسین
ں کی قربانی نہیں دی ہے؟"
ہلاکو خان کو اپنے سوالات کے جواب درکار تھے، خاقان اعظم نے اور دو کے تین
ت گار طلب کئے اور ہلاکو خان کو حکم دیا کہ انہیں تلوار کے ایک ایک وار سے قتل کر دے
اس طرح کہ ان کا خون پرچم کی جڑ کی زمین میں جذب ہونے لگے، ہلاکو خان کے لئے یہ
نہایت معمولی کام تھا۔ اس نے یکے بعد دیگرے تینوں کو یاک کے نو دموں والے پرچم
ینٹ چڑھا دیا، اس کے بعد ان کی نظریں اوپر آسمان پر اٹھ گئیں وہ فضا میں دھندلی
ملی سیاہی مائل پہاڑی چوٹیوں کے اوپر کسی چیز کو تلاش کر رہے تھے، اچانک اونٹ
ہان جیسی ایک چوٹی کے پیچھے سے ایک عقاب نمودار ہوا اور اڑتا ہوا ان کے سر دی
گیا۔ اس نے ادھر ادھر منڈلا کر کئی چکر لگاتے اس کے بعد غوطہ مار کر نیچے آ گیا۔
کتے لرزتے لاشوں پر جھپٹا مارا اور ذرا دیر بعد وہ پرچم پر بیٹھ کر آدمیوں کی
وں کا شمار کرنے لگا۔
خاقان اعظم نے مبارک باد دی۔ "تیری قربانی قبول ہوئی ہلاکو خان! اب تو
انوں کے آخری قلعے تک بڑھتا چلا جا اور وہاں شیخ الجبال کو قطعی معاف نہ کرنا، جب تو
کے گھونسلوں جیسے قلعے تباہ و برباد کر چلے تو شیخ الجبال کو میرے پاس بھیج دینا۔ اور وہاں
کے دربار میں نصیر الدین طوسی نامی ایک عقل مند انسان بھی موجود ہے، اسے عزت و
رام سے میرے پاس بھیج دینا۔ اور یہ یاد رکھنا کہ سانپوں کو مار کر ان کے بچوں کی طرف سے
فلت برتنا بے وقوفی ہے، جب تو سانپوں کو کچل چکے تو ان کے بچوں کو بھی کچل دینا اور اس
قطعی پرواہ نہ کرنا کہ ان کے بہت سارے بچے پنگوڑوں میں اپنے انگوٹھے چوس رہے
لگے تو تو ان کے ملک میں عذاب بن کر داخل ہوگا اور پنگوڑوں کے بچوں تک سے ہرگز
رت اور رحم دلی نہ برتنا!"
ہلاکو خان نے تعمیل حکم کا وعدہ کر لیا۔
اس کے بعد ہم شاہراہ ریشم سے کاشغر کی طرف روانہ ہو گئے، ہمارا سفر کوئی معمولی
سفر نہ تھا۔ ایسا لگتا جیسے بہت بڑا شہر مشرق سے مغرب میں محو سفر ہے۔ شکار کھیلتے گھوڑوں

کو اچکاتے کدلاتے مہینوں سفر کرتے رہے، جب ہم تیان شان سے گذر رہے تھے، (تاشی)
نے مجھے بلایا۔ وہ ٹکٹکی باندھے اپنے شہر کی طرف دیکھ رہی تھی، مجھ سے کہنے لگی
واپسی میں تم مجھے ایک بار میرے شہر میں لے چلو گے؟"
میں نے وعدے کے طور پر اپنی گردن ہلا دی۔
دوران سفر ہی ماریہ کے لڑکا پیدا ہوا۔ دوقوز خاتون اور ہلاکو خان نے مجھے
دیا کہ "اسے سفری چیپل میں لے جاؤ اور بپتسمہ دو!"
ماریہ کی بھی یہی خواہش تھی، میں نے اس پر عمل کیا۔ ماریہ نے کہا "میں
بچے کو تعلیم دلاؤں گی، علم سکھاؤں گی، اور عقل مند بناؤں گی۔ اور اسے ایسی زندگی کا
کروں گی جو اونچے اونچے پختہ مکانوں میں پائی جاتی ہے!"
میں نے اسے ڈانٹ دیا۔ "چپ رہ کتیا! بھلا بھیڑیے کو بکری کی طرح باڑے میں
طرح باندھ سکتی ہے تو؟!"
ماریہ نے کہا۔ "یہ میرا بچہ ہے کیا اس پر میرا کوئی حق نہیں؟"
میں نے کہا۔ "یہ میرا بچہ ہے۔ اس پر میرا حق مقدم ہے!"
تاشی نے جل کر کہا۔ "ایک عقاب کو کبوتر کس طرح بنایا جا سکتا ہے، عقاب
عقاب ہی رہے گا!"
ماریہ نے بھی غصے میں جواب دیا۔ "تو چپ رہ بے اولادی! تجھے کیا پتہ کہ
اور عقاب کو کبوتر کس طرح بنایا جا سکتا ہے، یہ طریقہ میں جانتی ہوں!"
اس کے بعد ماریہ کا یہ طریقہ ہو گیا کہ جب بھی میں، اس کے پاس جاتا وہ
تشدد، رحم، دنیا کی بے ثباتی اور تہذیب و ثقافت پر بات کرتی رہتی اور بھاری
دلیلوں سے مجھے قائل کرنے کی کوشش کرتی، میں بھی کچھ کچھ قائل ہو جاتا لیکن اسی
مجھے خانِ اعظم کا قول یاد آ جاتا کہ، جو بھی اپنے قبیلے سے جدا ہو گا۔ اس کی مثال
پتھر جیسی ہو گی جو گہرے پانی میں ڈوب گیا ہو، یا پھر اس تیر جیسی جو لمبی لمبی گھا
نہیں گم ہو جاتے!
تاشی ہمیشہ ماریہ کی مخالفت کرتی، اسے اپنے صحرا اور اس کے رسم و رواج
گہری دلچسپی تھی، ایران میں ہر طرف اونچی اونچی عمارتیں اور چوڑی چوڑی سڑکیں
ماریہ بے قابو ہونے لگتی، وہ چیپل میں بیٹھ کر معلوم نہیں کیسی کیسی دعائیں مانگتی
جس سے تاشی نے ماریہ پر یہ الزام لگا دیا کہ ماریہ بھی ساحرہ ہے اور معلوم نہیں کس

ڈنے میں مشغول رہتی ہے۔ ہلاکو خان اور دوقوز خاتون چونکہ ہم عیسائی تھے اس لئے
ریہ کی طرفداری کرتے رہتے، میں ابھی تک نصرانیت سے عاری تھا اور نہیں چاہتا تھا کہ
ایک مذہب کو اختیار کر کے دوسرے مذاہب کے خداؤں کو ناراض کر لوں!
ہم اپنی راہ کی مزاحمتوں اور آبادیوں کو تہ و بالا کرتے ہوئے اصفہان تک پہنچ
جس کے مغرب میں، لبنان تک شیخ الجبال کے گھونسلے نما قلعے بکھرے ہوئے تھے،
و خان نے شیخ الجبال کو حکم بھیجا کہ "خود کو ہمارے حوالے کر دو، ورنہ اگر تم نے جنگ کی ٹھانی
س کا انجام جو کچھ ہو گا نہ تمہیں معلوم ہے نہ ہم جانتے ہیں!"
یہاں ہم نے جنگ سے پہلے خوب عیش کئے، یہیں ہم پر یہ انکشاف بھی ہوا کہ
رانی، مسلمانوں سے بار بار شکستیں اٹھانے کے بعد اب ہمارے زیر سایہ آنے کے لئے بے
ب تھے، روزانہ سو پچاس عیسائی آتے، اور مخبری اور جاسوسی کے لئے اپنی خدمات پیش
رتے لیکن ہلاکو خان کی تمنائیں بہت زیادہ تھیں، اس نے ماریہ کے لئے ایک بوڑھا
دری فراہم کر دیا اور ہمیں بتایا کہ "یہ ماریہ اور اس کے بچے کو ذہنی اور اخلاقی تربیت
ے گا!"
اب ماریہ کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔

شیخ الجبال سے کوئی مقابلہ نہ ہوا، یہ نصیر الدین طوسی اور دوسرے آدمیوں کے ساتھ
صلح کی غرض سے حاضر ہوا۔ ہلاکو خان نے اسے قید کر دیا اور نصیر الدین طوسی سے خوش اخلاقی
سے پیش آیا اسے معلوم ہوا تھا کہ طوسی آسمانوں کے علوم جانتا ہے اور آنے والے حالات اور
واقعات کا علم اسے پہلے ہی ہو جاتا ہے، ہلاکو خان کو یہ عجیب و غریب انسان اچھا لگا اور
اس نے اسے اپنے ساتھ ہی رکھ لیا اس کے بعد ہم لوگ شیخ الجبال کے گھونسلوں میں گھس
گئے۔ انہی میں وہ مشہور قلعہ بھی تھا جو الموت کہلاتا تھا۔ الموت دراصل آلہ الموت تھا۔
کیونکہ وہاں کی مقامی زبان میں آلہ نشیمن کو اور الموت عقاب کو کہتے تھے جس کا مطلب تھا
عقاب کا نشیمن، ہلاکو خان ان عجیب و غریب قلعوں میں گھومتا پھرا اسے یہ معلوم تھا کہ شیخ
الجبال کے فدائی بڑے خطرناک ہوتے ہیں اور یہ کہیں اور کسی وقت بھی اپنے دشمن کا کام تمام
کر سکتے ہیں احتیاط کے طور پر وہ اپنے گرد و پیش منگولوں کا حفاظتی دستہ رکھتا۔ یہاں کے
خزانوں کو اپنے قبضے میں کر لینے کے بعد اس نے اپنی سپاہ کو حکم دیا کہ یہاں کی پوری آبادی
کو تہ تیغ کر دیا جائے کیونکہ اسے خاقانِ اعظم نے بھی یہی حکم دیا تھا۔ اس حکم کی تعمیل پوری

سفاکی سے ہوئی جب قتل ہونے والوں کی چیخ و پکار سے پہاڑی چٹانیں گونجیں اور بازگشت نے شور و غل میں تواتر اور تسلسل پیدا کر دیا تو ہلاکو خان پر خوشی کا دورہ وہ دیر تک قہقہے لگاتا رہا۔ ہم نے ماؤں سے ان کے بچے چھین لیے اور انہیں ننھی منی سے پکڑ کر چٹانوں پر دے مارا۔ ہم نے ہنگوڑوں سے چیختے چلاتے بچے نیزوں میں چھید کر اچھال لئے، ہمارے ساتھی عیش کرتے پھر رہے تھے کیونکہ یہاں کی حسین و جمیل عورتیں نوخیز لڑکیاں ہمارے اختیار اور تصرف میں تھیں، گھوڑی کے دودھ اور شراب کی توانائی میں گیارہ عورتوں اور لڑکیوں کو ریوڑ کی طرح اپنے یورت میں ہنکا لایا اور ماریہ اور تاشی موجودگی میں انہیں کچلتا روندتا رہا۔ وہ دونوں ایک فاتح قوم کے فاتح مرد کو اس کے سے کس طرح محروم کر سکتی تھیں۔ انہوں نے چہروں پر مسکراہٹ پیدا کر کے مجھے باد پیش کی۔

یہیں ہلاکو خان کے روبرو چند ایسے نوجوان بھی پیش کئے گئے جن پر بغاوت کا الزام لگایا گیا تھا اور جو بڑے پیمانے پر جنگ کرنے کے لئے اپنے آس پاس آدمیوں کی جمیعت اکٹھا کر رہے تھے، ہلاکو خان نے ان کے لئے ایک گہرا گڑھا کھدوایا اس کے نوجوانوں کے ہاتھ پیر باندھ کر گڑھے میں دھکیل دیا گیا۔ اور ان گڑھوں کو دوبارہ بند کر دیا گیا۔ بس ایک طرف ذرا سا سوراخ البتہ رکھا گیا جس سے ان نوجوانوں کی چیخیں گھٹ کر نکل رہی تھیں اور ایسا لگتا تھا جیسے کہیں بہت دور کچھ لوگ چیخ چلا رہے ہوں، ہلاکو ہنستا رہا۔ قہقہے لگاتا رہا اس کی بیوی دوقوز خاتون بھی بہت خوش تھی۔ ایسے تماشے کہاں دیکھنے کو ملتے ہیں!!!

ہلاکو خان نے ہمدان میں قیام کیا اور شیخ الجبال کو قراقرم بھیج دیا نصیر الدین طوسی اپنی زبان آوری اور عقل مندی سے ہلاکو خان کا وزیر اور مشیر بن گیا۔ اس نے ہلاکو کو بغداد پر حملہ کرنے کی ترغیب دی اور یہ یقین دلایا کہ یہ صرف اس کی خواہش نہیں، خلیفہ کا وزیر ابن علقمی اور بغداد کی رعایا بھی یہی چاہتی ہے، ہلاکو خان مجھے پہلی بار ذرا متامل نظر آیا اس نے جواب دیا "میں سر دست کوئی بڑا خطرہ نہیں مول لینا چاہتا کیا عباسی خلافت اتنی کمزور ہو گئی ہے کہ وہ ہمارے آگے سرنگوں ہو جائے؟"

نصیر الدین طوسی نے جواب دیا۔ "مجھے آسمانوں کے فیصلے کا علم ہے وہاں خلافت عباسی کے زوال اور اختتام کا فیصلہ صادر ہو چکا ہے اور خوش بختی اور اقبال مندی ستاروں کی چالیں تمہارے حق میں ہیں!"

ہلاکو خان نے پوچھا۔ "کیا تیرے، خلیفہ کے وزیر ابن علقمی سے تعلقات ہیں؟"

طوسی نے جواب دیا۔ "ہاں، میں اس سے خط و کتابت کر رہا ہوں!"

ہلاکو خان نے کہا۔ "تو ابن علقمی کو لکھ دے کہ وہ خلافت کی افواج کم کر دے اور جو فوج موجود ہے، اس کا بیشتر حصہ اِدھر اُدھر سرحدوں پر روانہ کر دیا جائے۔ اس کارروائی کے بعد میں بغداد پر حملہ کروں گا!"

طوسی نے اسی دن ابن علقمی کو ہلاکو خان کی طرف سے ایک خط لکھ دیا اور جب یہ خط ہلاکو خان کو پڑھ کر سنایا جا رہا تھا میں مشیروں میں موجود تھا۔ اس نے ابن علقمی کو لکھا تھا۔

"کتابوں کے رسیا اور مال و دولت کے دلدادہ اور حریص خلیفہ کو فوج کی کمی پر آمادہ کرو اس کو سمجھاؤ کہ فوجوں پر بڑی دولت خرچ ہو رہی ہے، جس کا کوئی فائدہ نہیں، خلافت کا رعب اور دبدبہ ہی اتنا زیادہ ہے کہ دشمن اِدھر آنکھ اٹھانے کی ہمت تک نہیں کر سکتا۔"

فوج کی تنخواہیں اب تک خزانے سے دی جا رہی تھیں، اب یہ نیا طریقہ جاری کرو کہ سپاہی اپنی تنخواہیں بازار میں چل پھر کر محاصل سے حاصل کیا کریں، اس طرح شہر بدنظمی کا شکار ہو جائے گا اور رائے عامہ خلیفہ کے خلاف ہو جائے گی جس سے ہمیں فائدہ پہنچے گا۔

دیکھو یہ ایک بہترین موقع ہے جس سے خلافتِ عباسی کا خاتمہ اور خلافتِ علویہ کا قیام عمل میں آ سکتا ہے، اور ہم مصر میں خلافتِ فاطمیہ کے عباسیوں کے ہاتھوں خاتمے کا انتقام لے سکتے ہیں، یہی تو وہ لوگ ہیں، جن کے آبا و اجداد نے مصر کی خلافت فاطمیہ کو ختم کر کے عباسی خلافت میں ضم کر لیا تھا۔

اس خط و کتابت سے میں نے یہ اندازہ لگا لیا کہ بغداد پر حملہ کرنے میں ابھی دیر ہے، میں نے سوچا کہ چلو کچھ دن عیش ہی کر لیا جائے۔ شیخ الجبال کی رعایا میں کمی کیا ہے! عورتیں اور لڑکیاں میرے یورت میں موجود ہی تھیں، میں کچھ دنوں کے لئے یورت ہی میں بند ہو گیا اور خون خرابے اور قتل و غارت گری سے طبیعت میں جو یکسانی اور بے کیفی سی پیدا ہو گئی تھی، اس کے اثرات کم کرنے لگا۔ تاشی تو خیر منگول تھی لیکن مجھے پہلی بار ماریہ کے کردار کی عظمت کا اعتراف کرنا پڑا۔ وہ شہری ہونے کے باوجود نہایت صبر و شکر اور خندہ پیشانی سے رنگ رلیوں اور عیش کوشیوں میں شریک و معاون رہی، میں نے ماریہ

کا شکریہ ادا کیا کیونکہ میرے دل پر اس کے ایثار اور خاموشی کا بڑا اثر تھا۔ جواب میں ماریہ نے عجیب سی بات کہی، اس نے کہا۔ "میں نے سرکش نفس کو قابو میں کر لیا ہے تم لوگ روحانی بیماری میں مبتلا ہو، اصل خوشی یہ نہیں ہے کہ تم مال و دولت جمع کر کے رنگ رلیاں منانے لگو بلکہ سچی خوشی اس میں ہے کہ نفس کا سرکش گھوڑا قابو میں کر لیا جائے اور دوسروں کی خوشیوں کو اپنی مرضی کے خلاف گوارا کر لیا جائے!"

میں نے پوچھا۔ "کیا تجھے اپنا ناصری عاشق کبھی کبھی یاد آتا ہے؟"

اس نے جواب دیا۔ "کبھی بھی نہیں، ناصری نے مجھے تیرے حوالے کر دیا ہے اب میں زندگی بھر تیری وفادار رہوں گی؟"

میں نے خوش ہو کر کہا۔ "ماریہ! تو سچ مچ اس لائق ہے کہ تیری بات غور سے سنی جائے اور تیرے مشوروں پر عمل کیا جائے!"

اس نے کہا۔ "خان! تیری طرح میں بھی دل رکھتی ہوں کیا تو میری معمولی خواہش پوری کر سکتا ہے؟"

میں نے کہا۔ "بے شک، بول، کیا چاہتی ہے؟"

ماریہ نے کہا۔ "میں کھیتوں کی سیر کرنا چاہتی ہوں، باغات میں گھومنا پھرنا چاہتی ہوں، اونچی اونچی شاندار عمارتوں کو اندر سے دیکھنا چاہتی ہوں!"

میں نے ہنس کر جواب دیا۔ "یہ کون سا مشکل کام ہے، آج اس شہر کی ہر چیز ہمارے قبضے میں ہے!"

تاشی نے مخالفت کی، جھنجھلا کر کہنے لگی۔ "خان! ہوشیار، چالاک ماریہ تجھے فتح کرنی چاہ رہی ہے!"

میں نے تاشی کو ڈانٹ دیا لیکن اس وقت مجھے یہ کہاں معلوم تھا کہ صحرا کے رہنے والوں کو کھیتوں، پکے مکانوں اور باغات کی آب و ہوا راس نہیں آتی۔

میں ماریہ کو لئے ہوئے کھیتوں کے پاس سے گزر رہا تھا۔ ماریہ نے لہلہاتی فصل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ "خان! کیا تمہیں معلوم ہے کہ اس اناج کی تمہیں کتنی ضرورت رہتی ہے؟"

"معلوم ہے، بہت زیادہ، لیکن ہم اناج کی جگہ جانور بھی تو کھا سکتے ہیں؟"

ماریہ نے کہا۔ "تم یہی تو نہیں جانتے کہ اناج کے ایک دانے سے ہزار دانے پیدا کئے جاسکتے ہیں، لیکن ایک جانور سے ہزار جانور نہیں پیدا کئے جاسکتے، اور پھر ۳۱ حقیقت کو کس طرح جھٹلا سکتے ہو کہ انسان ہمیشہ جانور ہی پر زندہ نہیں رہ سکتا!"

میں نے بے بسی سے پوچھا۔ "آخر تو کہنا کیا چاہتی ہے؟"

اس نے جواب دیا۔ "وہ لوگ جو انسان کے لئے غلہ پیدا کرتے ہیں ہم سب کے لئے لائق احترام ہیں، ہمیں ان کا شکر گزار اور احسان مند ہونا چاہیئے، تم ہلاکو خان سے کہو انہیں قتل کر کے وہ محسن کشی سے باز رہے!"

میں نے اسے بالوں سے پکڑ کر ایک جھٹکا دیا اور درشت لہجے میں کہا۔ "بے وقوف عورت! تو ہمیں سرکشی کہہ رہی ہے کیا تجھے معلوم ہے اگر تیری باتیں ہلاکو خان سن لے تو وہ تجھے اس کی کیا سزا دے گا؟"

ماریہ نے پرسکون لہجے میں جواب دیا۔ "میں سزا سے نہیں ڈرتی، سچ بات کہنے ہی کے لئے ہوتی ہے، پھر میں چپ کیوں رہوں!"

میں نے اسے دھکیل دیا اور کہا۔ "لیکن خبردار جو تو نے یہ باتیں تاشی یا کسی اور منگول کے سامنے دہرائیں؟"

اس کے بعد میں اسے لے کر ایک ایسی عمارت میں داخل ہوا جہاں سے کچھ عجیب و غریب بو اٹھ رہی تھی، ایک لمبی داڑھی والا مسلمان ہمارے قریب آیا اور اس نے دہشت زدہ آواز میں پوچھا۔ "معزز خان یا خاتون کو کیا مرض لاحق ہو گیا ہے، کیا وہ یہاں علاج کی غرض سے آئے ہیں؟"

میں نے اس بوڑھے کی داڑھی مٹھی میں دبالی اور ہلکے ہلکے جھٹکے دے کر دریافت کیا۔ "یہاں کیا ہوتا ہے اور تم کون ہو یہاں کیا کرتے ہو؟"

بوڑھے نے آہستہ سے کہا۔ "جناب میری داڑھی تو چھوڑ دیں۔ یہ رسول اللہ ﷺ کی سنت ہے، اس کی بے عزتی تو نہ کریں۔"

میں داڑھی، رسول اللہ ﷺ کی سنت اور بے عزتی وغیرہ کا صحیح مطلب نہ سمجھ سکا اور داڑھی سے بدستور کھیلتا رہا۔ آخر جب بوڑھے نے یہ یقین کر لیا کہ اس کی داڑھی یوں نہیں چھوٹے گی تو اس نے جواب دیا۔

"جناب میں ایک طبیب ہوں اور یہ جگہ شفا خانہ ہے یہاں مریضوں کا علاج کیا جاتا ہے، جڑی بوٹیوں کے تجربے کئے جاتے ہیں!"

میں نے کہا۔ "بوڑھے! کیا تیرے پاس ہر مرض کا علاج موجود ہے؟"

اس نے جواب دیا۔ "موت کے سوا ہر مرض کی دوا موجود ہے اور موت کسی بھی مرض

کی شکل میں آ سکتی ہے!"

میں نے اس کی داڑھی چھوڑ دی اور اسے حکم دیا کہ وہ ہمیں پورا شفا خانہ گھما پھرا کر اچھی طرح دکھلائے!

یہ عمارت تقریباً پچیس چھبیس کمروں پر مشتمل تھی، اس کے بیشتر کمروں میں جڑی بوٹیوں اور دوائیوں کا ذخیرہ تھا۔ جن کی ملی جلی بو اور خوشبو سے کمرے مہک رہے تھے، اس نے کئی ایسی دوائیں بھی دکھائیں جو تلوار یا تیر کے گھاؤ کے لئے تیر بہدف تھیں، یہیں میں نے وہ آلے بھی دیکھے جن کے ذریعے دواؤں کا عرق کشید کیا جاتا تھا۔ مجھے انسان کی عقل مندی اور خوش تدبیری پر بڑا تعجب ہوا۔ ماریہ یہاں کی ایک ایک چیز نہایت غور سے دیکھ رہی تھی، بوڑھے نے ہماری ضیافت کرنا چاہی، جسے میں نے درشتی سے مسترد کر دیا۔

ماریہ نے مجھ سے سوال کیا۔ "خان! بحیثیت مجموعی دنیا کو جتنے خانوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے، ان میں دو نہایت خاص اور ممتاز ہیں، ایک وہ خانہ جس میں جنگجو رہتے ہیں، دوسرا وہ جس میں معالجین رہتے ہیں!"

میں نہیں سمجھ سکا کہ ماریہ کہنا کیا چاہتی ہے، میں اس غیر معمولی عاقلہ کی صورت دیکھنے لگا۔

اس نے سوال کیا۔ "وہ لوگ جو انسان کو قتل کر دیتے ہیں، اور موت کے فرشتے جن کے ہمرکاب رہتے ہیں، بہتر ہیں یا وہ لوگ جو مرتے والوں کو زندگیاں بخشتے ہیں اور انسانی مصائب اور دکھوں کا علاج کرتے ہیں، انسان کو دوبارہ زندگی بخشتے ہیں؟"

میں نے نادانی سے جواب دیا۔ "یہ تو کھلی بات ہے کہ زندگیاں چھیننے والوں سے بخشنے والے عظیم ہوتے ہیں!"

"یہی میں بھی کہتی ہوں!" ماریہ جلدی سے بولی۔ "یہ لوگ جو دواؤں اور جڑی بوٹیوں سے ہمارا علاج کرتے ہیں تمہارے محسن ہیں انہیں قتل کر کے تم محسن کشی کر رہے ہو؟"

میں نے ایک بار پھر اس کے بال پکڑ لئے اور ہلکا سا جھٹکا دے کر اس کا چہرہ اپنے سامنے کر لیا اور پیار سے کہا۔ "شریر عورت! آخر تو کہنا کیا چاہتی ہے؟"

ماریہ نے جواب دیا۔ "صرف یہ کہ میری اولادیں قراقرم میں نہیں رہیں گی، شہروں میں رہیں گی، پڑھیں گی لکھیں گی اور انسانیت کی خدمتیں کریں گی!"

"لیکن میں خود قراقرم جاؤں گا!" میں نے اس کے بال چھوڑ دیئے۔ "میں صحرا کا

آدمی شہروں میں کس طرح رہ سکتا ہوں؟"

ماریہ آبدیدہ ہو گئی، اداس آواز میں کہنے لگی۔ "لیکن میں تمہیں نہیں چھوڑ سکتی کیا تم میری خوشی کی خاطر قراقرم نہیں چھوڑ سکتے، میری خاطر، اپنی اولاد کی خاطر؟"

میں نے جواب دیا۔ "تو مجھے ورغلا رہی ہے لیکن پھر بھی اگر میں تیری اور تیری اولاد کی خاطر شہر میں رہ پڑوں تو کیا تو کبھی کبھی میرے ساتھ قراقرم آتی جاتی رہے گی!"

ماریہ نے جواب دیا۔ "مجھے منظور ہے! لیکن میں شیطان زادی تاشی سے ڈرتی ہوں جو تمہیں ورغلا کر قراقرم واپس لے جائے گی!"

میں نے کہا۔ "تیرا ڈر فضول ہے آغائی خان کے دل پر کسی کی بھی حکومت نہیں یہ اپنے دل کا مالک ہے جو چاہے کرے۔ چاہے تو صحرا میں رہے اور چاہے تو شہر میں رہے!"

اور اس کے بعد ہم دونوں نے یہ فیصلہ کیا کہ بغداد کی تسخیر کے بعد اپنے حصے کا خزانہ اور مال و دولت لے کر ہم دونوں کسی دور دراز علاقے میں چلے جائیں گے، اور باقاعدہ شہری زندگی اختیار کر لیں گے۔ معلوم نہیں کیوں یہ شہری لوگ مجھے واقعی محسن نظر آنے لگے تھے۔ لیکن صحرائی سرشت مجھ میں تذبذب اور ہچکچاہٹ پیدا کر رہی تھی۔

ابن علقمی، وزیر خلافت عباسی اور طوسی کے درمیان، عرصے تک خط و کتابت جاری رہی اور آخر کار ابن علقمی خلافت کی فوج میں تخفیف اور طوسی کی تجاویز پر عمل درآمد کرانے میں کامیاب ہو گیا۔ اب ہلاکو خان بغداد پر حملہ آور ہونے کے لئے پوری طرح تیار تھا۔ اس نے احتیاطاً موصل کے حکمران بدرالدین سے منجنیقیں اور ہتھیار طلب کئے بدرالدین کو جو سفارت بھیجی گئی تھی اس کا سردار میں تھا۔ میں سات آدمیوں کے ساتھ والی موصل بدرالدین کے دربار میں پہنچ گیا اور ہلاکو خان کا رقعہ اس کے حوالے کر دیا۔

میں نے زبانی عرض کیا۔ "موصل کے حکمران! ہم غیر معمولی لوگ ہیں، جاودانی نیلے آسمان کی قوتیں ہمارے ساتھ ہیں، ہم تیرے ظالم اور غیر منصف خلیفہ مستعصم باللہ پر قہر خداوندی بن کر نازل ہونے والے ہیں کیا مصلحت اندیشی اور پیش بندی کا یہ تقاضہ نہیں ہے کہ تو منجنیقوں اور ہتھیاروں سے ہماری مدد کر، تیری خدمت کا صلہ ہم یوں دیں گے کہ ہم تجھ سے کوئی تعرض نہ کریں گے اور تو موصل پر بدستور حکمرانی کرتا رہے گا!"

ابھی ہماری گفتگو کسی نتیجے پر نہ پہنچی تھی کہ لمبی لمبی عبا اور چغے والے دربار میں

داخل ہوتے، یہ محض اتفاق تھا کہ بغداد کے خلیفہ اور ہلاکو خان کے نمائندے اپنی اپنی ضرورتیں لے کر والیٔ موصل کے دربار میں ایک وقت میں داخل ہوتے۔

والیٔ موصل پریشان ہو گیا کہ وہ ہم دونوں کو کس طرح راضی رکھے۔ پھر بھی اس نے احتیاطاً خلیفہ کے وفد سے دریافت کیا۔ "آپ لوگ ہم سے کس قسم کی مدد کے طالب ہیں؟"

خلیفہ کے وفد کے سربراہ نے جواب دیا۔ "ہم آپ سے مدد نہیں چاہتے بلکہ امیرالمومنین نے ہمیں آپ کے پاس بہترین مغنیاؤں، سازندوں اور رقاصاؤں کے لئے بھیجا ہے، امیرالمومنین مطالعے کی کثرت سے غیر معمولی تکان محسوس کرنے لگے ہیں۔"

بدرالدین نے دعائیہ انداز میں ہاتھ اٹھائے اور کہا۔ "اسلام اور مسلمانوں کا خدا حافظ!"

اس کے بعد بدرالدین نے خلیفہ کے لئے گانے والیوں، سازندوں اور رقاصاؤں کے طائفے کا انتظام کیا اور ہمارے لئے منجنیقوں، اسلحہ جات اور دوسرے قلعہ شکن آلات کا انتظام کر دیا۔

ہلاکو خان نے کچھ عرصے بعد عباسی خلیفہ مستعصم باللہ کو چند سطری پیغام بھیج دیا۔ اس میں لکھا تھا۔

"تم جانتے ہو کہ دنیا کی مختلف قوتوں اور حکومتوں کا چنگیز خان کی مغل فوجوں کے ہاتھوں کیا حشر ہوا، بغداد کے دروازے خوارزمیوں اور سلجوقیوں کے لئے ہمیشہ کھلے رہے ہیں پھر کیا وجہ ہے کہ تم ہمارا استقبال نہیں کرتے اور ہم پر بغداد کے دروازے بند کر دیے ہیں لیکن ہم نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ ہم بغداد میں داخل ہو کر رہیں گے کیونکہ ہم طاقتور ہیں، دیکھو تم پرچم چنگیزی کے مقابلے پر آنے کا خیال کبھی دل میں نہ لانا ورنہ تمہاری خیر نہیں، اپنی سپاہ کے ہتھیار ہمارے حوالے کر کے ہم سے معافی اور رحم کے خواستگار ہو!"

حالات سے ناواقف اور غافل خلیفہ نے اس کا نہایت مختصر جواب دیا۔ "اگر مغل اپنے گھوڑوں کی نعلیں نکلوا دیں تو ہم بھی بغداد کے دروازے ان کے لئے کھول دیں گے اور ان کا شایان شان استقبال کریں گے!"

ہلاکو خان فرط غضب میں کھڑا ہو گیا اور جو وفد خلیفہ کا یہ جواب لے کر آیا تھا

اسے حقارت سے مخاطب کیا۔ کہا۔ "تم اپنے احمق خلیفہ سے کہہ دو کہ اب تمہاری خیر نہیں اور فالتو نعلیں تمہارے سروں میں ٹھونک دی جائیں گی!"

اس کے بعد بغداد کا محاصرہ کر لیا گیا۔ ہماری ایک لاکھ سے زائد فوج کے مقابلے میں خلافت کی بیس ہزار فوج صف آرا ہو گئی، اس دوران خلیفہ کا غدار وزیر ابن علقمی کئی بار ہلاکو خان سے ملنے آیا۔ چونکہ نصیرالدین طوسی اس کا ہم عقیدہ اور ہم مذہب تھا اس لئے وہ ہلاکو خان سے اپنے لئے امان نامہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ یہ دونوں خلافتِ عباسی کو ختم کر کے خلافتِ علویہ قائم کرنا چاہتے تھے۔

محاصرہ اور جھڑپیں پچاس دن تک جاری رہیں، اور جب ہماری افواج نے خلافت کی بیس ہزار فوج کو شکست دے کر منتشر کر دیا تو ایک دن ابن علقمی پھر ملنے آیا۔ ہلاکو خان نے پوچھا۔ "کیا خلیفہ اب بھی جنگ جاری رکھنا چاہتا ہے؟"

ابن علقمی نے جواب دیا۔ "اس کے مشیر اسے گمراہ کر رہے ہیں!"

طوسی نے مشورہ دیا۔ "تم خلیفہ سے کہو کہ میں نے تمہارے لئے مغل فاتح سے امان نامہ حاصل کر لیا ہے اور اگر تم مزید جنگ کئے بغیر مغل فاتح کے دربار میں پہنچ جاؤ تو وہ تمہیں بدستور حکومت کرنے کی اجازت عطا کر دے گا!"

سادہ لوح خلیفہ اس داؤں میں آ گیا اور اپنے بیٹے کے ساتھ ہلاکو خان کے دربار میں حاضر ہو گیا۔

ہلاکو خان نے سرد مہری سے پذیرائی کی اور خلیفہ کو حکم دیا۔ "تم اپنے ارکانِ سلطنت اور علماء و فقہا کو بھی یہیں بلا لو تاکہ سارے معاملات میں تمہیں ان کا تعاون اور مشورہ حاصل رہے!"

خلیفہ نے ایک خط کے ذریعے ان سب کو طلب کر لیا۔ جب وہ آ گئے تو انہیں جانوروں کی طرح ذبح کر دیا گیا۔ اس کے بعد ہلاکو خان نے خلیفہ سے کہا کہ۔

"تم اہل شہر کو یہ پیغام بھیج دو کہ وہ ہتھیار ڈال دیں اور نہتے شہر کے باہر آ جائیں۔"

خلیفہ نے اس حکم کی بھی تعمیل کر دی اور نہتے شہریوں کا جم غفیر بغداد سے ابل پڑا، ہماری فوج نے انہیں محاصرے میں لے لیا اور قتل و خون ریزی کا بازار گرم ہو گیا۔ پھر جمعہ کے دن، جو مسلمانوں کا مقدس دن ہے ہلاکو خان، خلیفہ کو لے کر بغداد میں داخل ہو گیا اور قصر خلافت میں قیام کیا، اس ہنگامہ دار و گیر میں ہلاکو خان کے سوا ساری شخصیتیں دب گئی تھیں۔ ہلاکو خان نے دربار منعقد کیا۔ جس میں نصیرالدین طوسی، ابن

علقمی، خلیفہ اس کا لڑکا اور ہم سب شریک ہوتے، دو قوتر خاتون اور ماریہ نے خلافت کو سرنگوں اور شرمسار دیکھ کر، بے پایاں خوشی کا اظہار کیا۔ پادری اسے اپنا نجات دہندہ قرار دینے لگے۔

ہلاکو خان نے خلیفہ کے ظلم وجبر کی تفصیل بتلاتے ہوئے درباریوں سے پوچھا۔ "بتاؤ کہ ایک غیر عادل مسلمان حکمران کے مقابلے میں عادل غیر مسلم حکمران کیا درجہ رکھتا ہے؟" اس نے طوسی اور ابن علقمی سے بطور خاص کہا۔ "تم دربار میں موجود مسلمان علماء سے فتویٰ لو اور مجھے اس فیصلے سے مطلع کر دو!"

دربار میں موجود علماء نے تامل اختیار کیا لیکن نصیر الدین طوسی آگے بڑھا اور باآواز بلند کہا۔ "میں بھی ایک مسلمان عالم ہوں، اور مجھے معلوم ہے کہ غیر مسلم، عادل حکمران، غیر عادل، مسلمان حکمران سے افضل ہے!"

اسی وقت ایک محضر نامہ تیار ہوا۔ جس میں دربار کے موجود علماء نے طوسی کے فتوے کی تائید میں اپنے اپنے دستخط کر دیے، خلیفہ خاموشی اور بے بسی سے یہ تماشا دیکھتا رہا۔

ہلاکو خان نے خلیفہ سے کہا۔ "ہم تمہارے مہمان ہیں، ہمارے لئے کچھ حاضر کرو!"

خلیفہ پر اتنی دہشت طاری تھی کہ وہ محل کی کنجیاں تلاش کرنے لگا لیکن وہ نہیں ملیں، مجبوراً تالے توڑ دیے گئے اور خلیفہ نے دو ہزار نفیس پوشاکیں، ہزاروں دینار اور سونے کے زیورات ہلاکو خان کی خدمت میں پیش کئے۔

ہلاکو خان نے تحقیر آمیز انداز میں ان چیزوں پر نظر ڈالی اور کہا۔ "یہ چیزیں اگر تم نہ دو تب بھی ہماری ہی ہیں، میں تو ان خزانوں کا پتہ پوچھ رہا ہوں جنہیں تم نے چھپا رکھا ہے۔"

ہلاکو خان نے خلیفہ کی پیش کردہ چیزیں میری طرف بڑھا دیں، کہا۔ "انہیں تقسیم کر لو!"

خلیفہ نے چھپے ہوئے خزانوں کا پتہ بتا دیا جو زمین میں دفن تھے۔ انہیں اسی وقت کھود کر نکال لیا گیا۔

خلیفہ کو محل میں قید کر دیا گیا اور کئی دن تک بھوکا رکھا گیا۔

میں دینار، پوشاکیں اور زیورات لے کر جب ماریہ کے پاس پہنچا تو وہ بہت

نی ہوئی، اس نے کہا۔ "ابھی تو اور بھی بہت کچھ ملے گا۔" پھر پاگلوں کی طرح چیخی۔ "اس
میرا تمہارا اور ہم دونوں کے بچوں کا شاندار مستقبل تعمیر ہوگا۔"
تماشی، ماریہ کا مفہوم نہ سمجھ سکی، کچھ نہ سمجھنے کے انداز میں ہم دونوں کی
درتیں دیکھتی رہی۔

ہلاکو خان، خلیفہ کی سزا کے سلسلے میں بہت متامل تھا، اسے بعض مسلمانوں نے باور کرا رکھا تھا کہ خلیفہ مسلمانوں کی مقدس ہستی ہے اگر اس کا خون بہا تو قیامت برپا ہو جائے گی۔ لیکن نصیر الدین طوسی اور ابن علقمی نے اس وہم کی تردید کر دی طوسی نے لاکو خان کو یقین دلایا کہ "یہ خیال غلط ہے کیونکہ خلیفہ علیؓ سے بڑا آدمی نہیں ہے جب ن کے خون نے قیامت برپا نہیں کی تو خلیفہ کی کیا حیثیت ہے؟"

ہلاکو خان نے پوچھا۔ "پھر ہمیں خلیفہ کو کس طرح ہلاک کرنا چاہیئے؟"

طوسی نے جواب دیا۔ "اسے نمدے میں لپیٹ کر محل کے ستون سے باندھ دیا جائے اور سپاہی لاتیں مار مار کر اسے ہلاک کر دیں، اس طرح خلیفہ کا خون بھی نہ بہے گا اور یہ اپنے انجام کو بھی پہنچ جائے گا!"

ہلاکو خان نے نحیف ونزار اور بھوک سے بے حال خلیفہ کو اپنے روبرو طلب کیا، خلیفہ نے نحیف آواز میں کہا۔ "میں بھوکا ہوں۔ کھانا، کھانا!"

ہلاکو خان نے چند آدمیوں کو مخصوص لب ولہجے میں حکم دیا۔ "خلیفہ کی پسندیدہ غذا فراہم کی جائے!"

ذرا سی دیر میں کئی سربند خوان خلیفہ کے سامنے رکھ دیئے گئے خلیفہ نے جھپٹ کر خوان پوش اٹھا کر ایک طرف پھینکے اور طشت میں ہاتھ ڈال دیا لیکن وہاں کھانے کی جگہ ہیرے جواہرات رکھے ہوئے تھے۔

ہلاکو خان نے ظالمانہ انداز میں حکم دیا۔ "انہیں کھاؤ!"

خلیفہ نے بے بسی سے کہا۔ "انہیں میں کس طرح کھا سکتا ہوں!"

ہلاکو خان نے طنزاً کہا۔ "بے وقوف حکمران! جس شے کو تو کھا نہیں سکتا اس کا ذخیرہ کیوں کیا۔ کیا تو اس سے ایک شاندار فوج نہیں تیار کر سکتا تھا جو تری بغداد کی اور تمام مسلمانوں کی حفاظت کا کام انجام دیتی۔"

خلیفہ کے ہوش وحواس بجا نہ تھے، جواب دیا۔ "خدا کی مرضی ہی یہ تھی کہ میں اس حال کو پہنچوں!"

ہلاکو خان نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا۔ "خدا کی مرضی کا بقیہ حصہ بھی بہم پہنچایا جائے۔"

مستعصم باللہ کو نمدے میں لپیٹ دیا گیا، بے بس اور بھوک کے پیاسے خلیفہ نے معمولی سی مزاحمت کی، لیکن طاقتور آدمیوں نے اسے بے بس کر دیا وہ چیختا چلاتا رہا لیکن نمدا گولائی میں لپیٹ دیا گیا اور خلیفہ کا پورا جسم اس میں غائب ہو گیا۔ اس کے بعد ابن علقمی آگے بڑھا اور اپنی نگرانی میں اس نمدے کو ستون سے بندھوا دیا۔ نصیر الدین طوسی نے ابن علقمی سے کہا۔ "بسم اللہ، بڑھو اور لاتوں کی ضربات سے اس کا کام تمام کر دو!"

ابن علقمی ہنستا ہوا آگے بڑھا اور اچھل اچھل کر لاتیں مارنا شروع کر دیں، خلیفہ کا بیٹا یہ عبرت ناک منظر کچھ دیر تو دیکھتا رہا پھر آنکھیں بند کر کے فرش پر بیٹھ گیا۔ جب ابن علقمی تھک گیا تو چند سپاہیوں کو حکم ملا کہ وہ اپنی طاقتور ضربات سے خلیفہ کا کام تمام کر دیں، کئی کئی سپاہی باری باری آگے بڑھتے اور نمدے کو لاتوں کی ضربات پہنچا کر واپس آجاتے۔ جب ہلاکو خان کو یہ یقین ہو گیا کہ خلیفہ مر چکا ہو گا تو اس نے نمدے سے خلیفہ کی لاش باہر نکلوائی، اس وقت خلیفہ سسک رہا تھا۔

ہلاکو خان کے حکم پر بھاری طاقتور اور فربہ اندام سپاہی آگے بڑھے اور ہنستے ہوتے خلیفہ کو پیروں سے روند ڈالا، خلیفہ کی شکل مسخ ہو گئی۔ اور دونوں رخسار دانتوں سے گزر کر آپس میں پیوست ہو گئے، دانت ٹوٹ کر الگ ہو گئے اور پسلیاں کئی کئی جگہوں سے ٹوٹ کر گوشت میں اتر گئیں۔

بغداد کے گلی کوچوں میں قتل عام جاری تھا۔ میں سابقہ گیارہ عورتوں اور لڑکیوں کو خوب اچھی طرح نار چکا تھا اس لئے اب ان کا رکھنا فضول تھا۔ میں نے انہیں گلا گھونٹ کر ہلاک کر دیا اور بغداد کی افراتفری سے دس نوخیز اور حسین لڑکیاں پھر ہانک لایا۔ میں نے بغداد کی لوٹ مار میں کافی دولت کمائی۔ قتل ہونے والوں کی لاشیں دجلہ میں پھینک دی گئیں، جس سے دریا کا پانی سرخ ہو گیا۔ اس کے بعد ہلاکو خان نے خلافت کے کتب خانے کو بھی دریا برد کر دیا یہ اتنا بڑا ذخیرہ تھا کہ اس سے دریا کا بند بن گیا، اور کتابوں کی سیاہی سے دجلہ کا پانی کالا ہو گیا۔ لوگ کہتے ہیں بغداد کی غارت گری میں آٹھ لاکھ مسلمان قتل ہوئے!

ماریہ عیسائی ہونے کے باوجود اس خون خرابے سے بہت بددل ہوئی، اور اس نے مجھے اس پر آمادہ کرنا چاہا کہ میں کسی دور دراز علاقے میں نکل چلوں، جہاں امن

آشتی کی زندگی گزاری جائے اور اولاد کو باقاعدہ تعلیم و تربیت دی جائے۔ میں تھوڑا بہت تو پڑھ لکھ چکا تھا۔ ماریہ مزید پڑھانا چاہتی تھی، میرا دل ماریہ کی بات ماننے میں متذبذب تھا۔ اس کے باوجود میں نے اپنے حصے کی دولت قبضے میں کی اور ماریہ کے بے حد اصرار پر اس کے ساتھ بیت المقدس چلا گیا۔ وہاں میں ناصرہ کے بیت اللحم پہنچا، جہاں مسیح پیدا ہوئے تھے اور مسیح کی ماں مریم اور مریم کے منگیتر یوسف نجار ان کی پرورش اور نگہداشت کرتے رہے تھے۔ پھر ہم لوگ گلگتا پہنچے جہاں مسیح کو تیس سال کی عمر میں مصلوب کیا گیا تھا، یہاں ماریہ پھوٹ پھوٹ کر روئی۔

یہاں میں نے ماریہ کو ایک گرجے میں چھوڑ دیا اور بہت ساری دولت اس کے حوالے کر دی۔ میں نے اس کا بچہ بھی اس کے پاس رہنے دیا۔ ایک دوسرا بچہ بھی آنے والا تھا۔ میں نے ماریہ سے کہا۔ "اگر لڑکا ہو گا تو اسے سپاہی بنانا کیونکہ پہلے لڑکے کی تعلیم و تربیت تیری مرضی کے مطابق ہو گی اور دوسرے کی میری مرضی کے مطابق۔ لیکن اگر لڑکی ہو تو اس کی تو مالک ہو گی!"

ماریہ رونے لگی، بولی۔ "میں تو یہ سمجھتی تھی کہ تم ہمیشہ کے لئے میرے پاس رہو گے لیکن تم پھر اسی صحرا میں واپس جا رہے ہو، جہاں انسان جانوروں کی طرح رہتے ہیں!"

میں نے جبر سے کام لیا ورنہ عام حالات میں، میں اس کی ناک پر مکا رسید کر دیتا۔ میں نے کہا۔ "ماریہ! اس وقت تو گرجے میں ہے اگر باہر ہوتی تو میں ایسی سزا دیتا کہ تو زندگی بھر یاد رکھتی۔"

ماریہ نے کہا۔ "آغائی خان! تم یہیں میرے پاس رک جاؤ اور اتنے ظالم نہ بنو!"

میں نے ہنس کر جواب دیا۔ "میں صحرا نہیں چھوڑ سکتا۔ تو یہیں رہ، میں پھر آؤں گا۔ اپنی اولادوں سے ملنے اور یہ دیکھنے کہ وہ کیسی نکلتی ہیں اور دنیا میں کیا نام پیدا کرتی ہیں!"

میں ماریہ کو چھوڑ کر واپس چلا آیا۔ تاشی نے ماریہ کی بابت پوچھا تو میں نے یہی جواب دیا کہ، وہ جس ماحول کی تھی اسے وہیں پہنچا آیا!

تاشی کے لئے یہ بڑی اچھی خبر تھی، بولی۔ "ان پڑھے لکھوں میں اپنی زندگی کس طرح گزار سکتی تھی بھلا!!"

میں تاشی اور کئی لڑکیوں کو لے کر قراقرم واپس چلا گیا۔

قراقرم میں انتشار پھیل چکا تھا۔ خاقان اعظم منگو خان مر چکا تھا اریق بوغا اور قبلائی خان میں خاقانی کا جھگڑا چلا جس میں قبلائی خان نے فتح پائی اور قبلائی خان قراقرم کے بجائے چین میں رہنے لگا۔ اور وہیں سے حکومت کرنے لگا۔ شاید میں ایمان کی طرف ہلاکو خان کے پاس پھر واپس چلا جاتا کیونکہ اب قراقرم میں خاک اڑنے لگی تھی لیکن مجھے معلوم ہوا کہ ہلاکو خان قراقرم واپس آتے ہوئے اپنے چچا کے بیٹے برقائی خان سے الجھ پڑا۔ برقائی خان قفقاز اور روس پر قابض تھا اور مسلمان ہو چکا تھا۔ اس نے ہلاکو خان کے مسلمان دشمنی کے اعمال پر سخت نکتہ چینی کی تھی اور اس سے جواب طلب کیا تھا کہ وہ بغداد کی تباہی، مسلمانوں کے قتل عام اور مساجد اور قرآن پاک کی بے حرمتی جیسے افعال قبیحہ کا کیوں مرتکب ہوا۔ ہلاکو خان نے جھنجلا کر اس پر حملہ کر دیا اور برقائی خان کے ہاتھوں اسے شکست فاش اٹھانی پڑی اور شاید اسی غم میں وہ چل بسا۔ سننے میں آیا ہے کہ ہلاکو خان کے مرنے کے بعد کئی حسین لڑکیاں بھی اس کے ساتھ زندہ دفن کر دی گئیں۔

اب قراقرم میں خاک اڑنے لگی تھی۔ قبلائی خان خاقان بن کر چین کے شہر شیانگ چو سے حکومت کر رہا تھا۔ جن لڑکیوں کو میں بغداد سے لے کر آیا تھا ان میں کئی مر کھپ گئیں اور چند بھاگ گئیں، تاشی پوری وفاداری سے میرا ساتھ دے رہی تھی خشک اور بے کیف زندگی نے جینا دوبھر کر دیا تھا۔ تاشی کے کوئی اولاد نہ تھی۔ میں نے جو کچھ پڑھا تھا اس نے میرے اندر ایک انقلاب بپا کر رکھا تھا۔ کئی بار ماریہ اور اس کی اولادیں یاد آئیں لیکن سردست وہاں پہنچنا میرے بس میں نہ تھا۔

پھر مجھ پر مرضوں نے یلغار کی، ہم میں گٹھیا کا مرض عام تھا۔ میں بھی اس کا شکار ہو گیا۔ بڑا علاج کیا لیکن قراقرم میں کوئی نامی طبیب نہ تھا۔ اس لئے صحیح علاج بھی نہ ہو سکا۔ پھر بخار نے آ دبایا اور میں روز بروز کمزور ہوتا چلا گیا یہاں تک کہ میں اپنی زندگی سے مایوس ہو گیا۔ ماریہ سے جدا ہوتے پچیس سال گزر چکے تھے اور مجھے یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ وہ زندہ بھی ہو گی یا مر چکی ہو گی، مجھے اپنے بچے یاد آئے، میں نے سوچا اگر وہ دونوں زندہ ہوں گے تو جوان ہو چکے ہوں گے۔ میرے دل میں ایک ہوک سی اٹھی اور یہ جی چاہا کہ کسی طرح اڑ کر بیت المقدس پہنچ جاؤں اور ماریہ اور اپنے بچوں

میں زندگی گزارنے لگوں، لیکن بیماری نے مجھے اتنا کمزور کر دیا تھا کہ میں اس کی طرف سے تقریباً مایوس ہو گیا تھا۔

اس صحرا میں تاشی کا میرے سوا کوئی بھی نہ تھا۔ اس کا اداس چہرہ بتاتا تھا کہ وہ میری زندگی سے مایوس ہو گئی ہے۔ میں اسے تسلی دلاسے دیتا رہتا لیکن وہ بچہ نہ تھی میری کسی بات کا اس پر کوئی اثر نہ ہوتا۔

گٹھیا کا درد اتنا پریشان کر رہا تھا کہ میری چیخیں نکل جاتیں، تاشی یہ سمجھی کہ میں مرنے والا ہوں، سوگوار میری بائیں جانب بیٹھ گئی اور رو کر دریافت کیا۔ "خان! تم مجھے کس کے رحم پر چھوڑ جاؤ گے؟"

میں اس وفادار عورت کو غور سے دیکھنے لگا اور کوئی جواب نہ دیا۔

اس نے پھر پوچھا۔ "آغائی خان! تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔ تمہارے بعد میں کہاں رہوں گی؟"

میں نے سنجیدگی سے پوچھا۔ "کیا تم میرے بغیر زندگی کو موت تصور کرو گی؟"

"ہاں خان! میری زندگی تم ہو اور تم نہیں تو کچھ بھی نہیں!"

میں نے اشارے سے اسے قریب بلایا۔ جب وہ قریب آ گئی تو میں نے کہا۔ "میں نہیں چاہتا کہ تم میرے بعد کسی اور کے رحم و کرم پر رہو، تم میرے ساتھ چلو!"

"کہاں؟"

میں نے نیلے آسمان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "اس جاودانی نیلے آسمان کے اوپر، اس پار، جہاں ہماری روحیں مستقل قیام کرتی ہیں!"

تاشی نے میری آنکھوں میں کچھ پڑھ لیا تھا اس نے پھرتی سے پیچھے ہٹنا چاہا لیکن میں نے نہایت پھرتی سے سرہانے رکھا ہوا خنجر اٹھا کر اس کے پیٹ میں اتار دیا، وہ چیخ مار کر گر گئی۔ میں نے کہا۔ "میں نہیں چاہتا کہ تو یہاں میرے بعد بے آسرا بن کر رہے، میں جا رہا ہوں میرے ساتھ تو بھی چل!"

جسم کے جوڑوں میں اترا ہوا گٹھیا کا درد مجھے ہلنے جلنے کی بھی اجازت نہیں دے رہا تھا لیکن میں پھر بھی گھسل کر زخمی تاشی کے پاس پہنچا اور خنجروں کے کئی وار کر کے اس کا کام تمام کر دیا۔

اور بستر پر گر کر اپنی موت کا انتظار کرنے لگا۔

دھڑکتے دل سے میں گرجے میں داخل ہوا اور ایک نوجوان پادری سے دریافت کیا۔ "بیٹے یہاں ماریہ نامی بزرگ عورت رہتی ہے؟"

اس نے مجھے سر سے پیر تک بغور دیکھا اور پوچھا۔ "ان سے کیا کام ہے؟"

میں نے جواب دیا۔ "میں بہت دور قراقرم سے آیا ہوں، ان سے ملنے۔"

نوجوان مسکرانے لگا۔ اور مجھے لئے ہوئے خانقاہ کے ایک رہائشی حجرے میں لے گیا۔ وہاں ایک بڑھاپے کی حدود میں قدم رکھ دینے والی عورت کسی کتاب کے مطالعے میں مشغول نظر آئی۔ نوجوان پادری نے کہا۔ "ماں دیکھنا تو، یہ کون آیا ہے؟"

اس نے مجھے غور سے دیکھا اور پھر دوڑ کر بے ساختہ مجھ سے چمٹ گئی۔

"تم آگئے۔ آخر تم آگئے، میں جانتی کہ تم ضرور آؤ گے!"

میری آنکھیں بھیگ گئیں، میرا دل اندر سے نکلا پڑ رہا تھا۔ اور دماغ جھنجھنا رہا تھا۔ میں نے محبت سے اس کی پیٹھ تھپتھپائی اور کہا۔ "ماریہ! اب میں ہمیشہ کے لئے تیرے پاس آگیا ہوں، ہمیشہ ہمیشہ کے لئے۔"

ہم دونوں دیر تک آنسو بہاتے رہے، پھر ایک دوسرے کے آمنے سامنے بیٹھ گئے۔ میں نے پوچھا۔ "میرا بچہ کہاں ہے؟"

"کون؟ یعقوب؟" پھر نوجوان پادری کی طرف دیکھ کر مسکرانے لگی اور پادری سے کہا۔ "بیٹے! یہ تمہارے باپ آغائی خان ہیں!"

نوجوان پادری سرد مہری سے کھڑا رہا۔ ہلکی سی مسکراہٹ چہرے پر نمودار ہوئی اور پلک جھپکتے میں غائب ہوگئی۔

میں نے اسے اپنے سینے سے لگا لینا چاہا لیکن وہ وہاں سے چلا گیا۔ میرے دل پر ایک گھونسا سا لگا۔ میں نے کہا۔ "ماریہ! کیا تو نے اسے خوب اچھی طرح تعلیم تربیت دے دی ہے؟"

اس نے جواب دیا۔ "ہاں خوب اچھی طرح، کیوں، کیا تمہیں اب بھی کسی قسم کا شبہ ہے؟"

میں نے دکھ سے سوچتے ہوئے جواب دیا۔ "ہاں، یعقوب میں جوش و خروش نہیں ہے، محبت کا جوش، خلوص کا جوش!" پھر پوچھا۔ "اور وہ دوسرا بچہ؟ وہ لڑکا تھا یا لڑکی؟"

ماریہ نے کچھ سوچ کر جواب دیا۔ "وہ لڑکی تھی، جو چند مہینے زندہ رہ کر چل بسی!"

میں چپ ہو رہا۔ اور کچھ دیر بعد ماریہ سے کہا۔ "ماریہ! میں بیمار ہوں، مجھے گھٹیا نے ستا رکھا ہے!"

ماریہ نے کہا۔ "مت گھبراؤ، میں تمہارا علاج کراؤں گی، لیکن یہ تو بتاؤ کہ اب تم واپس تو نہیں جاؤ گے؟"

میں نے جواب دیا۔ "اب میں کہاں جاؤں گا۔ میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے یہاں آگیا ہوں!"

ماریہ نے جس طبیب سے میرا علاج کرایا وہ ایک نہایت خوش اخلاق نوجوان طبیب تھا۔ جس کے لئے، عرصے بعد یہ پتہ چلا کہ وہ میرا ہی بچہ تھا۔ وہی بچہ، جسے ماریہ نے لڑکی کہہ کر فوت شدہ بتا دیا تھا۔ ماریہ یہ جھوٹ اس لئے بولی تھی کہ وہ اسے میری ہدایت اور خواہش کے مطابق سپاہی نہیں بنا سکی تھی، اس میں یہ دروغ گوئی کا عیب کتاب اور شہری زندگی نے پیدا کیا تھا۔

میرا بڑا لڑکا مجھ سے دور دور رہتا۔ اس نے مجھے کئی بار عیسائی ہو جانے پر مجبور کیا لیکن میں نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ "میں کسی ایک مذہب کو اختیار کر کے دوسرے مذہب کے خداؤں کو ناراض نہیں کر سکتا۔" وہ مجھ سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خفا ہو گیا۔ ماریہ اپنے بچوں پر جان چھڑکتی ہے،

گھٹیا کے موذی مرض نے مجھے چلنے پھرنے تک سے معذور کر دیا، ماریہ کی توجہ مجھ پر کم اور اپنے لڑکوں پر زیادہ رہتی ہے، میں نے کئی بار سوچا کہ قراقرم واپس چلا جاؤں لیکن اب واپسی کی مجھ میں سکت ہی نہیں رہی، اب ماریہ کبھی کبھی یہ کہنے لگی ہے کہ "تمہارا قاآن قبلائی خان چینی تہذیب کے ہاتھوں مسخر ہو چکا۔ تم کبھی بیت المقدس میں پرامن زندگی گزارنے پر مجبور ہو، ہم شہری لوگ بھیڑیے تو نہیں بن سکتے تھے لیکن تعلیم اور تہذیب کے ذریعے ہم نے تمہیں بکری ضرور بنا دیا ہے، اب تم کہیں بھی نہیں جا سکتے۔ یہیں رہو اپنی اولادوں میں، لیکن ایک اجنبی کی طرح ان کی محبت سے محروم۔"

میں چاہتا ہوں کہ ماریہ کا گلا گھونٹ دوں مکا مار کے اس کی ناک توڑ دوں، لیکن یہ کیوں کر ممکن ہے کیونکہ میری انگلیوں کے جوڑ سوجے ہوئے ہیں اور میری کلائیوں میں اتنی طاقت بھی نہیں رہی کہ انہیں اپنی مرضی اور خواہش کے مطابق ادھر ادھر گھما پھرا سکوں۔ *

آوارہ گرد بادشاہ

میں سخت الجھن میں ہوں کہ اپنی داستان کا آغاز کس طرح اور کہاں سے کروں
چونکہ جب میں کچھ کہنے کے لئے اپنے ماضی پر نظر ڈالتا ہوں تو یہ دیکھ کر میری الجھنوں
میں اور اضافہ ہو جاتا ہے کہ مصائب و ابتلا، حوادث و سانحات اور نشیب و فراز کا ایک وسیع و
عریض جنگل تھا جس سے گزر کر میں اپنی زندگی کے چالیسویں سال میں داخل ہوا۔ ان میں عشق و
محبّت کی رنگینیاں اور جوانی کی کیف آور گھڑیاں اس طرح آئیں جیسے گھنگھور رات میں کوندا
لپک جاتے ہیں نے شاہی خاندان میں پرورش پائی، کہتے ہیں حضرت بادشاہ ہمایوں کے
بھائی مرزا کامران نے کچھ دن میری ماں کا دودھ پیا تھا اس نسبت سے میں مرزا کامران کا
دودھ شریک بھائی تھا۔ میں نے اپنی زندگی مرزا کامران کے زیر سایہ گزاری لیکن بعد میں کچھ
ایسا انقلاب آیا کہ مجھے مجبوراً مرزا کامران سے علیحدگی اختیار کرنا پڑی۔

میں مرزا کامران کو آکا مرزا کہتا تھا۔ اسے کابل کی حکومت تفویض ہوئی تھی۔ ایک
دن سہ پہر کو آکا مرزا نے مجھے خلاف معمول بلا بھیجا۔ جب میں ان کے پاس پہنچا، اس وقت
وہ ایک بدخشی تاجر سے گفتگو کر رہے تھے۔ میں سلام کر کے ایک طرف بیٹھ گیا، آکا مرزا نے
مجھے سرسری نظر سے دیکھا اور سر کی خفیف سی جنبش سے سلام کا جواب دے کر بدخشی تاجر
سے گفتگو جاری رکھی۔ وہ کہہ رہے تھے۔ "اگر قسمت نے یاوری کی تو ہند کی حکومت بھی اپنے
زیر نگیں آجائے گی، ہم اس وقت تجھے اتنا نواز دیں گے کہ تو اس وقت اس کا اندازہ تک
نہیں لگا سکتا!"

پھر مجھ سے دریافت کیا۔ "علی مرزا! کیا تجھے حسین لڑکیوں کی صحبت میں
رہنے کا شوق نہیں ہے؟"

میں آکا مرزا کا ادب کرتا تھا لیکن دلچسپ اور پُر کیف سوال نے حوصلہ پیدا کر
دیا، جواب دیا۔ "ہے کیوں نہیں، لیکن جب میں اپنی حیثیت پر غور کرتا ہوں تو شرمندہ ہو

جاتا ہوں۔"

آکامرزا ہنس دیئے، بولے۔"اچھا تو تو بھی کیا یاد کرے گا، ہم تیرا یہ شوق بھ
پورا کر دیں گے!" پھر بدخشی تاجر سے پوچھا۔"اس وقت تم کتنی لڑکیاں لاتے ہو؟"

تاجر نے جواب دیا۔"حضور والا! کل دس لڑکیاں لیکن یہ ساری کی ساری انتخ
ہیں۔"

آکامرزا نے کہا۔"اچھا تو کل انہیں لیتے آنا!"

"جیسا حضور والا کا حکم!"

آکامرزا نے اسے کچھ نقد رقم دی۔ جب وہ چلا گیا تو آکامرزا نے مجھ سے کہا۔
"علی مرزا! سننے میں آیا ہے کہ آگرے میں حضرت بادشاہ (بابر) سخت علیل ہیں اور
زندگی کے آثار نہیں پاتے جاتے ہم چاہتے ہیں کہ تو چند آدمیوں کے ساتھ آگرے چ
جاتے اور ہمیں صحیح صورتِ حال کی خبر دے!"

مجھ میں اتنی ہمت کہاں تھی کہ میں آکامرزا کی حکم عدولی کر سکتا، میں نے پو
"حضور والا! اپنا منشاتے دلی اس خادم پر ظاہر فرمائیں تاکہ اس کے تکمیلے کی تگ و دو
اپنی جان کھپا دوں!"

آکامرزا نے نہایت شفقت سے کہا۔"ہم چاہتے ہیں کہ تو کابل اور ہند کے عظیم ا
بادشاہ کا بھائی کہلاتے۔ اس وقت ہند اور کابل کے تاج و تخت ہمارے منتظر ہیں۔ تو فو
آگرے پہنچنے کی تیاری کر اور حضرت بادشاہ کی بیماری کی صحیح کیفیت سے ہمیں مطلع کر، ہم
خبر کے مطابق اپنی کوشش کے قدم بڑھائیں گے!"

سچ بات تو یہ ہے کہ اس وقت اس خیال سے میں بے حد خوش ہوا تھا کہ اگر آکا
ہند اور کابل کے بادشاہ بن گئے تو میں ان کے وسیلے سے بہت بڑا آدمی بن جاؤں گا۔

دوسرے دن طلوع آفتاب کی دو گھڑی بعد مجھے پھر طلب کیا گیا۔ اس وقت
آکامرزا اپنی بارہ دری میں سفید چاندنی پر نیلے گاؤ تکیے کے سہارے بیٹھے ہوتے تھے۔ یہ
دری چونکہ شاہی محل کے اندر واقع تھی اس لئے یہاں دن کی روشنی پوری طرح نہیں پہنچ
تھی۔ بارہ دری کی چھت سے لٹکے ہوتے فانوس اس وقت بھی روشن تھے اور ان کی
روشنی میں بارہ دری افسردہ افسردہ سی محسوس ہو رہی تھی۔ آکامرزا کے سامنے دس حسی
جمیل اور فتنہ ساماں لڑکیاں ناز و ادا سے کھڑی ہوتی تھیں۔ ان کے سامنے اور آکا م
کے بائیں جانب امید و بیم کی کیفیت کا شکار کل والا بدخشی تاجر کبھی لڑکیوں کو دیکھتا ا

آکامرزا کو دیکھنے لگتا۔ اس طرح وہ معاملے کے امید افزا یا حوصلہ شکن پہلو کو سمجھنے کی
ش کر رہا تھا۔

میں نے ان سراپا قیامت لڑکیوں کو دیکھا اور آنکھیں ملنے لگا۔ آکامرزا نے پوچھا۔
آنکھ میں کیا ہو گیا۔ کہیں تجھے آشوبِ چشم کی شکایت تو نہیں؟"

میں نے کھسیا کر جواب دیا۔"خدا نہ کرے، میں تو اچھا بھلا ہوں!"

آکامرزا نے ان لڑکیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوتے کہا۔"یہ سب تیرے لئے ہیں لیکن
ی وقت تیرے حوالے کی جائیں گی جب تو آگرے والے منصوبے پر ہوشیاری اور عقل مندی
ل در آمد کر چکے گا!"

اس کے بعد آکامرزا مجھے تنہا چھوڑ کر اندر چلے گئے ہم لوگ ان کا بڑی دیر تک
ر کرتے رہے لیکن وہ واپس نہیں آیا۔ بدخشی تاجر مجھ سے باتیں کرنے لگا۔ اس نے ایک
زاور چاہِ زنخداں والی لڑکی کی طرف اشارہ کرتے ہوتے کہا۔"جناب! مجھے نہیں
م کہ ان لڑکیوں میں سے کون کون سی لڑکی آپ کے حصے میں آتے گی لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ
پ کو اپنی پسند کی ایک لڑکی منتخب ہی کرنا پڑے تو اس چاہِ زنخداں والی لڑکی کو ہرگز نہ
یئے گا!"

میں نے کوئی جواب نہ دیا، خاموش رہا، غالباً بدخشی تاجر نے آنکھ کے اشارے سے
لڑکی کو آگے بلایا۔ وہ سر پر ایک ٹوپی پہنے ہوتے تھی، یہ ٹوپی جسے طاق کہتے تھے، اس
کی علامت تھی کہ جس کے سر پر یہ ٹوپی ہوگی وہ کنواری ہوگی کیونکہ شادی کے بعد لڑکیاں
ب باندھنے لگتی تھیں۔ یہ چک ایک قسم کا بڑا رومال ہوتا ہے جس کے دونوں سرے موڑ کر
ڈھانپ لیتے ہیں اور ٹھوڑی کے نیچے ایک یا دو گرہیں لگا دیتے ہیں۔

بدخشی تاجر نے لڑکی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور مجھ سے کہنے لگا۔"ذرا اس
ہاتھ کو چھو کر تو دیکھو، کیسا نرم و نازک اور لچکیلا ہاتھ ہے۔" اس کے بعد اس نے میرا
ہاتھ زبردستی لڑکی کے ہاتھ میں دے دیا اور بولا۔"جنہیں علم قیافہ آتا ہے، ایسے
نرم ہاتھ اور لمبی انگلیوں والی لڑکیوں کی بابت یہ کہتے ہیں کہ یہ شاعرانہ مزاج کی مالک ہوتی
ہا اور ان میں جذباتِ حسن و عشق کی فراوانی ہوتی ہے۔ یہ اپنے عاشق سے نہایت گرم جوشی
ے پیش آتی ہیں!"

میں نے اس لڑکی کا ہاتھ آہستہ سے دبایا لیکن گرم جوشی کا اظہار نہ کر سکا کیونکہ
مجھے ڈر تھا کہ کہیں کسی طرف سے آکامرزا نہ آجائیں۔ اس لڑکی نے اپنی بڑی بڑی بادام

جیسی آنکھیں اوپر اٹھائیں اس کی لمبی لمبی پلکیں نیزوں کی طرح میرے چہرے
تن گئیں. ایک ایسی مسکراہٹ جس کا ہونٹوں پر کوئی اثر نہ تھا، اس کی آنکھوں میں
کی جا سکتی تھی. بدخشی تاجر ہم دونوں کی قلبی کیفیات نہایت ہوشیاری سے سمجھنے کی
کر رہا تھا۔

اتنے میں آکا مرزا آ گئے. میں نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا. آکا مرزا نے کہا "تا
کرتا ہے۔ یہ تیری ہی امانت ہے، جو بالآخر تیرے حوالے کر دی جائے گی!" پھر بدخ
سے کہا "ہم نے اپنے خزانچی سے کہہ دیا ہے کہ وہ تمھیں ان لڑکیوں کی مجموعی قیمت
کر دے گا۔"

آکا مرزا نے مجھے بارہ دری سے ملحقہ ایک کمرے میں لے گئے میری
تھپتھپائی اور کہنے لگے "ہم نے تیری ماں کا دودھ پیا ہے تو بمنزلہ حقیقی بھائی
اور یہ تیرا فرض ہے کہ اپنے آکا مرزا کو ہند کی حکومت حاصل کرنے میں مدد دے۔ ا
آگرے چلا جا اور ہمیں اہم خبریں بھیجتا رہ، اگر بابا جان نے ہمایوں کو تاج و تخ
بھی دیا تو ہم ان سے زبردستی حاصل کرنے کی تدبیر کریں گے. یہ حسین و جمیل لڑکی
روشن جبیں ہے، تیرا انعام ہے. ویسے یہ ساری لڑکیاں تجھے انعام میں بخش دی
لیکن ہم پہلے تیری صلاحیتوں کا امتحان لینا چاہتے ہیں!"

اس کے بعد آکا مرزا پھر چلے گئے اور شاید خود انھوں نے روشن جبیں
کمرے میں بھیج دیا. یہ فتنہ ساماں اور سراپا قیامت میرے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی.
آگے بڑھی اور مجھ سے لگ کر کھڑی ہو گئی. اس نے مڑ کر دروازے کی طرف دیکھ
وہاں کسی کی موجودگی کا احساس ہوا. پھر اس نے اور زیادہ جرأت سے کام لیا اور میر
ہاتھ لینے ہاتھ میں لے کر دبایا اور ایک بار پھر دروازے کی طرف مڑ کر دیکھا. وہاں آکا
جھلک دکھائی دی. ان کے ہاتھ میں خنجر چمک رہا تھا اور اس خنجر کی نوک ہم دونوں کی طرف
سہم گیا میرا خیال تھا کہ روشن جبیں بھی ڈر کر مجھ سے دور ہٹ جائے گی. لیکن اس کا آئندہ
توقع کے سراسر خلاف نکلا وہ مجھ سے قریب ہو گئی، بُری طرح، پورے جوش اور سرگرمی
تاجر کے بقول، اس کی لمبی انگلیوں اور نرم و ملائم لچکیلے ہاتھ کی خصوصیات اور صفات د
یں میرے سامنے تھیں۔ آکا مرزا کے خوف سے بے نیاز میرے دل میں سماتی چلی گئی۔
جذبات میں بہہ گیا اور روشن جبیں کی گداز اور لطیف حسن میں ڈوبتا چلا گیا۔ مجھے کچ
اور کیف اپنی رگ و پے میں دوڑتا ہوا محسوس ہوا جس کے لطف اور لذت کو لفظ

ر کیا جا سکتا، جسم میں خون کی جگہ لطف و سرور کی لہریں دوڑ رہی تھیں انہی لہروں
معمولی اور حقیر سی ڈر کی لہر بھی دوڑتی محسوس ہوتی آکا مرزا اور ان کے عریاں خنجر
ی کی لہر، مار دیئے جانے یا زخمی کر دیئے جانے کی دہشت کی لہر لیکن روشن جبیں کی
ور حسن و ناز کا سرور اس دہشت پر غالب آ گیا

★

کئی دن بعد میں آگرے روانہ ہو گیا۔ مجھے حیرت تو اس بات کی تھی کہ آکا مرزا نے
جبیں سے ہم ملاقات والے واقعے کا اشارتاً بھی ذکر نہ کیا اور یہ بات ایک مدت بعد
لم میں آئی کہ اس روز جو کچھ بھی ہوا تھا، وہ آکا مرزا کی خواہش اور حکم پر ہوا تھا۔
زا نے روشن جبیں کو بے تکلف ہو جانے کا حکم دیا تھا۔ اور اس حکم کی تعمیل کرانے
ے وہ برہنہ خنجر لیے دروازے پر موجود تھے اور شاید روشن اسی لیے گھوم گھوم کر
ے کی طرف دیکھتی بھی رہی تھی. شاید اس عجیب و غریب طریقہ کار سے ان کا یہ مقصد
یاسے کے حلق میں چند قطرے ٹپکا کر اس کی تشنگی کی آگ کو بری طرح بھڑکا دیا جائے۔
اس آگ کے مشتعل ہو جانے کے بعد میں بڑے سے بڑا کام انجام دے سکتا تھا. اس توقع
اپنی مہم جوئی میں کامیابی کے بعد میں روشن جبیں کا حق دار ٹھہروں گا اور میرے حوالے
جائے گی۔

چلتے وقت روشن جبیں نے ایک عجیب سی بات کہی تھی. اس نے دوپٹے کا آنچل
ے ہاتھ کی پہلی انگلی پر لپیٹتے ہوئے کہا تھا "علی مرزا! میں بدخشاں کی رہنے والی ہوں
ی حکومت، بادشاہ سلامت (بابر) نے ہمایوں کو عطا فرمائی ہے. تم حق اور انصاف سے
دانی ہرگز نہ کرنا، چاہے اس کا نتیجہ کچھ بھی نکلے۔"

میں نے اس سے حق اور انصاف پر چلنے کا عہد بھی کر لیا تھا لیکن جب راستے میں
ی ایک ایک بات پر غور کیا اور اس کے معانی و مطالب نکالنے لگا تو روشن جبیں کی مبہم
میری سمجھ میں نہ آ سکی کیونکہ جہاں تک حق و انصاف کا تعلق تھا اس کی رو سے مجھے
، کا وفادار ہونا چاہیئے تھا لیکن مجھ سے وفاداری کا مطالبہ آکا مرزا کر رہے تھے،
ب. میں سخت الجھن میں پڑ گیا اور آخر کار اس نتیجے پر پہنچا کہ مجھے ان چکروں میں نہیں
چاہیئے۔ آکا مرزا نے میرے سپرد جو کام کیا ہے اُسے انجام دے کر روشن جبیں کو
ل کر لینا چاہیئے اور پھر انعام میں آکا مرزا سے کوئی جاگیر لے کر رخصت ہو جانا چاہیئے۔

اور پوری زندگی لطف و مسرت میں گزار دینا چاہیئے۔

میلوں دور سے آگرے کی لو محسوس ہونے لگی۔ جمنا کے مشرقی کنارے پر بادشاہ بابر اپنے تعمیر کردہ باغ گل افشاں کی سرخ پتھروں سے ترشی ہوئی عمارت میں علالت پر دراز تھے اور یہ محض اتفاق کی بات تھی کہ جب مجھے ان کے حضور پہنچایا گیا کے گرد و پیش بڑے بڑے امرا جمع تھے۔ یہ امرا حضرت بادشاہ کی زندگی کے ہر موڑ پر وفادار ثابت ہوتے تھے۔ وہ شاہی تخت کے پیچھے ایک لمبے تخت جیسی کرسی پر د اور ان کے قریب ہی شہزادہ ہمایوں دست بستہ کھڑا تھا۔ حضرت بادشاہ کو جب میری آ ہوا تو انہوں نے خوشی کا اظہار کیا اور مجھے اپنے قریب بلایا شفقت سے میرا ہاتھ اپنے میں لے لیا اور اسے سہلانے لگے۔ پہلے آ کامرزا (مرزا کامران) کی خیریت پوچھی۔ پھر مرزا کی بابت متعدد سوالات کئے۔ انہوں نے ایک عظیم شہنشاہ کی شان سے کہا۔ "کاش تمام اولادیں اس وقت نظروں کے سامنے ہوتیں لیکن کوئی حرج نہیں، رب کی مرضی پر غالب ہے!"

حضرت بادشاہ نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا اور ہمایوں کا ہاتھ، ہاتھ میں لے کر ا امرا کو مخاطب کیا۔ "دوستو! یہ شہزادہ نصیر الدین ہمایوں ہمارا جانشین اور وارثِ تخت تاج ہے۔ ہماری ذات سے وابستہ وفاداریاں اب تم سب اپنے نئے بادشاہ کی طرف کر دو۔" پھر ہمایوں کو حکم دیا کہ وہ تخت پر بیٹھ جائے۔ ہمایوں ہچکچاتا ہوا تخت پ حضرت بادشاہ اور امرا نے ایک ساتھ دعا کے لئے ہاتھ اٹھاتے اور قرآنی آیات پ چپکے چپکے دعائیں دینے لگے۔ حضرت بادشاہ نے اپنے منہ پر دونوں ہاتھ پھیر کر سے کہا۔ "ہمایوں! اب تم اس مملکت کے شہنشاہ ہو اور تمہارا یہ فرض ہے کہ پوری سے خدا کی اطاعت اور بندگان خدا کی خدمت کرو، انصاف اور سچائی کو کبھی بھی ہاتھ نہ جانے دو، غریبوں اور بے آسرا لوگوں کو سہارا دو اور ہاں ایک اور خاص بات۔" یہ کہتے حضرت بادشاہ کچھ فکر مند ہو گئے۔ معلوم نہیں کیا سوچنے لگے۔ پھر کہا۔ "ہاں اپنے بھائیوں کے ساتھ مہربانی اور محبت سے پیش آنا، ان کا جرم کتنا ہی سنگین ناقابلِ معافی کیوں نہ ہو انہیں معاف کر دینا، غصے میں آ کر کبھی بھی ان کے خلاف کو قدم ہرگز نہ اٹھانا!"

اشکبار ہمایوں نے حضرت بادشاہ کی اس نصیحت پر سختی سے عمل پیرا گلوگرفتہ آواز میں عہد کیا۔ اس کے بعد حضرت بادشاہ سوتے خلد بریں تشریف

نشاں کے سرخ محل میں کہرام برپا ہو گیا۔ مغل امرا نے یہ مشورہ دیا کہ حضرت بادشاہ کی ت کو چھپایا جائے۔ چنانچہ کئی دن تک یہ خبر راز میں رہی لیکن ایک دن آرائش خان نامی ہندی امیر نے ہمایوں سے بصیغۂ راز داری و وفاداری مشورۃً عرض کیا کہ "حضرت بادشاہ م کی موت کی خبر چھپاتے رکھنا اچھی بات نہیں ہے کیونکہ ماضی میں جب بھی ایسا کیا گیا و شبہے نے جڑ پکڑی اور بازار میں لوٹ مار شروع ہو گئی!"

ہمایوں نے فکرمندی سے دریافت کیا۔ "پھر ہمیں کیا کرنا چاہیئے؟"

آرائش خان نے جواب دیا۔ "کسی شخص کو منادی کی خدمت سونپ کر سرخ س پہنایا جائے اور اسے ڈھول دے کر ہاتھی پر بٹھا دیا جائے۔ وہ شہر کے بازاروں ر گلی کوچوں میں ڈھول پیٹ پیٹ کر اعلان کر دے کہ اعلیٰحضرت بادشاہ نے گوشہ نشینی ختیار کر لی ہے اور درویش بن کر بادشاہت ہمایوں کو سونپ دی ہے!"

ہمایوں نے اس تجویز پر عمل کیا اور لوگوں کے شکوک کو رفع دفع کر دیا۔ حضرت بادشاہ مرحوم کی لاش ایک تابوت میں امانتاً رکھ دی گئی کیونکہ مرحوم بادشاہ کی وصیت کے طابق اسے کابل میں دفن ہونا تھا۔

میں نے یہ ساری روداد بالتفصیل لکھ کر آ کامرزا کو روانہ کر دی۔ میرے ساتھ ہمایوں کا سلوک بہت اچھا تھا اور وہ آ کامرزا اور عسکری مرزا کا ذکر بڑی محبت سے کیا کرتا تھا۔ مجھے ہمایوں میں جیسی نیک نفسی اور شرافت نظر آئی اس کے پیش نظر میں نے آ کامرزا کو یقین دلایا کہ اگر وہ ذرا سی ہمت سے کام لے تو ہندوستان کا تخت و تاج اس کے قدموں ں ہو گا۔

آ کامرزا نے مجھے لکھا کہ "تم ہمایوں کے آس پاس موجود رہو اور اس کی ہر بات پر نظر رکھو اور مجھے آگرے پہنچا سمجھو۔"

اسی دوران گجرات کے حکمران سلطان بہادر نے سرکشی اختیار کی اور ہمایوں اس کی سرکوبی کو آگرے سے باہر نکلا۔ میں نے آ کامرزا کو نئی صورتِ حال سے مطلع کیا اور مشورہ دیا کہ ہمایوں کی عدم موجودگیِ آگرہ سے فائدہ اٹھانے کا یہ بہترین موقع ہے۔ روشن جبیں کی یاد اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے ستاتی رہتی تھی اور اس نے مجھے یہاں تک ستایا کہ میں نے خط کے آخر میں آ کامرزا سے درخواست کی کہ "روشن جبیں اس ناچیز کی آپ کے پاس امانت ہے۔ آپ کی عاید کردہ شرط کی تکمیل میں معلوم نہیں کتنا وقت لگے گا اس لئے کیا یہ بات جائز اور مناسب نہیں ہے کہ روشن جبیں کی ایک تصویر کسی ماہر مصور سے بنوا کر اس ناچیز

کو روانہ کر دی جائے!"

آکا مرزا نے میری درخواست پوری کر دی، روشن جبیں کی تصویر نے میرے اشتیاق
اضطراب میں اور زیادہ آگ لگا دی۔ میں تنہائی میں اس تصویر کو سینے سے لگا کر دیوانو
جیسی باتیں کرتا رہتا۔ گو یہ ایک سنجیدہ تصویر تھی لیکن مجھے ایسا لگتا جیسے وہ مسکرا رہی ہو

ہمایوں نے سلطان بہادر کے تعاقب اور مقابلے میں سینکڑوں میل کا سفر کر ڈالا
اور اسے شکستِ فاش دے کر گجرات کی حکومت مرزا عسکری کے حوالے کر دی۔ مرزا عسکر
اور مرزا کامران ایک ماں کے بیٹے سے تھے۔ ہمایوں آگرے واپس آیا۔ آکا مرزا ابھی تک
حالات کا جائزہ لے رہے تھے۔ پھر ہمایوں افغان باغی شیر خان سوری سے الجھ گیا کیون
شیر خان کے عزائم بہت ہی خطرناک محسوس ہو رہے تھے۔ اس موقع پر میں نے آکا م
کو زور دے کر لکھا کہ اب اس سے بہتر موقع شاید کبھی بھی نہ آئے ہمت کر کے آگے بڑھے
اور آگرے پر قبضہ کر کے ہمایوں کو جلا وطن کر دیجئے۔"

مجھے اس بات کا ذرا بھی علم نہ تھا کہ چند حاسد اور چغل خور میرے کردار اور افعال
نگرانی کر رہے ہیں۔ چنانچہ اس غفلت اور لاعلمی کا یہ نتیجہ نکلا کہ میرا آخری خط پکڑا گیا
مجھے خط سمیت ہمایوں کے سامنے پیش کر دیا گیا۔

ہمایوں نے مجھ سے پوچھا۔ "کیا یہ تیری تحریر ہے؟"

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ہمایوں نے سختی سے پوچھا۔ "مرزا کامران کیا چا
ہے؟"

میں نے سادہ لوحی سے جواب دیا۔ "اعلیٰحضرت کی قربت اور حضوری۔"

ہمایوں نے غصے میں کہا۔ "دہلی اور آگرے پر قبضے کی ترغیب دیتے ہوا ور
جلا وطن کر دینے کا مشورہ دے رہے ہو اور جب تمہاری سازش پکڑی گئی تو یہ ک
ہو کہ مرزا کامران ہماری قربت اور حضوری کا خواستگار ہے۔"

میں نے جواب دیا۔ "اعلیٰحضرت! اس ناچیز نے وہی کچھ لکھا ہے جو حضور
نے پڑھا ہے لیکن اس کا وہ مفہوم ہرگز نہیں ہے جس کا بظاہر اظہار ہوتا ہے۔ حضور
نہیں جانتے کہ آکا مرزا کے مشیر کیسے ہیں؟ وہ آکا مرزا کو ہر وقت اس پر آمادہ
رہتے ہیں کہ وہ آپ کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھائیں اور آپ کو آگرے اور دہلی سے
باہر کریں۔ میری معترضہ عبارت میں در پردہ آکا مرزا کے لئے یہ پیغام ہے کہ وہ دہلی ا
آگرے کی طرف بڑھیں اور آپ سے مل کر حاسد اور شری امرا کو جلا وطن کر دیں۔"

بھائیوں کے درمیان اختلافات اور منافقت کی خلیج نہ حائل کر سکیں!"

ہمایوں میرے اس جواب سے کسی حد تک مطمئن ہو گیا۔

اسی دوران یہ پتہ چلا کہ مرزا عسکری نے احمد آباد میں سرکشی اختیار کی اور اپنے نام
خطبہ پڑھوانے کی فکر میں ہے۔ ہمایوں کو اس خبر سے بڑا دکھ پہنچا اور جواب دہی کے
لئے عسکری مرزا کو طلب کیا۔ ادھر شیر خان کو بھائیوں کے اختلافات کی رتی رتی خبریں
پہنچ رہی تھیں اور وہ اس کوشش میں تھا کہ یہ اختلافات کم نہ ہوں، بڑھتے ہی رہیں۔
کامرزا نے مجھے اپنے خط میں لکھا تھا کہ "شیر خان سے کسی بھی طرح خفیہ طور پر ملو اور اسے
جنگ جاری رکھنے کا مشورہ دو۔ اس سے ہمیں یہ فائدہ پہنچے گا کہ ہمایوں کے ایک طاقت
ور حریف کی ہمیں حمایت حاصل ہو جائے گی۔"

اتفاق کی بات کہ یہ خط بھی پکڑا گیا اور ہمایوں نے مجھ سے پھر جواب طلب کیا۔
اس بار بھی میں نے بات بنانے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ ہمایوں میری بات سے مطمئن
نہ ہوا، بولا۔ "مرزا کامران ہمارا بھائی ہے اور تم اس کے دودھ شریک بھائی ہو۔ اس رشتے
سے تم ہمارے بھائی بھی ٹھہرے، کیا تمہارا یہ فرض نہیں ہے کہ تم اگر ہم بھائیوں میں کسی
قسم کے اختلافات محسوس بھی کر رہے ہو تو انہیں اپنے ذاتی اثر و رسوخ اور فکر و تدبیر سے
دور کرو، چہ جائیکہ ہمیں آپس میں لڑانے کی کوشش کر رہے ہو۔"

میں ہمایوں کی بات سے بہت متاثر ہوا اور تذبذب میں مبتلا ہو گیا کہ اب مجھے
کیا کرنا چاہیئے؟ آکا مرزا کے لئے جاسوسی یا شریف النفس ہمایوں کے لئے آپس میں
اتحاد و یگانگت کی کوشش؟ ابھی میں اسی فکر و تردد میں تھا کہ ہمایوں کی فوج میں یہ
افواہ گرم ہوئی کہ مرزا ہندال (ہمایوں کا ایک اور بھائی) ہمایوں کی عدم موجودگی سے فائدہ
اٹھا کر آگرے کا بادشاہ بن بیٹھا ہے اور خطبے میں اپنا نام پڑھوا کر دہلی کی طرف
بڑھنے والا ہے اور ساتھ ہی یہ بھی سننے میں آیا کہ آکا مرزا لشکر جرار کے ساتھ دہلی کی
طرف چل پڑا ہے اور غالباً مرزا ہندال اور آکا مرزا میں جنگ و جدال برپا ہونے والی
ہے۔"

مجھے آکا مرزا کی یلغار سے خوشی ہوئی اور بالکل ایسا محسوس ہوا کہ آکا مرزا نے
آگرے اور دہلی پر قبضہ کر کے اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا ہے اور جمعے کی نمازوں کے
خطبے میں آکا مرزا کا نام پڑھا جانے لگا ہے۔ اس خوش فہمی اور فضول احساس نے ذرا
سی دیر کے لئے مجھے غافل اور لاپروا بنا دیا۔ میں اپنے خیمے میں چلا گیا اور روشن جبیں

کی تصویر سامنے رکھ کر اس سے باتیں کرنے لگا۔ میں نے تصویر سے کہا۔ "روشن جبیں! اب وہ دن دور نہیں کہ میں تمہیں حاصل کر چکا ہوں گا، تم نہیں جانتیں کہ تمہاری مفارقت نے مجھے نیم جان کر رکھا ہے۔"

عین اسی وقت جب میں تصویر کو بوسہ دے کر سینے سے لگاتے ہوتے تھا ایک سپاہی نے میری چوری پکڑ لی اور نہایت پھرتی سے روشن جبیں کی تصویر مجھ سے چھین لی۔ اس کی اس حرکت پر مجھے غصہ آ گیا اور میں نے تصویر کی واپسی کے لئے اس پر بھرپور حملہ کر دیا۔ میں نے اچھل کر اپنی ٹانگوں سے اس کے سینے پر ایک ضرب لگائی لیکن اس نے وار خالی کر دیا اور میں اپنے زور میں آپ ہی ڈھیر ہو گیا۔ میرے گرتے ہی وہ میرے سینے پر سوار ہو گیا اور چیخنے لگا۔ "لوگو! دوڑنا، میں نے اس کی ایک ایسی چوری پکڑی ہے کہ وہ اس سے انکار نہیں کر سکتا۔"

ذرا سی دیر میں بہت سارے آدمی میرے خیمے میں داخل ہو گئے، مجھے چت اور اس سپاہی کو میرے سینے پر سوار جو دیکھا تو ہنسنے لگے، کسی نے پوچھا۔ "یہ وہی شخص ہے نا جس نے مرزا کامران کے لئے جاسوسی کی خدمات انجام دی ہیں؟"

کسی نے جواب دیا۔ "ہاں یہ وہی ہے!"

کسی نے پوچھا۔ "کیا پھر کوئی خط پتر پکڑا گیا؟"

میں نے جواب دینا چاہا لیکن میرے حریف نے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور "تفصیل میں بتاؤں گا تو خاموش رہ!"

اتنے میں شور و غل کی آواز سن کر ہمایوں بھی میرے خیمے میں داخل ہوا، میرے حریف نے مجھے چھوڑ دیا اور ایک طرف مودبانہ کھڑا ہو گیا۔

ہمایوں نے نرمی سے پوچھا۔ "کیا بات تھی؟ تم لوگ چیخ پکار کیوں کر رہے تھے۔؟"

میرے حریف نے ادب سے جھک کر عرض کیا۔ "حضور والا! یہ شخص ہمیں مسلمان نہیں معلوم ہوتا۔ یہ تصویر پرست ہے میں نے خود اپنی آنکھوں سے اس تصویر پر اس شخص کو سجدہ کرتے دیکھا ہے!"

ہمایوں نہایت غور سے روشن جبیں کی تصویر دیکھتا رہا۔ پھر بے دلی سے پوچھا۔ "علی مرزا! تم پر جو الزام لگایا گیا کیا یہ درست ہے؟"

میں نے آبدیدہ ہو کر جواب دیا۔ "یہ اس ناچیز پر سراسر بہتان ہے، خاکسار

مسلمان ہے اور ایک مسلمان تصویر پرستی کا کس طرح مرتکب ہو سکتا ہے؟"

ہمایوں نے پوچھا۔ "یہ کس کی تصویر ہے؟"

میں نے شرما کر جواب دیا۔ "ناچیز کی منگیتر کی!"

ہمایوں نے طنزیہ کہا۔ "اسے سینے سے لگاتے کیوں پھر رہے ہو؟"

اس سوال کا میں کوئی جواب نہ دے سکا۔

ہمایوں نے تصویر میرے حریف کے حوالے کر دی اور اسے حکم دیا۔ "آگرے پہنچنے پر یہ مقدمہ ہمارے سامنے پیش کیا جائے وہاں اگر یہ ثابت ہو گیا کہ تم تصویر پرستی کے گناہ کے مرتکب ہو چکے ہو تو تمہیں اس کی سزا ضرور ملے گی!"

میں سہم گیا، خوف کے ساتھ ہی یہ قلق مجھے اور زیادہ پریشان کرنے لگا کہ روشن جبیں کی تصویر مجھ سے چھن گئی تھی۔ اب میں یہ تصویر لڑ جھگڑ کر بھی واپس نہ لے سکتا تھا۔

بھائیوں کی سرکشی اور باغیانہ روش نے ہمایوں کو بددل اور فکرمند کر دیا تھا اسی وجہ سے وہ زیادہ سپاہ رکھنے کے باوجود شیر خان کے مقابلے میں کمزور پڑ رہا تھا۔ اس نازک موقع پر ہمایوں نے یہ فیصلہ کیا کہ فی الحال شیر خان سے نہ الجھا جائے اور اس سے صلح کر کے آگرے واپس جا کر پہلے بھائیوں کی سرکشی کا خاتمہ کیا جائے۔ یہ سوچ کر اس نے ملا محمد عزیز نامی ایک امیر کو طلب کیا۔ ملا عزیز کے شیر خان سے یارانہ تعلقات رہ چکے تھے اس موقع پر معلوم نہیں کیوں، ہمایوں کو میری یاد آ گئی اور اس نے مجھے تخلیئے میں طلب کیا۔ "علی مرزا! شاید تو جاسوسی کے کام میں خاص مہارت رکھتا ہے یہ بہترین موقع ہے کہ تو ملا عزیز کے ساتھ شیر خان کے پاس جائے اور ان دونوں میں جو بات چیت ہو لفظاً لفظاً ہمارے گوش گزار کرے۔"

میں نے شکریے کے ساتھ بادشاہ کی خدمت قبول کی۔

اسی وقت بادشاہ نے میرے حریف کو طلب کیا اور خلاف توقع اسے حکم دیا کہ روشن جبیں کی تصویر میرے حوالے کر دی جائے۔ میرا حریف حیرت زدگی اور ناگواری کے آثار لئے واپس آ گیا۔ ہمایوں کے اس حکم نے مجھے خود بھی حیران کر دیا تھا۔ غالباً بادشاہ نے میرے احساسات کا اندازہ لگا لیا کہنے لگے۔ "علی مرزا! تم ایک ہوش مند لیکن

عاشق مزاج نوجوان ہو، ہمارا خیال ہے کہ تمھیں کامران مرزا نے حسین لڑکیوں کا لالچ دے کر اس ناپسندیدہ کام پر آمادہ کیا ہوگا، کیا تمھیں رسول اللہ ﷺ کی اس حدیث کا علم نہیں جس میں آپ ﷺ نے فرمایا تھا کہ دوسروں کی جستجو مت کرو۔"

شاید مجھے پہلی بار بادشاہ کی ذہانت اور فراست کا دل کی گہرائیوں سے قائل ہونا پڑا۔

اس گفتگو کے بعد ہمایوں نے نرمی سے کہا: "کل جب ہمیں تمھاری تصویر پرستی کا علم ہوا تھا تو ہم واقعی مشتعل ہو گئے تھے لیکن دیر بعد تنہائی میں جب اس مسئلہ پر پھر غور کیا تو شرمندہ ہو گئے۔ جوانی میں کون ہے جو عشق و محبت میں مبتلا نہیں ہوتا تم اس لڑکی سے محبت کرتے ہو تو ضرور کرو لیکن آئندہ اس کی تصویر کو سجدہ ہرگز نہ کرنا!"

میں نے جلد ہی جلدی عرض کیا: "اعلیٰ حضرت کو غلط فہمی ہو گئی ہے کہ اس ناچیز نے تصویر کو سجدہ کیا تھا۔ ایک مسلمان بت پرستی کا کس طرح مرتکب ہو سکتا ہے!"

اعلیٰ حضرت نے مزید فرمایا: "علی مرزا ہمیں افیون کھانے کی عادت ہے، کبھی کبھی اثر غالب آجاتا ہے۔"

بادشاہ کی صاف گوئی اس کی صدق دلی کی گواہی دے رہی تھی۔

میرے حریف نے روشن جبیں کی تصویر میرے حوالے کر دی۔ یہاں میں اپنے اُن احساساتِ مسرت کا کس طرح اظہار کروں جو روشن جبیں کی تصویر پا کر مجھ پر طاری ہوئے تھے میں نے بادشاہ سے نظریں چرا کر نہایت احتیاط اور لاپرواہی سے روشن جبیں کی تصویر پر شوق بھری نظر ڈالی اور اسے اپنی عبا میں چھپا لیا۔

جب میں مُلّا عزیز کے ساتھ شیر خان کے لشکر میں داخل ہوا تو اس کے سپاہی ہمیں ایک کھدی ہوئی خندق کے پاس لے گئے۔ اس چلچلاتی دھوپ میں شیر خان اپنے بہت سارے سپاہیوں کے ساتھ خندق کھودنے میں مصروف تھا، اس کا چہرہ اور داڑھی مٹی میں اٹے ہوئے تھے۔ اس نے کدال فضا میں بلند کی اور زور سے کھدی ہوئی خندق کے کنارے پیوست کر دی۔ مٹی کا ایک بڑا ٹکڑا غبار اڑاتا ہوا خندق میں گر گیا۔ اسی عالم میں اسے ہماری اطلاع دی گئی وہ خندق سے باہر نکلا اور کدال ایک طرف رکھ کر سپاہیوں کو حکم دیا۔ کہ ہمارے لئے وہیں ایک چھوٹا سا خیمہ نصب کیا جائے

اس حکم کی فوراً تعمیل ہوئی اور شیر خان پانی منگوا کر ہاتھ دھونے لگا۔

پھر ہم سب اس نئے خیمے میں اکٹھے ہو کر بیٹھے اور مُلّا عزیز نے نہایت وقار سے شیر خان سے صلح کی بات چیت شروع کر دی۔ شیر خان بلا کا ذہین تھا وہ بات کی تہہ تک پہنچ گیا۔ وہ ہمایوں کے بھائیوں کی سرکشی سے خوب واقف تھا۔ اور یہ بھی جانتا تھا کہ ہمایوں کی نرم قیادت مغل فوج میں اتحاد اور جوش و خروش پیدا کرنے میں ناکام رہی ہے۔ اس نے خوش اخلاقی سے جواب دیا: "مُلّا عزیز! آپ ہماری طرف سے ہمایوں سے یہ عرض کر دیں کہ ہم دونوں بڑی مشکل میں پھنس گئے ہم خود بادشاہ سے نہیں لڑنا چاہتے لیکن ہمارا لشکر جنگ پر مُصر ہے، اسی طرح ہمایوں خود ہم سے جنگ کرنا چاہتا ہے لیکن اس کا لشکر جنگ پر آمادہ نہیں۔"

شیر خان کے جواب نے ہمیں صلح کی طرف سے مایوس کر دیا۔ اس وقت وہ زمین پر بے تکلف بیٹھا ہوا تھا اور شیر خان کی ہر ہر ادا اور جملہ طور طریق ہمیں بتا رہے تھے کہ بھائیوں کی نا اتفاقی اور فوج کی بد دلی کا شکار ہمایوں اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ ہم ہمایوں کے پاس واپس گئے اور شیر خان کے جواب سے مطلع کر دیا۔

دوسرے دن صبح شیر خان کی فوج ہماری طرف بڑھی اُن کا ایک جنگجو ہاتھی ہمایوں کے لشکر کی طرف بڑھا چلا آ رہا تھا ہمایوں نے عجلت میں طبلِ جنگ بجوایا اور خود گھوڑے پر سوار ہو کر دشمن کے ہاتھی کے آگے بڑھا ہمایوں کا نامی جنگجو میر بچکہ اور اُس کے دونوں جیالے بیٹے سامنے موجود تھے ہمایوں نے انھیں حملہ آور ہونے کا حکم دیا۔ لیکن یہ تینوں بے غیرتی سے گردن جھکا کر کنارے ہٹ گئے۔ ہمایوں نے میر بچکہ کے ایک بیٹے کے ہاتھ سے نیزہ چھین لیا اور دشمن کے ہاتھی کی پیشانی میں اُتار دیا۔ دفعتہً ہاتھی کی عماری سے ایک تیر آ کر ہمایوں کے ہاتھ میں پیوست ہو گیا۔ ہمایوں نے اُف تک نہ کی۔ اور پیوستہ تیر کی پرواہ کئے بغیر، ہاتھی کی پیشانی سے نیزہ نکالنے کی کوشش کرتا رہا اور جب انتہائی زور آزمائی کے باوجود نہ نکال سکا تو وہاں سے بھاگ کر اپنے لشکر میں آیا اور چیخ چیخ کر حملے کا حکم دیا۔ لیکن عالم یہ تھا کہ افغانی مُغل لشکر کو زیر و زبر کرنے میں مصروف تھے اور مُغل سپاہ چوہوں کی طرح بل کی تلاش میں اِدھر اُدھر بھاگی پھر رہی تھی۔ خود میرا یہ حال تھا کہ بدحواسی میں فرار کی کوئی راہ نظر نہیں آ رہی تھی۔ میں گھبرا کر بادشاہ کے پاس پہنچا۔ اور یکبارگی میرے جی میں آئی کہ اس بے سروسامانی میں تلوار کا ایک بھرپور ہاتھ ہمایوں کی گردن پر رسید کر دوں تاکہ آکا مرزا کی راہ کا سب سے بڑا کانٹا دور ہو

جاتے لیکن معلوم نہیں وہ کون سا جذبہ تھا جس نے مجھے اس ارادے سے باز رکھا۔ لوگ کہتے ہیں بادشاہوں پر سات دلیوں کا سایہ ہوتا ہے۔ ہو سکتا ہے اس خطرناک موقع پر کسی ولی کا سایہ محیط ہو جس سے وہ میرے حملے اور انتقام سے محفوظ رہا۔

میں نے آگے بڑھ کر بادشاہ کی عنان پکڑ لی اور خوشامدانہ عرض کیا: "اعلیٰحضرت اب کیوں ٹھیرے ہیں مغل سپاہ زیر زبر ہو چکی، یہ وقت ٹھیرنے کا نہیں، فرار ہو جانے کا ہے۔ آپ یہاں کس توقع اور کس کے سہارے پر نبرد آزما ہیں؟"

ہمایوں نے تشکر آمیز نظروں سے مجھے دیکھا اور گھوڑے کو دوڑا کر دریا کے کنارے پہنچا وہاں بادشاہ کا گرد باز نامی ہاتھی پہلے سے موجود تھا۔ بادشاہ نے مہابت کو حکم دیا کہ ہاتھی اس کے قریب لایا جائے مگر مہابت نے کوئی پروانہ کی اور بہروں کی طرح بادشاہ کی بات سنی ان سنی کر دی۔ بادشاہ نے مجبوراً گھوڑے کو دریا میں ڈال دیا ابھی وہ کچھ ہی دور گیا تھا کہ بادشاہ کا گھوڑا اس کی ران سے نکل گیا اور بادشاہ ڈبکیاں کھانے لگا، اسی عالم میں، میں اس کی مدد کو بڑھا لیکن مجھ سے پہلے نظام نامی ایک سقہ مشک پھلا کر بادشاہ کی طرف بڑھا اور مشک کی مدد سے بادشاہ کو دوسرے کنارے پر پہنچا دیا۔

کنارے پہنچ کر بادشاہ نے سقّے سے پوچھا: "تمہارا نام؟"

سقّے نے جواب دیا: "نظام دین"

ہمایوں سر سے پیر تک اُسے دیکھتا رہا، پھر کہا: "تم ہمارے ساتھ آگرے چلو، ہم اس عظیم خدمت کے صلے میں تمھیں دو دن ہندوستان پر حکومت کرنے کا موقع دیں گے۔"

بادشاہ میری وفاداری سے بہت متاثر تھا۔ راہ میں اس نے نظام سقّہ کی بابت اپنے ایک عجیب شُبہے کا اظہار کیا، اس نے مجھ سے کہا: "علی مرزا! کیا تمھیں اس بات کا یقین ہے کہ نظام الدین واقعی ایک سقہ ہے؟"

میں نے تردّد سے عرض کیا۔ اعلیٰحضرت روشن ضمیر ہیں یہ ناچیز کیا عرض کر سکتا ہے؟"

بادشاہ نے جواب دیا: "ہمارا خیال ہے یہ حضرت محبوب الٰہی نظام الدین اولیاؒ تھے جو ہماری دستگیری فرمانے آئے تھے۔"

مجھے ہمایوں کی اس خوش عقیدگی پر حیرت بھی ہوئی اور افسوس بھی کیونکہ

ب مایوسیاں حد سے زیادہ غلبہ کرتی ہیں تو آدمی کو معجزات اور کرامات ہی سہارا دیتے ہیں۔ سفر میں مجھے ایک اور تجربہ بھی ہوا۔ بادشاہ جب کابل سے گزرا تو وہاں کے حکمران بیٹا نذرانے لے کر حاضر ہوا، ان نذرانوں کی بابت بادشاہ کو یہ اطلاع ملی تھی کہ ں نے تو بہت زیادہ تھے لیکن جب بادشاہ کی شکست کا اُسے علم ہوا تو اس نے نذرانوں کی مدار کم کر دی اور بادشاہ کی سرسری توقیر کی۔ بادشاہ کو اس خبر سے صدمہ پہنچا اُس نے کریے کے ساتھ نذرانے واپس کر دیئے اور آگرے روانہ ہو گیا۔

مجھے یہ معلوم ہو چکا تھا کہ آگرے میں کامران مرزا بادشاہ بننے کی فکر میں امت گزیں ہیں۔ میں نے تصوّر کی آنکھوں سے دونوں بھائیوں کو آپس میں دست بہ گریباں یکھا اور پھر یہ بھی دیکھا کہ کامران مرزا اور ہمایوں میں سے کسی ایک کا لاشہ زمین پر ڑپ رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ اگر یہ لاشہ بدقسمتی سے کامران مرزا کا نکلا تو میرا کیا حشر ہو گا۔ روشن جبیں کو کس طرح حاصل کروں گا۔ درباری اُمرا جو میرے مخالف ہیں اور حاسد ہیں میرا کیا شر کریں گے۔ یہ اندیشے مجھے پریشان کرنے لگے۔

ہمایوں نے آگرے پہنچنے سے پہلے مجھے ایک نصیحت کی۔ کہا: "علی مرزا! تم ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا۔ جب دو بھائیوں میں رنجش ہو تو ان بھائیوں کے دوستوں اور محبّوں کو غیر جانبدارانہ رویہ اختیار کرنا چاہیئے۔ کیوں کہ ایسا نہ کرنے کی صورت میں ایک زبردست خطرہ موجود رہتا ہے۔"

میں بادشاہ سے آنکھ ملانے کی ہمت تو نہ رکھتا تھا لیکن جس طرح سکوت اختیار کیا اس میں بادشاہ کی بقیہ بات سننے کا اشتیاق پایا جاتا تھا۔ بادشاہ نے غالباً مجھ پر ایک سرسری نظر ڈالی اور بات پوری کر دی۔ کہا: "دو ناراض بھائی کسی وقت بھی ایک ہو سکتے ہیں اور جب بھی ایک ہوں گے۔ نفاق پھیلانے والے دوستوں کی شامت آجائے گی۔"

یہ بادشاہ کا اشارہ میری طرف تھا۔ بات قیمتی تھی میں نے گرہ میں باندھ لی اور یہ فیصلہ کیا کہ کچھ بھی ہو آگرے پہنچ کر آکا مرزا کی اس خطرناک خدمت سے سبکدوشی حاصل کرنے کی کوشش ضرور کروں گا۔

آکا مرزا باغ گلفشاں کے سُرخ محل کے بہرا پردے میں غافل بیٹھے تھے کہ

بادشاہ اپنے امرا کے ساتھ وہاں پہنچ گیا، بادشاہ کے گھوڑے نے زور سے اپنے پاؤں پٹ محل کے خدام بدحواسی میں بادشاہ کی طرف دوڑ پڑے اور بادشاہ کی رکاب پکڑ لی ابھی ہمای گھوڑے سے اترا بھی نہ تھا کہ پیرا پردے سے آکا مرزا بدحواسی میں نکلا اور بادشاہ کے پاؤ چومنے لگا۔ ہمایوں گرتے گرتے بچا، گھوڑے سے اتر کر آکا مرزا کو سینے سے لگا لیا اور اس پیشانی کو بوسہ دیا۔ میں ہمایوں کی پشت پر کھڑا تھا۔ آکا مرزا کا ہم آغوش سر ہمایوں کے کاند پر رکھا ہوا تھا اور اس کی آنکھیں مجھے گھور رہی تھیں۔ میں نے نظریں جھکا لیں۔

آکا مرزا اور ہندال مرزا نے جرم یکساں کیے تھے۔ لیکن ان دونوں میں فرق ا تھا کہ ہندال مرزا بادشاہ کی آمد کی خبر سن کر فرار ہو گیا تھا اور آکا مرزا نے حالات کا حوصل مندی سے مقابلہ کیا تھا۔ اس موقع پر آکا مرزا نے جس غیر معمولی ذہانت کا ثبوت دیا ا نے مجھے چونکا دیا۔ آکا مرزا نے ہندال مرزا کی سفارش کر کے خود کو بچا لیا۔ کہا۔ "حضر سلامت ہندال مرزا نادان اور ناسمجھ ہے اس ناچیز کی خواہش ہے کہ حضورِ والا اسے معاف فرما دیں۔"

صاف دل ہمایوں نے جواب دیا۔ "ہم ہندال مرزا کی لغزش تمہاری وجہ سے معاف کرتے ہیں اسے بلواؤ اور نصیحتیں کرو کہ آئندہ ان گستاخیوں کا مرتکب نہ ہو۔"

اس کے بعد بادشاہ نے نظام سقہ کا آکا مرزا سے تعارف کرایا اور کہا کہ "ہم نے اس سے وعدہ کیا ہے کہ اسے دو دن حکومت کرنے کی سعادت عطا کریں گے!"

آکا مرزا نے ناگواری سے منہ بنایا، زبان سے کچھ بھی نہ کہا۔

ہمایوں بہت تھکا ہوا تھا وہ آرام کرنے محل میں چلا گیا تو آکا مرزا مجھے محل کے ایک گوشے میں لے گیا۔

موتیا کی خوشبو سے فضا معطر تھی۔ دوسرے پھولوں کی خوشبو بھی پھیلی ہوئی تھی لیکن اس خوشبو میں ترشی، معلوم نہیں کیوں پائی جاتی تھی جس کمرے میں ہم دونوں بیٹھے تھے اس میں مرصع و منقش چاندی کا خطب (شمع دان) سر پر لٹکا ہوا بارہ شمعوں کی روشنی دے رہا تھا۔

آکا مرزا نے پہلے تو مجھ سے شیر خان سے جنگ اور ناکامی کی تفصیلات سنیں، پھر پوچھا۔ "کیا یہ درست ہے کہ اعلاحضرت ہمایوں نے ہمارے خطوط پکڑ لیے تھے؟"

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

آکا مرزا بے چین ہو کر کھڑے ہو گئے، پھر پوچھا۔ "پھر؟ پھر کیا ہوا؟ حضرت سلامت نے کیا فرمایا؟"

میں نے جواب دیا۔ "انہوں نے حیرت انگیز درگزر سے کام لیا!"

"افسوس!" آکا مرزا ٹھنڈی سانس بھر کر بولے۔ تم اگر ذرا سی ہمت اور ہوشیاری سے کام لیتے تو آج ہندوستان کے تخت و تاج پر ہمارا قبضہ ہوتا لیکن تم بزدل اور بے وقوف نکلے!"

میرا خیال تھا آکا مرزا میری خدمات کو سراہیں گے لیکن جب وہ الٹی آنکھیں دکھانے لگے تو مجھے بڑا غصہ آیا۔

آکا مرزا نے کہا۔ "کسی کو بڑا منصب یوں ہی نہیں ملتا، اس کے لئے بہت تدبر اور بہادری کی ضرورت ہوتی ہے، اول تو تم نے نااہلی اور نالائقی سے خطوط پکڑوا دیے دوسرے یہ کہ جب شکست کی افراتفری میں تمہیں اعلاحضرت کو قتل کر دینے کا موقع ملا تو تم نے کوتاہی اور غفلت سے کام لیا، جب حضرت سلامت دریا میں ڈبکیاں کھا رہے تھے اگر تم ذرا سی ہوشمندی اور ہمت سے کام لیتے تو وہ کبھی بھی پانی کی سطح پر نمودار نہ ہوتے اور آج ہندوستان کا تخت و تاج ہمارے قبضے میں ہوتا!"

میں نے رک رک کر جواب دیا۔ "اعلاحضرت حد درجہ شریف انسان ہیں پھر یہ

بھی سننے میں آیا ہے کہ بادشاہوں پر سات ولیوں کا سایہ ہوتا ہے اعلاحضرت بھی بادشاہ ہ اور شاید انہیں بھی سات ولیوں کا سایہ حاصل ہے پھر میں انہیں کس طرح ہلاک کر سکتا تھا۔!"

آکا مرزا نے غصے میں میرے رخسار پر ایک طمانچہ جڑ دیا۔ طمانچے کی آواز کے ساتھ کمرے کا دروازہ کھلا اور اعلاحضرت خلافِ توقع اندر داخل ہوئے۔ میں اپنا رخسار سہلانے ل آکا مرزا گھبرا کر پیچھے ہٹا۔

اعلاحضرت نے کچھ نہ سمجھنے کے انداز میں دریافت فرمایا۔ "یہ آواز کیسی آ تھی ؟"

آکا مرزا سے پہلے میں نے جواب دیا۔ "حضور والا! ایک مچھر دیر سے تنگ کر ر تھا، وہ بار بار میرے رخسار پر بیٹھنے کی کوشش کر رہا تھا تنگ آ کر میں نے مچھر کو مارنے کے لی اپنے رخسار پر طمانچہ رسید کر لیا۔"

بادشاہ نے غور سے ہم دونوں کو یکے بعد دیگرے دیکھا اور ایک طویل ہنکا بھری۔

آکا مرزا کی آنکھوں میں ممنونیت کا جذبہ سمٹ آیا۔

بادشاہ کے ہاتھ میں کاغذات کا پلندا دبا ہوا تھا۔ انہوں نے اچانک مجھ دریافت فرمایا۔ "علی مرزا! وہ لڑکی والی تصویر کہاں ہے ؟"

میں شرم سے جواب نہ دے سکا۔

انہوں نے پھر سوال کیا۔ "تم جواب کیوں نہیں دیتے ؟"

آکا مرزا نے پوچھا۔ "اعلاحضرت کس تصویر کی بابت سوال فرما رہے ہیں ؟"

بادشاہ نے نہایت سادگی اور بھولپن سے پوری تفصیل بتا دی اور کہا۔ "کام مرزا! تمہارا یہ کوکہ (دودھ شریک) بڑا عاشق مزاج نوجوان ہے۔" پھر پوچھا۔ "کامران مرزا وہ لڑکی تمہارے ساتھ آئی ہے ؟"

آکا مرزا نے فدویت سے جواب دیا۔ "کیوں ؟ کیا اعلاحضرت کو یہ لڑکی پسن ہے ؟"

بادشاہ نے جواب دیا۔ "کون ہے جو اُسے ایک نظر دیکھ لینے کے بعد پسن نہیں کرے گا۔"

آکا مرزا نے جواب دیا۔ "اعلاحضرت جب آرام فرما کر اٹھیں گے روشن جبیر

تِ اقدس میں پیش کر دی جائے گی۔!"

میرے دل پر ایک گھونسا لگا اور مجھے بادشاہ سے زیادہ آکا مرزا پر غصہ آیا کہہ سکتے تھے کہ روشن جبیں کسی کی امانت ہے اعلاحضرت اس کا خیال دل سے نکال لیکن آکا مرزا تو اسے بادشاہ کی خدمت میں پیش کرنے پر آمادہ ہو گئے۔

بادشاہ کچھ دیر اِدھر اُدھر کی باتوں میں مصروف رہے۔ اس کے بعد فرمایا۔ مران مرزا! کیا تمہیں نہیں معلوم کہ شیر خان افغان ہم سب کے لئے خطرہ بن چکا ہے ہم سب کے لئے اس وقت یہ ضروری ہے کہ آپس کی نااتفاقیاں ختم کر کے مِل کر رہیں!"

آکا مرزا نے بے شرمی اور ڈھٹائی سے کہا۔ "اعلاحضرت! یہ تو جانتے ہیں کہ تابعدار لوگ حضورِ والا کے نمک خوار اور پروردہ ہیں، جیسا حکم دیں گے اس پر عمل ا جائے گا۔"

بادشاہ نے کہا۔ "کامران! ہم یہ چاہتے ہیں کہ پہلے شیر خان سے مقابلہ ہونا اہیئے!"

پھر مجھ سے کہا۔ "علی مرزا تیری وفاداری سے ہمارے دل پر بڑا اثر ہوا حالات اعتدال ں آجائیں پھر تجھے تیری خدمات کا خاطر خواہ انعام دیا جائے گا۔"

آکا مرزا بادشاہ کی باتوں سے دل ہی دل میں کڑھ رہے تھے۔

بادشاہ نے کچھ یاد کرتے ہوئے کہا۔ "کامران مرزا! کیا تم یہ عہد کرنے کو تیار ہو کہ تم آئندہ سرکشی اور بغاوت نہیں کرو گے!"

آکا مرزا نے جواب دیا۔ "اعلاحضرت کو کسی قسم کی غلط فہمی ہو گئی ہے ورنہ یہ خاکسار اتنی بڑی جرأت کس طرح کر سکتا ہے!"

بادشاہ نے ہاتھ میں دبے ہوئے کاغذات کا پلندا میز پر رکھ دیا اور واپس جاتے ہوئے فرمایا۔ "ہم کل تمہیں باریابی کا شرف بخشیں گے اس وقت تم سے ہم بعض اہم مشورے کریں گے!"

بادشاہ کے جاتے ہی آکا مرزا نے ان کاغذات پر قبضہ کر لیا اور انہیں کھول کھول کر دیکھنا شروع کیا، اچانک آکا مرزا کا چہرہ سفید پڑ گیا میں نے ان پُر اسرار کاغذات کو سرسری نظر سے دیکھا یہ آکا مرزا کے وہ خطوط تھے جو انہوں نے مجھے اور بعض دوسرے لوگوں کے نام لکھے تھے انہیں میں چند وہ خطوط بھی موجود تھے جن میں بادشاہ سلامت

کو قتل کر دینے کا حکم دیا گیا تھا۔ آکا مرزا لرز گئے وہ بادشاہ کی ایما سمجھ چکے تھے
ہمایوں نے اس طرح آکا مرزا کو یہ بات بتا دی تھی کہ وہ جو کچھ بھی اس کے خلاف
رہے ہیں بادشاہ اس سے باخبر ہیں۔

آکا مرزا کمرے سے نکل گئے لیکن پانچ منٹ بعد پھر واپس آ گئے بولے
مرزا! ہم یہ دیکھنے باہر گئے تھے کہ وہاں اعلاحضرت موجود تو نہیں، لیکن شاید وہ سو
لیے خواب گاہ میں جا چکے ہیں۔"

میں نے پوچھا۔ "بادشاہ کو ہماری مصروفیات کا پورا علم ہے اس باب
آپ کا کیا خیال ہے کیا بادشاہ ہمیں ان باغیانہ خطوط کی سزا میں قتل نہیں کرا دیں

آکا مرزا نے افسردگی سے جواب دیا۔ "کچھ پتہ نہیں کہ ہمارا کیا حشر ہوگا لیکن یہ بعید
نہیں کہ ہمارے لئے کوئی عبرت ناک سزا تجویز کی جائے!"

میں نے کہا۔ "بادشاہ خواب گاہ میں آرام فرما رہے ہیں، کیا چوری سے ہمارا فرار
مناسب نہیں ہے؟"

"بزدل کہیں کے۔" آکا مرزا نے غصے میں کہا۔ "ڈرتے کیوں ہو اگر ہمیں سزا ملی تو
بھی سزا پاؤ گے۔"

میں نے دبے لفظوں میں پوچھا۔ "آکا مرزا! کیا بادشاہ سلامت روشن جبیں کو
اپنے حرم میں ڈال لیں گے؟"

آکا مرزا نے جواب دیا۔ "کچھ بعید بھی نہیں۔"

میں نے معلوم نہیں کس طرح جوش میں عرض کیا۔ "آکا مرزا! اگر ایسا ہوا تو میں ہم
ہمیشہ کے لئے آپ لوگوں سے دوری اختیار کر لوں گا۔"

آکا مرزا کے جی میں معلوم نہیں کیا آئی کہ انہوں نے نرمی سے کہا۔ "علی مرزا! ہم
بھی تم پر ظلم نہیں ہونے دیں گے اگر اعلاحضرت نے روشن جبیں کو قبول فرمانا چاہا تو ہم
اس سے پہلے ہی اس لڑکی کو تمہارے حوالے کر دیں گے پھر تم اسے جہاں بھی چاہو لے جانا

جب میں آکا مرزا سے جدا ہونے لگا تو انہوں نے مجھ سے کہا۔ "علی مرزا! ایک
سخت معرکے کے لئے تیار رہو، بس یہ سمجھ لو کہ ہم دونوں کو آگرے کے تاج و تخت کے
لئے اپنی اپنی جان کی آخری بازی لگا دینی ہے، اس کا نتیجہ جو کچھ بھی نکلے ہمیں اس کی
کوئی پرواہ نہ ہونی چاہیئے۔ تخت یا تختۂ دار۔ جو بھی مقدر میں ہوگا مل کر رہے گا، تقدیر
سے ڈرنا کیسا؟"

آکا مرزا میرے اس جھوٹ سے بہت خوش ہوتے تھے جو میں آکا مرزا کے طمانچے کی
پوشی کے سلسلے میں بول چکا تھا اور میرا پگھلتا ہوا اعتماد کسی حد تک پھر بحال ہو گیا تھا
اہ کی نرمی اور درگزری نے اسے ذرا بھی ممنونِ احسان نہ کیا تھا۔ وہ اب بھی ہمایوں کی جگہ اپنی
ت کے خواب دیکھ رہا تھا اور اس نے مجھے پھر یہی ہدایت کی کہ میں کسی بھی طرح ہمایوں
ہ سے ہٹانے کی کوشش سے غافل نہ رہوں۔"

بادشاہ نے نظام سقہ سے جو وعدہ کیا تھا اسے پورا کرنے کا اعلان کیا۔ تمام افراد
رگان کو حکم دیا گیا کہ وہ نظام سقہ کے حضور پیش ہوں اور آدابِ بادشاہی بجا لائیں۔ نظام
نے سر پر تاج رکھا اور تختِ شاہی پر جلوہ افروز ہو گیا، امرا اور شہزادے کورنش اور تسلیمات
تے۔ خود بادشاہ بھی ایک امیر کی حیثیت سے نظام سقہ کے روبرو دست بستہ کھڑا رہا۔
شاہ کی نظریں آکا مرزا کو تلاش کر رہی تھیں۔ میں بادشاہ کا مقصد بھانپ گیا! دم ایک خدمت
کے ذریعے بادشاہ کی قربت کا خواہاں ہوا۔ ہمایوں نے مجھے اپنے قریب بلایا اور پوچھا۔ "کیا
اسے کچھ کہنا چاہتے ہو؟"

میں نے آکا مرزا کا معذرت نامہ ہمایوں کی خدمت میں پیش کر دیا۔ اس چند سطری
نامے میں تحریر تھا۔

> "اعلاحضرت! ناچیز طبیعت کی خرابی کی وجہ سے حاضری دینے
> سے قاصر ہے۔ اگر خاطر نازک پر گراں نہ گزرے اور اعلاحضرت ناچیز کو
> اپنا ہمدرد اور بہی خواہ تصور فرماتے ہیں تو حقیر کی اس رائے سے ضرور
> اتفاق فرمائیں گے کہ نظام سقہ جیسے حقیر شخص کو دوسری بخششیں
> اور رعایتیں بھی دی جا سکتی تھیں اور یہ لازم نہ تھا کہ اسے تخت پر
> بٹھایا جاتے اور خاص کر اس نازک گھڑی میں کہ شیر خان ہمارے
> نزدیک آ چکا ہے، اعلاحضرت کی یہ عنایت مضرت اور نقصان کا سبب
> بن سکتی ہے۔"

بادشاہ نے آکا مرزا کے اعتذار پر افسوس کیا، بولے۔ "آخر ہمارے بھائیوں کو
ا ہو گیا ہے کہ وہ ہمیشہ اختلاف کی روش اختیار کرتے ہیں۔!"

کئی دن تک آکا مرزا سے میری ملاقات نہ ہو سکی، میرا خیال تھا کہ وہ ضرور کسی
ازش اور جوڑ توڑ میں مصروف ہوں گے لیکن بعد میں پتہ چلا کہ وہ بیمار ہیں اور بیماری
ازک صورت اختیار کرتی جا رہی ہے۔ میں نے آکا مرزا سے حاضری کی اجازت چاہی جو

یا آسانی مل گئی۔ میں نے دیکھا منقش آبنوسی مسہری پر آکا مرزا داہنی کروٹ لیٹے ہو
طبیب کو نبض دکھا رہے تھے۔ میں سامنے گیا اور نیازمندانہ آداب بجا لایا۔ ہونٹوں پر ہلک
مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ میں نے عرض کیا۔ "آکا مرزا! مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کی علا
سے بتاخیر مطلع ہوا۔"

آکا مرزا نے افسوس سے کہا۔ "علی مرزا! ہم فوراً لاہور واپس جانا چاہتے ہ
تم اعلاحضرت سے بصد ادب ہماری طرف سے عرض کرو کہ وہ ہمیں آگرے میں
نہ روکیں۔"

میں نے اپنی طرف سے بادشاہ کے خیال کی ترجمانی کی۔ میں نے کہا۔ "اعلا
کا خیال ہے کہ اس نازک موقع پر ہم سب کو اتحاد اور یک جہتی کی ضرورت ہے۔"

آکا مرزا نے زہریلی نظروں سے مجھے گھورا اور اپنے طبیب کو حکم دیا۔ "ہما
بیان کیا جائے۔"

طبیب نے سر جھکا کر عرض کیا۔ "افسوس کہ حضور والا کو کھانے میں زہر دیا
ہے!"

آکا مرزا نے کرخت آواز میں کہا۔ "ہمیں یہ زہر کون دے رہا ہے؟ اس کا ایک
جواب ہے۔ اعلاحضرت کی ایما پر محل سرا کی بیگمات کھانے میں زہر دے کر ہمیں ہلاک
دینا چاہتی ہیں!"

میرے جی میں آئی کہ میں بادشاہ کی تائید میں بولوں اور آکا مرزا کو بتاؤں ک
بادشاہ خطرناک باغیانہ اور سازشی خطوط کے پکڑے جانے پر عفو و درگزر سے کام
رہا ہو اسے کھانے میں زہر دینے کی کیا ضرورت ہے۔ لیکن میں خاموش رہا کیوں کہ میر
تھا کہ شکی اور سازشی آکا مرزا میرا کسی طرح کبھی ہم خیال نہ بنے گا اور میں ایک بار پھر
اعتماد کھو دوں گا۔

آکا مرزا نے چڑچڑے لہجے میں کہا۔ "تم اعلاحضرت پر ہمارے خیالات کا
کر دو اور ان سے کہو کہ ہم لاہور واپس جانا چاہتے ہیں اور ساتھ ہی یہ بھی جتا دو کہ ہما
اسی طرح قائم رہ سکتا ہے۔"

اس گفتگو کے دوران طبیب رخصت ہو گیا۔ میں بھی واپس آنا چاہتا تھا لیکر
مرزا نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے رکنے کا حکم دیا۔

قدرے دیر بعد آکا مرزا کی بیگمات آنے لگیں۔ چونکہ میں آکا مرزا سے ہمشیری ر

کھتا تھا اس لیے بیگمات مجھ سے پردہ نہیں کرتی تھیں ان آنے والیوں میں وہ سرد
مت اور فتنہ ساماں روشن جبیں بھی شامل تھی جس کی تصویریں اپنے دل سے لگاتے
پھرتا تھا اور جس کی وجہ سے میں تصویر پرستی کے الزام سے متہم ہوا تھا۔ اسے دیکھتے ہی
یری عجیب حالت ہو گئی۔ میرا دل سینے میں یوں اچھلا جیسے وہ پسلیوں کا جنگلا توڑ کر باہر ہی
نکل آ جائے گا۔

آکا مرزا میری حالت پر غور کر رہا تھا۔ شاید وہ مسکرایا بھی۔ روشن جبیں نے مجھ
پر اچٹتی سی نظر ڈالی اور آکا مرزا کی پائنتی جا کھڑی ہوئی۔ میں نے زیر لب چند اشعار پڑھے
جن کا مطلب تھا۔

"چند قدموں کا فاصلہ میرے حق میں ہزاروں میل کا فاصلہ
بن گیا ہے۔ خدا جب دل میں عشق کی آگ روشن کرتا ہے تو اسی
نسبت سے دیوانگی اور جنون میں بھی اضافہ ہونا چاہیئے کیونکہ جو
دلِ محبت کی تپش سے سرخ گلنار ہو رہا ہو وہ جنون اور دیوانگی
کے بغیر ایسا ہے جیسے وہ گہرا سمندر جس کی موجوں میں اضطراب
اور تڑپ نہ ہو۔"

آکا مرزا نے مجھے اپنے قریب بلا کر دوبارہ اشعار پڑھنے کی خواہش کی۔ میں
نے سنا دیے۔ ان اشعار نے جادو کا کام کیا، اس نے روشن جبیں کو حکم دیا کہ وہ چند
ساعتیں میرے ساتھ تخلیئے میں گزار سکتی ہے۔ میں اسے اپنی قیام گاہ میں لے گیا۔ اس
وقت میں جتنا خوش تھا زندگی میں وہ خوشی دوبارہ میسر نہیں آئی۔ روشن جبیں نے
کرتے پر نیم تنا (واسکٹ) پہن رکھا تھا سرخ نیم تنے کے کنارے سنہری تاروں سے زردوز
تھے۔ اور سینے کے اوپر دونوں طرف رو پہلے اور سنہری تاروں کی مدد سے گلاب کے
پھول بنائے گئے تھے۔

وہ مجھ سے مل کر خوش نہیں ہوئی۔ بدستور اداس رہی میں نے افسردگی کا سبب
پوچھا تو کہنے لگی۔ "علی مرزا! تم اس وقت تک میرے دکھوں کا اندازہ نہیں کر سکتے جب
تک تم خود میری جگہ نہ لے لو۔"

میں نے کہا۔ "روشن جبیں! تم یقین کرو کہ میں تمہاری تصویر اپنے دل کے قریب
رکھتا ہوں ایک دن تنہائی میں، میں تمہاری تصویر سے ہم کلام تھا اور وارفتگی میں بار
بار اس کے بوسے لے رہا تھا کہ کسی چغل خور نے اعلاحضرت سے شکایت کر دی کہ میں

مسلمان ہو کر بت پرستی کر رہا ہوں، بادشاہ نے تمہاری تصویر مجھ سے چھین کر اس چغل خو
کے حوالے کر دی اور اسے حکم دیا کہ یہ مقدمہ آگرے میں پیش کیا جائے یہ تو میری
خوش قسمتی تھی کہ شاید اعلاحضرت نے یہ حکم افیون کے نشے میں صادر فرمایا تھا کہ ہوش
میں آتے ہی تمہاری تصویر مجھے واپس دلا دی اور اپنا حکم واپس لے لیا۔"

روشن جبیں نے بالکل غیر متعلق سی بات کہنے لگی۔ "علی مرزا! میں کسی ایک
کی ہو جانا چاہتی ہوں۔ مجھے اس بات سے بہت دکھ پہنچتا ہے کہ میں بظاہر تمہاری ا
قرار دی گئی ہوں لیکن تصرف میں تمہارے آکا مرزا کے رہتی ہوں اور اب یہ سننے میں آیا
ہے کہ بادشاہ سلامت نے بھی مجھے یاد فرمایا ہے!"

روشن جبیں کی بات برچھے کی طرح دل میں لہرا گئی اور میری آنکھوں تلے
اندھیرا سا چھا گیا۔ میں نے گھٹی گھٹی آواز میں پوچھا۔ "روشن جبیں! تم نے جو کچھ کہا
کیا یہ سچ ہے؟"

روشن جبیں نے جواب دیا۔ "کلام اللہ اٹھالاؤ میں یہی بات اسے ہاتھ میں
لے کر پھر سے دہرا دوں گی۔"

میں ایک دم اجالے سے تاریکی میں چلا گیا اور میرا دماغ بالکل اس لائق نہ رہا
ان حالات اور اس انکشاف کے بعد کیا کہنا یا کیا کرنا چاہیئے؟

مجھے گم سم دیکھ کر روشن جبیں نے پوچھا۔ "تم کیا سوچنے لگے؟"

میں نے بے اختیاری اور مدہوشی میں جواب دیا۔ "میں یہ سوچ رہا ہوں کہ ا
جبکہ تم میری نہیں رہیں، مجھے تمہارے ساتھ کس طرح پیش آنا چاہیئے؟"

روشن جبیں نے چیں بہ چیں ہو کر کہا۔ "عجیب انسان ہو تم بھی، کہاں تو عشق
کا یہ دعوا کر رہے تھے کہ مجھے عورت سے خدا بنا دیا تھا اور کہاں یہ عالم ہے کہ مجھ
کنارہ کشی کی سوچ رہے ہو!"

میں نے پوچھا۔ "روشن جبیں! تم مجھے یہ بتاؤ کہ تم سب سے زیادہ کسے پ
کرتی ہو؟"

اس نے کہا۔ "جو مجھے سب سے زیادہ چاہے گا اور عیش و آرام پہنچائے
میں اسی کو سب سے زیادہ چاہوں گی۔"

"تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ تم ابھی تک کورے کاغذ کی طرح ہو جس پر کسی ک
تحریر کا نشان تک نہیں پایا جاتا۔"

روشن جبیں نے جواب دیا۔ "ایسا ہی سمجھ لو۔"

میرا دل اچاٹ ہو گیا، میں نے اسے چلے جانے کا حکم دیا جس کی اس نے تعمیل
ہیں کی اور مجھ سے باتیں کرنے لگی۔ مجھے اس کی صحیح الدماغی
شبہ ہونے لگا لیکن بعد میں، میں اس نتیجے پر پہنچا کہ محل سرا کے ماحول اور آکا مرزا کے
رقیبوں نے اسے بگاڑ دیا ہے اور اب وہ اس لائق نہیں رہی کہ میں اس کی مالا جپتا رہوں
عتماد اور گمان کی شکست نے مجھے کہیں کا بھی نہ رکھا اور جی میں آیا کہ میں سب کچھ
چھوڑ کر کہیں بہت دور چلا جاؤں۔ مایوس انسان کی طرح یہ سوچ کر کہ اب کسے روشن جبیں
سے مستقل تعلق رکھنا ہے جو میسر ہے اس سے لطف اندوز ہونا چاہیئے۔ میں دیر تک اپنا غم
لط کرتا رہا۔ روشن جبیں نے خود کو میرے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔ لیکن بالکل آخر میں جبکہ وہ
اپس جانے والی تھی کھلکھلا کر ہنس دی اور کہنے لگی۔ "علی مرزا! میں تمہیں عقلمند انسان
سمجھتی تھی لیکن تم اس کے برعکس نکلے، اب تک میں نے جو کچھ کہا تھا۔ جھوٹ کہا تھا۔ میں
ہیں آزما رہی تھی، یہ دیکھنے کے لئے کہ تم مجھے واقعی چاہتے ہو یا گپ مار رہے ہو۔ پتہ چلا
ہارے سارے دعوے بس یوں ہی تھے۔"

میں پھر چکرا گیا اور افسردہ آواز میں کہا۔ "پتہ نہیں کیا سچ ہے اور کیا جھوٹ ہے ہو
لگتا ہے یہ بھی جھوٹ ہی ہو جسے تم سچ کی طرح باور کرا رہی ہو۔"

روشن جبیں ایک دم سنجیدہ ہو گئی، بولی۔ "تمہاری مرضی جو چاہو سمجھو۔ لیکن مجھے تم
بہت پسند ہو، اگر مجھے یہ اختیار دیا جاتے کہ میں کسی ایک سے محبت کر کے اسے اپنا سکتی ہوں
و وہ شخص بے شک و شبہ تم ہو گے۔"

میں نے اسے فرطِ محبت سے آغوش میں لے لیا۔ وہ بے زاری سے پیچھا چھڑانے
گی اور کہا۔ "تم نے مجھے مایوس کیا ہے علی مرزا! مجھے تمہارے یہ چونچلے اب اچھے نہیں
گتے۔"

اسی طرح ہم دونوں کتنی گھنٹے تک یک جا رہے۔ کبھی وہ روٹھتی میں مناتا، کبھی میں
پھلا لیتا اور وہ منانے لگتی اور اس میں ہم دونوں نے اتنا مزہ اور لطف حاصل کیا کہ وہ شاید
رو محبت کی سیدھی سادی گفتگو میں نہ میسر آتا۔

بادشاہ کو آکا مرزا کے شبہات اور شاہی طبیب کی تشخیص کا جیسے ہی علم ہوا میرے
ھ آکا مرزا کے پاس پہنچے اور قرآن پاک ہاتھ میں لے کر فرمایا۔ "مرزا کامران! تم ان اندیشوں کو
لسے نکال دو، ہم تو اس کا اپنے دل میں خیال تک نہیں لا سکتے۔!"

آکا مرزا خاموش رہے اور اعلاحضرت کی شکل دیکھتے رہے۔

اس دوران میں یہ خبر ملی کہ شیر خان قنوج تک آچکا ہے۔ بادشاہ نے آگرے کی حکومت آکا مرزا کے حوالے کی اور خود افواج لے کر شیر خان کے مقابلے پر پہنچ گئے۔ آکا مرزا جیسے ہی یہ خبر ملی کہ بادشاہ نے کشتیوں کے پل کے ذریعے گنگا کو عبور کر لیا ہے، فوراً آگرہ چھوڑ دیا اور اپنی سپاہ کے ساتھ لاہور چلے گئے۔ عین میدانِ جنگ میں مجھے آکا مرزا کا یہ خفیہ پیغام ملا کہ

"گزشتہ کوتاہیوں کو مت دہرانا۔ لاہور یا کابل میں روشن جبیں تمہارا انتظار کرے گی!"

میں سمجھ گیا کہ اس طرح آکا مرزا بادشاہ کو راہ سے ہٹانے اور اس کے صلے میں روشن جبیں کے حاصل کرنے کا پیغام دے رہے تھے۔ دریائے گنگا کے کنارے بڑے زور کا رن پڑا جس میں بادشاہ کو شکست ہوگئی اور وہ بدقت تمام آگرے واپس پہنچے وہاں کے امرا نے بادشاہ کو مشورہ دیا کہ وہ لاہور کا رخ کریں کیونکہ قنوج کے بعد شیر خان کا دوسرا قدم آگرے ہی میں ہوگا۔

بادشاہ فوراً لاہور روانہ ہوگئے اور شیر خان بھی موت کے سائے کی طرح ان کے تعاقب میں لگا رہا۔ آکا مرزا بادشاہ کی آمد سے پریشان ہوگیا اور اس کوشش میں لگ گیا کہ کسی طرح بادشاہ کو لاہور سے نکال باہر کریں۔ بادشاہ کامران مرزا کے باغ دل آمیز میں ٹھہر گئے تھے۔ یہ باغ کامران مرزا نے دریائے راوی کے کنارے لگایا تھا۔ بادشاہ ابھی یہاں چین سے بیٹھے بھی نہ تھے کہ پتہ چلا شیر خان سرہند تک پہنچ چکا ہے۔

بادشاہ نے تشویش کے عالم میں مجھے طلب کیا اور کہا۔ "علی مرزا! تم ایک بار بھی شیر خان کے پاس جا چکے ہو۔"

میں نے عرض کیا۔ "بے شک۔ کوئی نیا حکم؟"

بادشاہ نے کہا۔ "نیا حکم کوئی نہیں ہے بے سروسامانی کے عالم میں حکم دینے کسے ہوش ہے!"

میں نے عرض کیا "یہ ناچیز اعلاحضرت کا تابعدار ہے حکم فرمائیں یہ سر دے کر کی تعمیل بجالائے گا۔"

بادشاہ نے اسی وقت مظفر بیگ اور قاضی عبداللہ کو طلب کیا۔ یہ دونوں دربار معزز امرا میں گنے جاتے تھے۔ بادشاہ نے شیر خان کو ایک خط لکھا۔

"شیر خان! تم کبھی دربار مغلیہ کے نمک خوار تھے اور اب ہمیں اپنا نمک خوار بنانے کی فکر میں ہو، شیر خان! خدا سے ڈرو، آخر تم اتنا ظلم کیوں کر رہے ہو؟ ہم نے تمہارے لئے پورا ہندوستان چھوڑ دیا ہے تم لاہور ہمارے لئے چھوڑ دو، اور اس وقت سرہند میں جہاں تم ٹھہرے ہوتے ہو اسے ہمارے اور اپنے درمیان حد قرار دے لو!"

یہ خط بادشاہ نے ہمارے حوالے کیا اور حکم دیا کہ اسی وقت شیر خان سے مل کر اس کا جواب لاؤ۔

میں جانے کی تیاری کر ہی رہا تھا کہ آکا مرزا نے خفیہ طور پر مجھے ایک خط شیر خان کے نام دیا۔ اس میں آکا مرزا نے لکھا تھا کہ "شیر خان! تم نے ہم سے یہ وعدہ کر رکھا ہے کہ صلح کر لو گے، بھائی ہمایوں ہندوستان سے رخصت ہونے والے ہیں کیا تم اپنا وعدہ پورا کرنے میں تجاہل سے کام لے رہے ہو، یا کوئی اور مصلحت ہے؟"

میں نے آکا مرزا سے پوچھا۔ "آپ کی شیر خان سے بات چیت کب سے چل رہی ہے؟"

آکا مرزا نے سنسنی خیز انکشاف کیا۔ "جب ہم آگرے میں تھے، شیر خان نے ہمیں یہ یقین دلایا تھا کہ اگر ہم اعلاحضرت کا ساتھ نہ دیں اور اپنی فوج لے کر لاہور چلے جائیں تو شیر خان اس نرم دیتے کے صلے میں ہمیں لاہور میں حکومت کرنے دے گا اور ہم سے مقابلہ نہیں کرے گا!"

میں آکا مرزا اور بادشاہ کا پیغام لے کر سرہند پہنچ گیا۔ مظفر بیگ اور قاضی عبداللہ شیر خان کے روبرو پہنچ کر بہت زیادہ مرعوب ہوگئے۔ میں نے بدقت تمام اپنے بادشاہ کا پیغام شیر خان کو پہنچایا اور چپکے سے آکا مرزا کا پیغام بھی دے دیا۔ شیر خان نے اس کا فوراً جواب نہیں دیا، بلکہ یہ کہا کہ تم لوگ لاہور واپس جاؤ ہمارا آدمی جوابات لے کر خود ہی حاضر ہو جائے گا۔"

ہم لوگ واپس چلے آئے اور آکا مرزا اور بادشاہ بے چینی سے شیر خان کے جواب کا انتظار کرنے لگے۔

ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی اور بادلوں کے مستانے ٹکڑے اپنے پیٹ پھلاتے اڑتے پھر رہے تھے۔ بادشاہ باغ دل آمیز کی بارہ دری میں موسم کا مزہ لے رہے تھے کہ خدام شاہی نے مطلع کیا۔ "شیر خانی قاصد جوابات لے کر حاضر ہوگیا ہے!"

بادشاہ لفظ "جوابات" پر چونک پڑے انہوں نے اسی وقت یہ فرمان جاری کیا کہ شیر خانی جوابات کو سننے اور اس پر غور و خوض کرنے کے لئے فوراً ایک مجلس منعقد کی جائے جس میں سات سال سے لے کر ستر سال تک کے مرد شرکت کریں۔"

وہیں بارہ دری میں ہم سب جمع ہو گئے، شیر خانی قاصد ہمارے سامنے بلایا گیا اور اس نے دو خط بادشاہ کے حوالے کر دیے۔ آ کا مرزا نہایت ہوشیاری سے فرار ہو کر اپنے 'نو لکھا باغ' میں روپوش ہو گیا۔

بادشاہ کے خط کا جواب شیر خان نے دیا تھا۔ "تم سرہند کو حدِ فاصل بنانا چاہتے ہو، ہم تمہاری درخواست مسترد تو نہیں کرنا چاہتے لیکن ہم نے تمہارے لئے کابل چھوڑ دیا ہے تم لاہور سے کابل چلے جاؤ!"

بادشاہ کو اس مختصر اور پُر رعونت جواب پر غصہ تو بہت آیا لیکن 'قہر درویش بر جان درویش'، کر بھی کیا سکتے تھے۔ خون کے گھونٹ اور صبر کا تلخ پھل حلق کے نیچے اتار لیا۔

اس کے بعد آ کا مرزا کے خط کا جواب پڑھا گیا۔ شیر خان نے آ کا مرزا کو لکھا تھا:

"کامران مرزا! جب تک ہم نے آگرہ فتح نہیں کیا تھا، حالات کچھ اور تھے، اب حالات کچھ اور ہیں، چند دنوں کی بات ہے کہ پورا ہندوستان ہمارے قدموں تلے ہوگا ہمارا یہ مشورہ ہے کہ تم ہم سے جنگ آزما ہو کر بلا وجہ اپنی فوجی قوت کو نقصان نہ پہنچاؤ تم کابل چلے جاؤ، ہم وہاں نہیں آئیں گے!"

آ کا مرزا کی سازش کا بھانڈا پھوٹنا تھا کہ مجلس کے جملہ ارکان "شرم شرم" کی آوازیں بلند کرنے لگے اور کسی قطعی رائے تک پہنچنے سے پہلے ہی مجلس برخاست ہو گئی۔ بادشاہ نے شیر خانی قاصد کو، یہ کہہ کر روانہ کر دیا کہ اپنے بادشاہ سے کہہ دو کہ ہم سب خدائی احکام کے پابند ہیں، اگر وہ یہی چاہتا ہے کہ ہم کابل چلے جائیں تو ضرور چلے جائیں گے لیکن چونکہ ہمیں ابھی خدا کے آخری فیصلے کا کوئی علم نہیں ہے اس لئے پوری قوت سے ہاتھ پیر مار کر یہاں رکنے کی کوشش کریں گے۔

بادشاہ دل برداشتہ ہو کر حرم میں چلے گئے۔ ایک دن اچانک بادشاہ نے مجھے یاد فرمایا، جب میں وہاں پہنچا تو دیکھا کہ وہاں مجلس مشاورت جمی ہوئی ہے۔ بادشاہ کے بھائی مرزا ہندال بھی وہیں موجود تھے اور ان کے چہرے کا کھنچاؤ یہ بتاتا تھا کہ وہ کسی بات پر سخت برہم ہیں بادشاہ کے چہرے پر ملال کے اثرات تو ضرور تھے لیکن غصہ نہیں پایا جاتا

تھا۔

بادشاہ نے مجھے دیکھتے ہی اپنے قریب بلایا اور نہایت ملائمت سے سوال کیا "علی مرزا! دیکھو، مرزا کامران کے مقابلے میں ہم تم سے کہیں زیادہ وفاداری کا حق رکھتے ہیں، سچ سچ بتاؤ یہ مرزا کامران آخر چاہتا کیا ہے؟"

میں نے عرض کیا۔ "اعلیٰحضرت! یہ ناچیز بس اتنا ہی عرض کر سکتا ہے کہ جو سودا شیر خان کے دماغ میں سمایا ہوا ہے وہی آ کا مرزا بھی چاہتے ہیں اور جو جسے حاصل ہے اس سے زیادہ کی ہوس انسان کی بہت بڑی کمزوری ہے!"

مرزا ہندال نے طیش میں کہا۔ "اعلیٰحضرت! جب تک مرزا کامران کو عبرت ناک سزا نہیں دی جائے گی، شاہی افواج میں اتحاد اور یک جہتی کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا اور انہیں ہر محاذ پر شکست کا سامنا ہوگا!"

چند دوسرے شہزادوں نے بھی مرزا ہندال کے خیال کی تائید کی اور سر جھکاتے، فکر مند بادشاہ کے انداز سے یہ شبہ گزرنے لگا کہ شاید آج مرزا کامران کے خلاف کوئی خطرناک فرمان صادر ہو کر رہے گا۔

مرزا ہندال نے مزید کہا۔ "شاید حضورِ والا کو اس بات کا علم نہیں کہ ہم سے جو لغزشیں یا گستاخیاں سرزد ہو چکی ہیں ان میں مرزا کامران کا ہاتھ ضرور موجود تھا، وہ نہیں چاہتا کہ اعلیٰ حضرت بادشاہ کہلائیں، وہ اپنی بادشاہت کے خواب دیکھ رہا ہے!" اور ذرا دھیمے لہجے میں کہا۔ "اور خدا نے ہمیں یہ صریح حکم دے رکھا ہے کہ موذی کو ایذا پہنچانے سے پہلے قتل کر دو۔"

ہمایوں نے بے چین ہو کر سر اٹھایا اور صاف اور صریح لہجے میں جواب دیا۔ "مرزا ہندال! باوا جان نے ہمیں یہ نصیحت کی تھی کہ بھائیوں کا خیال رکھنا اور ان کی بڑی سے بڑی غلطی سے درگزر کرنا۔ پھر ہم دو دن کی زندگی کو مرزا کامران کے خون سے داغدار کیوں کر لیں۔ ہم مرزا کامران کو نقصان نہیں پہنچا سکتے۔"

بادشاہ کے اس دو ٹوک فیصلے نے ہم سب کو بہت متاثر کیا اور اس کی عظمت کا ہمیں دل و جان سے قائل ہونا پڑا۔

مرزا کامران کو خطرہ ہوا کہ بادشاہ سلامت کہیں کابل کا رخ نہ کریں اس نے بادشاہ کو اس خیال سے باز رکھنے کی کوشش کی اور بالآخر بادشاہ کو بتائے بغیر اپنی فوج کے ساتھ کابل

روانہ ہوگیا اور دل میں یہ ارادہ کرکے گیا کہ اگر ہمایوں نے کابل کا رُخ کیا تو انہیں بزورِ قوت روک دیا جائے گا۔

بادشاہ نے مایوس ہوکر واقعی کابل کا رُخ کیا، ابھی وہ ہزارہ تک پہنچے تھے کہ مخبروں نے خبر دی، مرزا کامران مزاحمت اور مقابلے کی نیت سے واپس آرہا ہے۔ بادشاہ کے ہمراہی پریشان ہوگئے اور انھوں نے دریافت کیا۔ "کیا ہم سب بھی ہتھیاروں سے لیس ہوکر مرزا کامران کا انتظار کریں؟"

ہمایوں نے جواب دیا۔ "اس کی کوئی ضرورت نہیں، جب ہتھیاروں کی ضرورت ہوگی تو ہم خود ہی اس کے احکام صادر فرمادیں گے!"

بادشاہ کی نرمی سے لوگ دل برداشتہ اور مایوس ہونے لگے۔ بادشاہ زرہ بکتر پہنے ہوتے ہم سب کے سامنے نمودار ہوتے اور یہ سنسنی خیز خبر سنائی کہ "مرزا کامران آچکا ہے اور اس نے بادشاہ سے قدم بوسی کی اجازت چاہی ہے!"

لوگ کچھ ہونے کے دھڑکے میں کسی اہم اعلان کی اُمید کرنے لگے۔

اس وقت میں بادشاہ کے قریب ہی تھا۔ آکامرزا ایک طرف سے اچانک نمودار ہوتے اور بڑھ کر بادشاہ کے قدموں میں جھک گئے اور پنڈلیاں پکڑ کر آنسو بہانے لگے۔ بادشاہ نے اس کی پشت تھپتھپائی اور کہا۔ "کامران مرزا! میرے بازو میری قوت، روتے کیوں ہو؟ اٹھو اور مردوں کی طرح آنسو پونچھ کر ہمارے روبرو کھڑے ہوجاؤ!"

جب ہاتھ پکڑ کر آکامرزا کو اُٹھایا گیا تو وہ ہچکیاں لے رہے تھے۔

بادشاہ نے ان کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیئے اور پوچھا۔ "کامران مرزا! تم کیوں رو رہے ہو؟"

آکامرزا نے تقریباً ہچکیوں میں جواب دیا۔ "اعلاحضرت! ہندوستان کی آب و ہوا نے ہماری صحت بگاڑ دی ہے ایک تو صحت خراب ہے اس پر مسلسل جنگیں، ان پریشانیوں نے ہمیں عاجز کر رکھا ہے!"

بادشاہ نے پوچھا۔ "تم کہنا کیا چاہتے ہو؟"

آکامرزا نے کہا۔ "اعلاحضرت ہمیں کابل چلے جانے کی اجازت مرحمت فرمادیں!"

بادشاہ نے جواب دیا۔ "تم کابل جاسکتے ہو، اور کچھ؟"

آکامرزا نے عرض کیا۔ "حضرت فردوس مکانی (بابر) نے اپنی زندگی ہی میں کابل ہماری والدہ کو دے دیا تھا، اگر اسے جنگ و جدال سے محفوظ رکھا جاتے تو بڑا کرم ہوگا!"

بادشاہ کو آکامرزا کی اس درخواست نے پریشان کردیا کہا۔ "کامران مرزا! یہ بھی توسوچو ہندوستان چھوڑنے کے بعد ہم سر کہاں چھپائیں گے؟"

بے حس اور خود غرض آکامرزا نے جواب دیا۔ "اعلاحضرت کی فکر فلک گیر بیس پناہ گاہیں تلاش کرسکتی ہے، ایک کابل ہی پر کیا موقوف ہے!"

ہمایوں نے کہا۔ "کامران مرزا! کابل تمہارا ہے اور تمہارا ہی رہے گا، ہم تو ذرا دَم لینے آئیں گے اور بس!"

لیکن آکامرزا کسی طرح بھی اس پر تیار نہ ہوتے کہ بادشاہ کابل جائیں، آخر کار بادشاہ نے کامران مرزا سے وعدہ کیا کہ وہ کابل نہیں جائیں گے اور وہ ہزارہ سے واپس ہوکر سندھ کی طرف چل پڑے۔ آکامرزا کابل چلے گئے۔ اور یہیں سے شاہی خاندان کے بعض دوسرے افراد کے ساتھ مرزا ہندال نے بھی بادشاہ سے علیحدگی اختیار کرلی۔ مرزا ہندال گجرات چلے گئے۔ آکامرزا نے کابل کی راہ لی، ظاہر ہے روشن جبیں بھی ان کے ساتھ ہی ہوگی، میں بادشاہ کے ساتھ سندھ کی طرف روانہ ہوگیا۔ اب میں حالات کے ایک ایسے موڑ پر آچکا تھا جہاں مستقبل کا تعین کرنا بہت دشوار تھا، میرے سامنے یا تو اتھاہ تاریکیاں تھیں یا سنگلاخ، ویران میدان۔ بے برگ و گیاہ صحرا۔ بادشاہ نے مجھ سے کہا۔ "علی مرزا! اگر تم چاہو تو کامران مرزا کے پاس چلے جاؤ!"

میں نے جواب دیا۔ "اعلاحضرت! کابل کا گوشۂ سکون وانبساط اپنے دامن میں ویسی عظمت نہیں رکھتا، جیسی مجھے آپ کی بے سروسامان ہم رکابی میں حاصل رہے گی۔"

بادشاہ نے جیسی نظروں سے مجھے دیکھا، میں یقین اور وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ ان میں میرے لیے شکر اور امتنان، احسان و اطمینان کا بے پایاں جذبہ موجود تھا۔

ہمایوں کی یہ داستان جو آپ پڑھ رہے ہیں، اس میں بڑی عبرتیں ہیں، اس میں انسان کی عظمت و رذالت پہلو بہ پہلو موجود ہے۔ میں علی مرزا، جو اس داستان کا راوی ہوں، بھول چوک کا پتلا ہوں، شروع سے آخر تک میں یہی چاہوں گا کہ دیانت کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹے اور مجھے جو جیسا نظر آیا، اس کو اسی طرح پیش کردیا جائے۔

جب بادشاہ بھکر میں داخل ہوا تو پتہ چلا، ہندال مرزا واپس آگیا ہے۔ شاہی خاندان نے شہزادے کی واپسی کی خوشی میں اعلاحضرت کی خدمت میں حاضری دی۔ عورتو

میں حمیدہ بانو بیگم بھی تھیں۔ یہ مرزا ہندال کی سسرالی عزیزہ تھیں۔ بادشاہ کو حمیدہ بانو بیگم بہت پسند آئیں، تادیر انہیں دیکھتے رہے پھر پوچھا۔ "ان کی تعریف؟"

کسی نے عرض کیا۔ "یہ میر بابا دوست کی صاحبزادی حمیدہ بانو بیگم ہیں!"

بادشاہ نے کہا۔ "میر بابا دوست ہمارے رشتہ دار ہوتے ہیں!" پھر بیگمات سے فرمایا۔ "ہمیں حمیدہ بانو بیگم پسند آگئی ہیں۔ ان کے بزرگوں سے کہو، انہیں ہمارے نکاح میں دے دیں!"

مرزا ہندال بگڑ گئے۔ تیوریوں پر بل ڈال کر بولے۔ "اعلیٰحضرت! اس لڑکی کو ہم اپنی بہن یا بچی تصور کرتے ہیں، آپ غریب الوطن بادشاہ ہیں ان حالات میں اگر لڑکی کو اچھی طرح نہ رکھ سکے تو کیا ہوگا؟"

بادشاہ کو میں نے پہلی بار ناراض اور خفا ہوتے دیکھا، وہ غصے میں اٹھے اور ایک طرف چلے گئے۔

مرزا ہندال کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی، بادشاہ کو جاتے ہوئے اطمینان سے دیکھتے رہے۔

مرزا ہندال کی ماں نے بیٹے کو ڈانٹا کہ بادشاہ کو ناراض نہیں کرنا چاہئے۔ انہوں نے بادشاہ کو نہایت تسلی آمیز خط لکھا اور اعلیٰحضرت کو یقین دلایا کہ وہ حمیدہ بانو بیگم کو بادشاہ سے شادی کر لینے پر آمادہ کر رہی ہیں لیکن حمیدہ بانو تیار نہیں ہو رہی ہیں۔ ایک دن بادشاہ سلامت نے تمام بیگمات کو اپنے گرد جمع کیا، شاندار محفل جمی لیکن اس محفل میں حمیدہ بانو نہیں پہنچیں، بادشاہ نے کسی بیگم کو حکم دیا کہ وہ حمیدہ بانو کو بھی بلائیں۔ جب انہیں بلایا گیا تو انہوں نے کہلوا بھیجا۔

"اعلیٰحضرت سے کہو کہ اگر اس ناچیز کی طلبی کورنش و تسلیمات بجالانے کی غرض سے ہو رہی ہے تو اگلے روز میں یہ عزت حاصل کر چکی ہوں!"

اس بار بادشاہ نے مرزا ہندال کو حکم دیا۔ "مرزا ہندال! حمیدہ بانو تمہاری عزیزہ ہیں تم انہیں ہمارے روبرو لاؤ۔"

مرزا ہندال تھوڑی دیر بعد واپس آئے اور عرض کیا۔ "اعلیٰحضرت! حمیدہ بانو کہتی ہیں کہ بادشاہوں کو ایک بار دیکھ لینا تو جائز ہے لیکن بار بار دیکھنا جائز نہیں کیونکہ بادشاہ بھی نامحرموں میں آتے ہیں۔"

بادشاہ نے ہنس کر جواب دیا۔ "اس شریف لڑکی سے کہو کہ اگر ہم نامحرم ہیں تو

بتقریب محرم بھی بن جائیں گے وہ سامنے تو آئے۔"

یہ بالکل فطری بات ہے کہ بادشاہ کی طرف سے حمیدہ بانو کے لئے جتنا اشتیاق بڑھ رہا تھا مجھے اپنی روشن جبیں شدت سے یاد آرہی تھی۔ اپنی ناکامی اور مجبوری نے چولا بدلا اور حاسدانہ روش اختیار کی۔ اس وقت میری سب سے بڑی یہ خواہش تھی کہ اے کاش بادشاہ حمیدہ بانو کو حاصل کرنے میں ناکام رہیں۔

میں نے سنا، ہندال مرزا کی ماں چالیس دن تک حمیدہ بانو کے پیچھے پڑی رہیں اور انہوں نے حمیدہ بانو سے کہا۔ "بچی! یہ بات تو نہیں ہے کہ تم شادی ہی نہ کرو، آخر کار کسی نہ کسی سے تو شادی کرو گی ہی، پھر بادشاہ سے بہتر کون آدمی ہوگا؟"

حمیدہ بانو بدستور انکار کر رہی تھیں، بولیں۔ "یقیناً میں کسی نہ کسی سے شادی ضرور کروں گی لیکن وہ ایک ایسا شخص ہوگا جس کا گریبان میرے ہاتھوں کی دسترس میں ہوگا اور رہے بادشاہ سلامت تو ان کا گریبان تو گریبان، دامن تک ہاتھ نہ پہنچیں گے!"

پھر معلوم نہیں کس طرح حمیدہ بانو شادی پر آمادہ ہو گئیں۔ بادشاہ نے اصطرلاب ہاتھ میں لے کر مبارک گھڑی کا انتخاب فرمایا اور میر ابوالبقا نامی ایک بزرگ کے ذریعے نکاح پڑھوایا اور میر ابوالبقا کو دو لاکھ روپے بطور حق نکاحانہ عطا فرماتے۔ نکاح کے تین دن بعد بھکر روانہ ہو گئے۔

بادشاہ اور حمیدہ بانو کا ملاپ میرے دل پر کوہ گراں بن کر گرا اور میری طبیعت بادشاہ کی طرف سے اچاٹ ہو گئی۔ میں جلد از جلد آگا مرزا کے پاس چلا جانا چاہتا تھا یوں بھی بادشاہ کی قسمت کا ستارہ گردش میں تھا اور وہ سندھ کے ریگستان میں بھٹکتے پھر رہے تھے۔ جیسلمیر کے ہندو راجہ نے تو یہاں تک کوشش کی کہ بادشاہ کو اپنی اطاعت و احترام کا یقین دلا کر بلانا چاہا، اس کا ارادہ یہ تھا کہ جب بادشاہ اس کے قابو میں چلے جائیں گے تو وہ انہیں گرفتار کر کے شیر شاہ کی خدمت میں روانہ کر دے گا اور اس طرح شیر شاہ کا اعتماد حاصل کر لے گا لیکن کسی طرح بادشاہ کو اس کے ارادوں کا علم ہو گیا اور وہ جیسلمیر جانے کے بجائے عمر کوٹ روانہ ہو گئے۔ ابھی وہ راستے ہی میں تھے کہ بادشاہ کے آدمی دو آدمیوں کو پکڑ لائے اور کہا۔ "یہ دونوں جیسلمیر کے راجہ کے جاسوس ہیں!"

ان دونوں کے ہاتھ رسیوں سے بندھے ہوئے تھے۔ بادشاہ سلامت نے ان سے بازپرس شروع کی، ابھی سوال و جواب کا سلسلہ جاری ہی تھا کہ دونوں قیدیوں نے ہاتھ کو جھٹکا دے کر خود کو رسیوں سے آزاد کر لیا اور بادشاہ کے آدمیوں کی کمروں سے تلواریں

کھینچ کر مار کاٹ شروع کر دی۔ بادشاہ گھبرا کر پیچھے ہٹے لیکن اس کوشش میں ان کا گھوڑا مارا گیا۔ بادشاہ کے آدمیوں نے ان پر بڑی مشکل سے قابو پایا اور ان دونوں کو قتل کر دیا گیا۔ ابھی اس ناگہانی افتاد کا اثر کم بھی نہ ہوا تھا کہ شور اٹھا جیسلمیر کا راجا مالد بادشاہ کو گرفتار کرنے آن پہنچا ہے۔ بادشاہ کا گھوڑا کام آ چکا تھا۔ ایک گھوڑا حمیدہ با کی سواری میں تھا، بادشاہ کے آدمیوں میں خوف و ہراس پھیلا ہوا تھا۔ بادشاہ نے تردی بیگ نامی ایک امیر سے درخواست کی کہ "ہمیں سواری کے لئے ایک گھوڑا دے دو؟"

لیکن تردی بیگ نے انکار کر دیا۔ بادشاہ پیشانی پر ناگواری کی شکن لائے بغیر ایک اونٹ کی طرف بڑھے اور حمیدہ بانو کو گھوڑے پر آگے بڑھنے کا حکم دیا۔ ندیم بیگ نامی ایک دوسرا امیر آگے بڑھا اور اپنا گھوڑا بادشاہ کی خدمت میں پیش کر دیا اور پھر یہ آوارہ گردوں ا بدنصیبوں کا قافلہ عمرکوٹ کی طرف روانہ ہو گیا، راستے میں مالدیو کے آدمیوں نے روکنے ک کوشش کی لیکن بادشاہ کے کسی تیرانداز کے تیر نے اتفاقیہ طور پر مالدیو کی سپاہ کے سردا کو زخمی کر کے گھوڑے سے گرا دیا جس سے اس کی سپاہ ڈر کر بھاگ گئی اور بادشاہ کا قافل عمرکوٹ پہنچ گیا۔

عمرکوٹ کا رانا بادشاہ کے استقبال کے لئے خود آیا اور نہایت عزت و احترام ا اپنے قلعے میں لے گیا اور بادشاہ کے آدمیوں کو قلعے کے باہر ہی رکھا۔

جیسا کہ میں پیچھے لکھ آیا ہوں کہ اب میں بادشاہ سے رخصت ہو جانا چاہتا تھا مجھے بادشاہ کے روشن مستقبل پر ذرا بھی یقین نہ رہا تھا میرا خیال تھا کہ اس دورِ غربت و مسافرت میں کسی جگہ بھی بادشاہ مارا جا سکتا تھا۔ جب میں نے بادشاہ سے رخصت کی اجازت چاہی تو انہوں نے دریافت کیا۔ "اب کہاں جاؤ گے؟"

میں نے جواب دیا۔ "میں کابل جانا چاہتا ہوں۔"

بادشاہ کچھ دیر متفکر رہے، پھر فرمایا۔ "اچھا، اگر تم جانا ہی چاہتے ہو تو ضرور جا ہمارے حالات بھی بڑے غیر یقینی ہیں اور پتہ نہیں کس وقت کیا ہو جائے؟" پھر پوچ "ہم تم سے چند سوال کرنا چاہتے ہیں کیا تم ان کے جوابات خدا کو حاضر و ناظر جان کر صحیح د دو گے؟"

میں نے فدویانہ عرض کیا۔ "حضرت سلامت نے اب تک اس ناچیز پر جو کرم گستر فرمائی ہے وہ مجھے، اگر چاہوں بھی تو جھوٹ نہ بولنے دے گی۔"

بادشاہ خوش ہو گیا اور کہا۔ "کامران ہمارا بھائی ہے اور ہم تمہارے بادشاہ ہیں، تم
ے کوکہ (دودھ شریک) ہو، اب ہمیں یہ بتاؤ کہ اگر کوئی وقت پڑے تو تم کس کا ساتھ
، کامران کا یا ہمارا؟"

میں پریشان ہو گیا، جواب کے ایک طرف کنواں تھا تو دوسری طرف کھائی۔ اگر میں
ا کے حق میں جواب دیتا جو میرا کوکہ تھا تو بادشاہ کی ناراضی کا خطرہ تھا اور اگر جھوٹ
بادشاہ کی حمایت میں جواب دیتا تو شریف النفس بادشاہ شاید یہ سوچنے لگتا کہ جو اپنے
انہ ہوا وہ کسی اور کا کیس طرح ہو گا۔ اچانک وجدان کی روشنی عقل کی گمراہی پر غالب
ر میں نے جواب دیا۔ "اعلیٰ حضرت! رسول اللہ ﷺ کی حدیث ہے کہ مسلمانو! تم اپنے
ی کی مدد کرو، خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم اور جب کسی نے یہ پوچھا تھا کہ ظالم کی مدد
طرح کی جائے؟ تو آپ نے جواب دیا تھا کہ ظالم کی مدد یہ ہے کہ اسے ظلم سے روک
ائے!"

بادشاہ میرے جواب سے بہت خوش ہوئے اور مجھے واپسی کی اجازت دیتے
ے فرمایا۔ "ہماری پھوپی کو اپنے ساتھ لے جاؤ، وہ کامران کو راہ راست پر لانے کی
ش کریں گی۔"

میں بادشاہ کی پھوپی خانزادہ بیگم کو لے کر کابل روانہ ہو گیا۔ اس وقت جہاں
بادشاہ کی ہم نشینی چھوڑنے کا غم تھا وہیں یہ خوشی بھی تھی کہ میں حمیدہ بانو اور بادشاہ
پُر مسرت ملاپ کی تلخی سے محفوظ ہو گیا تھا۔

مجھے راستے ہی میں اس بات کا علم ہو گیا تھا کہ آکا مرزا میرزا ہندال کے علاقے
ھار پر قبضہ کرنے کی فکر میں ہیں۔ قندھار کے حکمران قراچہ خاں نے ازراہِ نوازش
بادشاہ نوازی اپنے ایک مکتوب کے ذریعے قندھار کی حکومت مرزا ہندال کو
ش دی تھی لیکن آکا مرزا اس فکر میں تھے کہ قندھار بھی اپنے قبضے میں کر لیا جائے۔

حضرت بادشاہ کی پھوپی خانزادہ بیگم نے مجھے حکم دیا کہ "کابل کے بجائے قندھار
ر، میں وہیں کامران مرزا کو بلا کر دونوں بھائیوں (آکا مرزا اور مرزا ہندال) میں اتحاد کرا
ں گی۔"

ہم بدقت تمام قندھار پہنچ گئے۔ عسکری مرزا، آکا مرزا کے حکم پر اس کا محاصرہ
ئے ہوئے تھا۔ ہمیں قندھار میں داخلے کی اجازت نہیں ملی، باہر ہی روک لیا گیا۔ عسکری مرزا
ی پھوپی کی خدمت میں آداب بجا لایا، خانزادہ بیگم (پھوپی) نے عسکری مرزا کو حکم دیا کہ

"کامران مرزا کو فوراً بلاؤ، میں اُس سے کچھ باتیں کرنا چاہتی ہوں۔"

چوتھے دن آکا مرزا بھی حاضر ہوگئے۔ وہ خانزادہ بیگم سے ادب و احترام سے آتے لیکن مجھے خشمگیں نظروں سے دیکھا۔ خانزادہ بیگم انہیں خلوت میں لے گئیں اور کچھ د تک سمجھاتی رہیں جس کا تفصیلی علم نہ ہو سکا بعد میں اتنا ضرور معلوم ہوا کہ وہ آکا مرزا کو اتحا اخلاص کی تلقین کرتی رہیں اور آکا مرزا اس پر مصر رہے کہ کابل کی طرح قندھار میں بھی اُن نام کا خطبہ پڑھا جاتے۔

پھر آکا مرزا اور خانزادہ بیگم میں زور زور سے باتیں ہونے لگیں۔ خانزادہ بیگ رہی تھیں۔ "کامران! اگر تم مجھ سے پوچھتے ہو تو میں یہی کہوں گی کہ ہمایوں کی بادشاہت فیصلہ خود فردوس مکانی (بابر) فرما گئے ہیں اور ایک عرصے تک تم خود بھی اسی کے نام کا پڑھتے رہے ہو، تمہیں اب بھی ہمایوں کو اپنا بڑا سمجھنا چاہیئے، اس کی فرماں برداری کرو کہ اسی میں ہم سب کی نجات ہے۔"

آکا مرزا اپنی بات پر اڑے ہوتے تھے۔ بولے۔ "آپ کا ارشاد بجا لیکن اعلا یہاں سے بہت دور رہیں سر دست ہمارے ہی نام کا خطبہ پڑھ دیا جاتے پھر جب ا آجائیں گے تو اُن کے نام کا خطبہ شروع کرا دیا جاتے گا۔"

شاید دونوں کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکے تھے۔ آکا مرزا منہ بناتے ہوتے باہ اور مجھے ایک بار پھر خشمگیں نظروں سے دیکھا۔ جلتے جلتے انہوں نے مجھے اپنے سات کا اشارہ کیا۔ وہ مجھے ایک دوسرے خیمے میں لے گئے۔ اُن کے تیور ہی سے میں نے اپنی قہ کا فیصلہ پڑھ لیا تھا۔

وہ خود تو بیٹھ گئے لیکن مجھے کھڑا رکھا۔ بولے "ہم نے تو یہی چاہا تھا کہ تجھے اعلا منصب پر فائز کر دیں لیکن تو کوتاہ اندیش، کم ہمت اور بزدل ہے، تو نے اپنی عمر عز بہترین حصہ بلا وجہ ضائع کر دیا، اگر ہم تجھ سے یہ سوال کریں کہ تو نے اپنے منصوبے کو کس ح تک پایۂ تکمیل کو پہنچایا تو تو اُس کا کیا جواب دے گا؟"

میں نے جواب دیا۔ "آکا مرزا! عملاً بادشاہ کا کام تمام ہو چکا ہے اور جسے خدا ذلیل کر چکا ہو اسے انسان کیوں ذلیل کرے؟"

آکا مرزا نے شاہانہ روش اختیار کر رکھی تھی۔ اُن کے اطوار اور باتوں سے کوئی شخص بھی یہ محسوس کر سکتا تھا کہ آکا مرزا میں ایک بادشاہ کا مزاج جلوہ گر ہے، اُن کا درشت اور شاہانہ تھا۔ انہوں نے مجھے بُرا بھلا کہنا شروع اور صاف صاف جتا دیا

مرزا! اِس وقت تو دنیا کا بدقسمت ترین انسان ہے کیونکہ تو نہ تو آوارہ گرد ہمایوں کا حاصل کر سکا اور نہ ہی ہماری نظر میں معتمد رہا۔ ہم تجھے شک کی نظر سے دیکھنے پر مجبور تیرا آزاد رہنا ہمارے لیئے خطرے کا موجب ہے!"

اُس کے بعد انہوں نے تالی بجائی اور مجھے چند سپاہیوں کے حوالے کرتے ہوتے

ا۔ "اِسے کابل کے قلعے میں قید کر دیا جاتے!"

اس خلاف اُمید حکم نے میرے اوسان خطا کر دیے۔ اُسی وقت اُن سپاہیوں نے اِدیا اور میرے ہاتھ پاؤں باندھ دیے۔

آہ، میں اِن اذیتوں کو کن لفظوں میں بیان کروں جو مجھے آکا مرزا کی طرف سے ی گئیں۔ وہ تمام قدرتی نعمتیں، جنہیں انسان کوئی قیمت ادا کیئے بغیر حاصل کر لیتا مجھے اُن سے محروم کر دیا گیا۔ روشنی۔ میں ایک عرصے تک اس سے محروم رہا، ہوا۔ د تاریک کوٹھری کی گھٹن میں، میں ایک ایک جھونکے کو ترس گیا۔ ہم جنسوں کی آوازیں پھ پتہ نہ تھا کہ میں اب بھی انسانوں کی دنیا میں ہوں یا گوشۂ قبر میں نکیرین کا منتظر ۔پانی۔ نیم گرم پانی نے میرے معدے کو تباہ کر کے رکھ دیا۔ کھانا۔ جو کبھی ملتا اس تو لذت ہوتی اور نہ مقدار میں اتنا ہوتا کہ میں پیٹ بھر سکتا۔ ایک مدھم سی شمع یوں ا رہتی جیسے تاریک ترین رات میں آسمان پر منحنی اور کمزور سا ایک تنہا ستارہ ۔ مجھے ا دنیا کا کچھ پتہ نہ تھا کہ وہاں کیا ہو رہا ہے۔ شب و روز کا تصور تک ختم ہو چکا تھا، وٹھڑی اُس کمرے کی مانند تھی جہاں ہمیشہ رات رہتی ہو۔ اس ماحول نے میرے جملہ ب کو متاثر کیا، ماضی کی یادیں اور اُن کا تصور میرے حق میں کتاب کی طرح تھا جسے کر میں دل بہلانے کی کوشش کرتا رہتا۔ نامعلوم لیکن تاریک خیالی مستقبل قبر کی طرح ھولے سامنے کھڑا تھا اور میں چیونٹی کی چال سے زندگی کا سفر طے کرتا اُس کی طرف ا چلا جا رہا تھا۔

ایک دن خلافِ معمول آکا مرزا کی آواز سنائی دی، وہ ایک سائے کی طرح سامنے ے مجھ سے مخاطب تھے۔

"علی مرزا! کیا تیرے ہوش و حواس اب بھی کام کر رہے ہیں؟"

میرا دل اِس حد تک بجھ چکا تھا کہ اِس آواز نے نہ تو مجھے خوش کیا نہ مشتعل۔

آ کا مرزا نے کہا۔ "کیا تو یہاں سے نکلنا پسند کرے گا؟"

میں نے کمزور آواز میں جواب دیا۔ "میں موت کا منتظر ہوں آ کا مرزا! آپ جائیں اور مجھے مرجانے دیں۔"

وہ ہنسے اور میرا ہاتھ پکڑ کر باہر لے آئے۔ مجھے یاد نہیں کہ وہ مجھ سے کہتے رہے۔ سورج کی روشنی میں میری آنکھیں کام نہیں کر رہی تھیں اور مجھے یہ معلوم ہوا کہ میری بصارت بہت زیادہ زائل ہو چکی ہے۔ میرے قدم لڑکھڑا رہے چلنے کی عادت بھلا چکے تھے۔ کئی جگہ میں گرتے گرتے بچا۔

آ کا مرزا مجھے ایک نہایت پر تکلف کمرے میں لے گئے، مجھے وہاں کی دھندلی دھندلی نظر آتی تھی، حد تو یہ ہے کہ روشن جبیں دیر تک وہاں موجود میں اسے پہچاننے تک سے قاصر رہا۔ آ کا مرزا نے لذیذ ترین کھانے میرے سامنے لیکن میری اشتہا تو کب کی ختم ہو چکی تھی۔ جب میں نے کھانے سے بھی منہ موڑ لیا آ کا مرزا کو پہلی بار اپنے ظلم و جور کا احساس ہوا اور شاید اپنی اس زیادتی پر پشیمان ہوتے، بولے "علی مرزا! غلطیاں انسان ہی سے ہوتی ہیں، تم پر جو کچھ بیتی اس میں مرضی ہرگز شامل نہ تھی۔ ہم تو ادھر ادھر مہمات میں الجھے رہے اور تم قید تنہائی بھگتے لیکن ہم جیسے ہی واپس آئے پہلے تمہارے پاس پہنچے۔" پھر روشن جبیں کو آواز "روشن جبیں! کیا تم نے بھی علی مرزا کو نہیں پہچانا؟ ادھر آؤ ان کے قریب۔ علی بینائی کو شاید تاریکی کھا گئی ہے۔"

روشن جبیں جب بالکل میرے قریب آ گئی تو میں نے بھی اسے پہچان کی مغائرت اور اجنبیت کی روش سے مجھے یہ احساس گزرا کہ شاید وہ بھی اس کو نہ پہچاننے ہی میں بہتری محسوس کر رہی ہے۔

آ کا مرزا نے کہا۔ "علی مرزا! اگر تم چاہو تو روشن جبیں کے ساتھ کچھ د گزار لو۔"

میں نے افسردگی سے جواب دیا۔ "نہیں اب میں اس کی ضرورت ن محسوس کرتا۔"

آ کا مرزا نے بھی مزید اصرار نہیں کیا اور سر کے اشارے سے روشن جبیں جانے کا حکم دیا۔

تنہائی میں آ کا مرزا دیر تک تسلی دلاسے دیتے رہے، انہوں نے مجھے دلایا کہ میرے جو اعضا بھی متاثر ہوتے ہیں وہ شاہی طبیب سے ان کی پچھلی توانائی بحال کرا دیں گے۔ وہ کئی دن بعد حرفِ مطلب زبان پر لاتے ہوئے بولے۔ "علی مرزا! تم ہمارے دودھ شریک ہو اور یہ دودھ ہی کا اثر ہے کہ ہم تمہیں اس کال کوٹھڑی سے باہر نکال لائے۔ کوکہ کی حیثیت سے تم پر ایک فرض عائد ہوتا ہے کیا تم اسے پورا کرنے پر آمادہ ہو؟"

میں نے زبان کے بجائے آنکھوں سے پوچھا۔ "وہ کیا؟"

آ کا مرزا چبا چبا کر بولے۔ "ہمایوں ایران پہنچ چکا ہے اور طہماسپ صفوی سے امداد کا طالب ہے، حالانکہ تمہیں یاد ہوگا کہ تم نے خود ہی ہم سے یہ کہا تھا کہ عملاً ہمایوں کا کام تمام ہو چکا ہے اب اس کی طرف سے فکر مند ہونے کی کوئی ضرورت نہیں لیکن وہ تو بہت ہی سخت جان نکلا علی مرزا۔ ہمیں ڈر ہے کہ صفوی بادشاہ اسے مدد دے کر پھر سے بادشاہ نہ بنا دے، اب ہمیں ایک جنگ لڑنی ہے جو ہتھیاروں سے نہیں باتوں سے لڑی جائے گی!"

آ کا مرزا اپنی باتوں کا تاثر جانچنے کے لیئے رکے اور تیز نظروں سے میرا چہرہ دیکھنے لگے لیکن اس وقت میرا چہرہ ہر قسم کے جذبات سے عاری تھا۔ انہوں نے پوچھا۔ "علی مرزا! کیا تم ہماری باتیں سن رہے ہو؟ کیا تمہاری قوتِ سماعت صحیح کام کر رہی ہے؟"

میں نے سر ہلا کر جواب دیا۔ "ابھی میں بہرا نہیں ہوا!"

آ کا مرزا نے کہا۔ "خدا کا شکر ہے کہ تم بہرے نہیں ہوئے، ہاں تو ہم یہ کہہ رہے تھے کہ تم ایران چلے جاؤ، ہمایوں سے ملو اور اسے ہمارے جبر و ظلم کی داستان سنا کر اپنے اعتماد میں لے لو، یہاں تک پہنچ جاؤ تب تم نہایت ہوشیاری سے کسی بھی طرح صفوی حکمران کو یہ یقین دلانے کی کوشش کرنا کہ ہمایوں ایک نااہل انسان ہے اسے کسی قسم کی بھی مدد دینا، اپنی دولت اور آدمیوں کا نقصان کرنا ہے صفوی بادشاہ کو ہر قیمت پر ہمایوں کی دستگیری سے روکنا ہے۔"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا اور گم سم پاگل کی طرح ان کی صورت دیکھتا رہا ــــ دھندلی دھندلی غبار آلود صورت۔

آ کا مرزا نے پھر سوال کیا۔ "علی مرزا! تمہارے ہوش و حواس صحیح کام کر رہے ہیں؟"

میں نے پھر جواب دیا کہ "ہاں ابھی میں پاگل نہیں ہوا۔"

آکامرزا نے کہا۔ "خدا کا شکر ہے کہ تم پاگل نہیں ہوئے۔ تب پھر تم کب تک ایران چلے جاؤ گے۔ جب تم اپنے منصوبے میں کامیاب ہو کر واپس لوٹو گے تو قندھار کی حکومت تمہیں خوش آمدید کہے گی۔ اور روشن جبیں، اپنی دس حسین و جمیل کنیزوں کے ساتھ اپنی مسکراہٹ سے تمہارا استقبال کرے گی!"

شاید پہلی بار میں مسکرایا اور اس گونگے کی طرح زبان کھولی، جو بولتے بولتے ایک دم، مدتِ مدید کے لئے خاموش ہو گیا ہو، اور سالہا سال کے بعد وہ پھر بولنے پر مجبور کر دیا گیا ہو۔ میں نے اٹک اٹک کر کہا۔ "آکامرزا! گو کہ مجھ پر بڑے ظلم ہوتے ہیں لیکن تم میرے دودھ شریک بھائی ہو۔ میں اب بھی تمہارا وفادار ہوں، مجھے خوشی اس بات کی ہے کہ تمہارے دل میں میرے لئے جو شکوک اور غلط فہمیاں پیدا ہو گئی تھیں وہ دور ہو گئیں۔"

"اوہ ہمارے بھائی علی مرزا!" یہ کہہ کر آکامرزا مجھ سے لپٹ گئے اور دیر تک میری پیشانی اور شانوں کے بوسے لیتے رہے، میں نے بھی گرم جوشی سے یہی عمل دہرایا۔

اب میرے دل سے آکامرزا کا احترام نکل چکا تھا، اب وہ میری نظر میں ایک بد ترین خلائق انسان تھا۔

آکامرزا نے میری طرح کئی اور آدمی بھی اس منصوبے پر کام کرنے کے لیے ایران بھیج دیے تھے۔ جب مجھے بادشاہ ہمایوں کی خدمت میں پیش کیا گیا تو وہ کچھ دیر تک مجھے پہچان ہی نہ سکے۔ جب میں نے آکامرزا کے ظلم و جور کی داستان سنا کر بادشاہ سے اپنا تعارف کرایا تو انہیں بڑا افسوس ہوا۔ بولے۔ "کامران کو یہ ہو کیا گیا ہے، ہمیں یقین ہے کہ ظلم کی ناؤ، جس میں وہ سفر کر رہا ہے، ایک نہ ایک دن اسے ضرور لے ڈوبے گی۔"

اب میں واقعی بادشاہ کا اعتماد حاصل کرنا چاہتا تھا، میں نے اپنی آمد کی غرض و غایت بتا کر بادشاہ سے عرض کیا۔

"اعلیٰحضرت! اب بہت زیادہ ہوشیاری کی ضرورت ہے، آکامرزا کے کئی آدمی اس مقصد سے ایران آتے ہیں کہ شاہ صفوی کو حتی الامکان آپ کی امداد و اعانت سے باز رکھیں۔"

بادشاہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ دوپہر کے کھانے پر بادشاہ کے ساتھ مجھے بھی بیٹھنے کا اتفاق ہوا۔ بڑی بڑی مونچھوں والا شاہ طہماسپ صفوی ہمارا میزبان تھا۔ ایرانی امرا

ـ صف میں مؤدب ہمارے روبرو کھڑے تھے۔

صفوی بادشاہ نے ہمارے بادشاہ سے اچانک سوال کیا۔ "ہم حیران ہیں کہ آپ یا عظیم حکمران کس طرح اپنے کمزور دشمن سے شکست کھا گیا؟ شیر خان ایک معمولی امیر غلیہ سلطنت پر آخر کس طرح غالب آ گیا؟"

ہمارے بادشاہ نے آزردگی سے جواب دیا۔ "بھائیوں کا نفاق شیر خان کی مدد پر ا جس سے وہ جیت گیا۔"

صفوی حکمران نے چونکا دینے والا سوال کیا۔ "کہیں ایسا تو نہیں کہ آپ کا اپنے بھائیوں کے ساتھ سلوک اچھا نہ رہا ہو اور یہ کہ اب تک آپ ان کے ساتھ جس طرح پیش تے رہے ہیں وہ ناپسندیدہ ہو۔"

ہمارے بادشاہ نے جواب دیا۔ "ہاں یہ ہماری نرمی اور مروت ہی تو تھی جس نے نہیں سر اٹھانے کا موقع دیا اگر ہم انہیں بھائی کی جگہ سرکش اور باغی سمجھتے اور ان سے یسا ہی سلوک روا رکھتے تو شاید آج ہمیں یہ روزِ بد دیکھنا نصیب نہ ہوتا۔"

صفوی بادشاہ نے اپنے روبرو کھڑے ہوئے چھوٹے بھائی بہرام میرزا کو شارے سے حکم دیا کہ وہ آفتابہ اور طشت لے کر آگے بڑھے اور بادشاہ کے ہاتھ ھلائے۔

شہزادہ بہرام میرزا ادنیٰ خادم کی طرح آگے بڑھا اور بادشاہ کے ہاتھ دھلانے لگا مفوی بادشاہ نے آنکھ کے اشارے سے بہرام میرزا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ہمارے ادشاہ سے کہا۔ "بھائیوں کو اس طرح رکھنا چاہیئے!"

بہرام میرزا کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ شاید اسے اس بات سے بہت دکھ پہنچا تھا۔ آکامرزا کے شاطر بھی کسی طرح اس واقعے سے آگاہ ہو گئے اور انہوں نے بہرام میرزا کو اس بات پر آمادہ کر لیا کہ وہ کسی بھی طرح طہماسپ صفوی کو ہمایوں سے دست کشی پر آمادہ کر لے۔ چنانچہ سننے میں یہ آیا کہ بہرام میرزا نے کئی بار اپنے بڑے بھائی کو یہ یقین دلانے کی کوشش کی کہ "ہندوستان جیسے پڑوسی ملک پر امیر تیمور کی اولاد کی مضبوط حکومت ایران کے لیے ہمیشہ خطرے کا باعث رہے گی۔"

لیکن شاہ طہماسپ نے کسی بات کا کوئی اثر نہ لیا۔ اس نے ہمارے بادشاہ کو ایک شاندار دعوت دی، سات دن تک اس ضیافت کی تیاریاں ہوتی رہیں۔ چھ سو شامیانے نصب کیے گئے اور بارہ مقامات پر شادیانے اور نقارے آٹھوں پہر بجتے رہے۔ شامیانوں کے

نیچے نہایت قیمتی شاہی دریاں بچھائی گئیں۔ پہلے دن تو محض کھانے پینے تک ہی گرمیِ محفل رہی، دوسرے دن شاہانہ خلعت، مرصع شمشیر اور مرصع خنجر عطا ہوتے اور صفوی حکمران نے ہمارے بادشاہ کو اپنے پہلو میں بٹھایا۔ اس تقریب میں جو اشیاء بھی موجو تھیں، ہمارے بادشاہ کو عطا کر دی گئیں۔ خیمے، چادر، قالین، گھوڑے، اونٹ اور خچر ایک بلند مقام پر جمع کر دیے گئے سلطنت اور لازمۂ سلطنت میں جو چیزیں بھی آتی ہیں وہ سب ہمارے بادشاہ کو عطا ہوئیں۔ شاہ صفوی نے اپنے بیٹے سمیت بارہ ہزار سواروں کی فوج مرحمت فرمائی اور کہا کہ اور سامان بھی فراہم کیا جاتے گا۔

پھر صفوی بادشاہ کھڑا ہو گیا۔ ہمارا بادشاہ بھی احتراماً کھڑا ہوا۔ صفوی بادشاہ اپنے سینے پر ہاتھ رکھا اور ہمارے بادشاہ سے کہا۔ "ہمایوں بادشاہ! آپ کے لئے یہاں کوئی کمی نہیں۔"

اِدھر سے فارغ ہو کر بادشاہ قندھار پر حملہ آور ہوا۔ اور اسے فتح کر کے کابل روانہ ہو گیا۔ عمر کوٹ میں حمیدہ بانو سے بادشاہ کا ایک لڑکا پیدا ہوا تھا، جس کا بادشاہ جلال الدین اکبر نام رکھا تھا۔ ان دنوں یہ شہزادہ آکا مرزا کے قبضے میں تھا اس نے شہزادے کو قلعے کی فصیل پر عین اسی جگہ بٹھا دیا جہاں گولہ باری ہو رہی تھی لیکن جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے۔ مستقبل کے بادشاہ پر سات ولیوں کا سایہ تھا، زندہ رہا۔ بادشاہ نے کابل بھی فتح کر لیا۔ آکا مرزا اپنے کنبے کے ساتھ بچ نکلا۔

بادشاہ آکا مرزا کا تعاقب کرتا رہا، آخر تنگ آ کر اس نے بادشاہ سے رحم کی درخواست کی۔ بادشاہ نے اسے پھر معاف کر دیا اور اپنے روبرو حاضر ہونے کا حکم دیا ان دنوں بادشاہ جلال آباد کے شمال میں تالیقان کے قلعے میں ٹھہرا ہوا تھا۔ میر خاں سا کا قاصد بادشاہ کی خدمت میں عرض پرداز ہوا کہ "مرزا کامران حاضری کا خواست گا ہے۔"

بادشاہ نے بے چینی سے جواب دیا۔ "حاضر کرو۔"

قاصد کے جاتے ہی بادشاہ نے ایک فرمان جاری کیا کہ "مرزا کامران آ رہا ہے۔ وزرا اور امرا اس کے استقبال کو آگے بڑھیں اور خوشی کے نقارے بجائے جائیں۔"

نقاروں اور شادیانوں کی آوازوں میں آکا مرزا نمودار ہوا وزراء اور امراء کے آس پاس اس کے استقبال کو کھڑے تھے جب وہ ان کے بیچ سے گزر کر اس فر پہنچا جہاں مرزا ہندال بیٹھا تھا تو آکا مرزا نے وہیں بیٹھ جانا چاہا لیکن بادشاہ نے شفق

ے حکم دیا۔ "وہاں نہیں، تم ہمارے قریب آؤ!"

آکا مرزا نے ایک امیر کی کمر سے رومال کھول لیا اور اسے اپنی گردن میں ڈال کر رہ لگا لی۔ اس طرح وہ خود کو بادشاہ کا قیدی ظاہر کرنا چاہتا تھا۔

جب وہ بادشاہ کے قریب پہنچا تو بادشاہ نے رومال کو کھول کر پھینک دیا اور کہا۔ "کامران مرزا، تم ہمارے بھائی ہو، قیدی نہیں، اس کی کوئی ضرورت نہیں!"

اس کے بعد آکا مرزا کو گلے سے لگا لیا۔ پھر شربت طلب کیا اور نصف پی کر بقیہ کامرزا کو پلا دیا۔

بادشاہ نے اس موقع پر بڑی خوشی کا اظہار کیا۔ آکا مرزا کی مضطرب نظریں شاید مجھے تلاش کر رہی تھیں اور جب انہوں نے مجھے پا لیا تو مجھے ایسا محسوس ہوا کہ آکا مرزا اب بھی راہِ راست پر نہیں آیا۔

کتنے دن بعد بادشاہ نے کامران مرزا کو کولاب کا قلعہ مرحمت فرمایا۔ آکا مرزا بادشاہ سے رخصت ہو کر کولاب چلا گیا اور ابھی کچھ ہی دن گزرے تھے کہ اطلاع آئی کہ آکا مرزا نے بادشاہ کے علاقوں پر تاخت و تاراج شروع کر رکھی ہے۔ بادشاہ نے پریشان ہو کر آکا مرزا سے کہلایا کہ "اب تم یہ کیا کر رہے ہو، اگر تم اور علاقہ چاہتے ہو تو ہم وہ بھی دے دیں گے!"

آکا مرزا نے اس کا یہ جواب دیا کہ "اعلیٰحضرت! غلام نے فقیری اختیار کر لی ہے، مجھے اب سلطنت سے کوئی سروکار نہیں۔" لیکن اطلاعیں برابر یہی آتی رہیں کہ تارک الدنیا آکا مرزا لوٹ مار کا ایک بازار گرم کیے ہوتے ہے۔

اور ایک بار پھر جنگ و جدال کا سلسلہ چل نکلا۔ اس جنگ و جدال میں آکا مرزا کے ہاتھوں مرزا ہندال کو شہادت نصیب ہوئی۔ آکا مرزا شکستیں اٹھاتا ہوا ہندوستان میں داخل ہو گیا اور دریائے سندھ کے پار آدم گکھر کے پاس پناہ لی۔ آدم گکھر نے آکا مرزا کو قید کر کے بادشاہ کو مطلع کر دیا۔ بادشاہ دیوانہ وار آدم گکھر کے پاس پہنچے۔ آدم نے نہایت احترام اور آداب کے ساتھ بادشاہ کا استقبال کیا۔ بادشاہ نے آکا مرزا سے ملاقات کی۔ اس موقع پر ایک رکابی میں تربوز کی قاشیں بادشاہ کی خدمت میں پیش کی گئیں۔ بادشاہ نے نصف خود کھا لیں اور نصف قاشیں آکا مرزا کو بخش دیں۔

آکا مرزا کو قید میں پڑے ہوئے چار دن گزر گئے۔ اس دوران امرا، وزراء اور مفتیانِ دین میں بڑی گرم گرم بحثیں ہوتی رہیں۔ وہ سب بادشاہ کو یہ مشورہ دے رہے

تھے کہ اب آکامرزا کو معاف نہ کیا جائے!

بادشاہ نے ایک رات مجھے طلب کیا اور مجھ سے دریافت کیا۔ "علی مرزا! کیا تو جانتا ہے کہ ہم تجھے کہاں بھیج رہے ہیں؟"

میں نے عرض کیا۔ "بندہ منشاءِ سلطانی سے لاعلم ہے!"

بادشاہ نے آکامرزا کے خیمے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا "اس خیمے کی اندرونی خدمت تیرے سپرد ہے، اب نیند تیرے لئے حرام ہے۔"

اس حکم کے بعد میں خیمے میں داخل ہو گیا۔ آکامرزا نے مجھے اس طرح دیکھا جیسے پہچانتا ہی نہ ہو۔ عشاء کی نماز پڑھ کر آکامرزا نے مجھ سے پوچھا۔ "علی مرزا! کیا بادشاہ ہمیں قتل کرا دیں گے؟"

میں نے طنزاً جواب دیا۔ "بادشاہ کے مزاج سے بادشاہ ہی واقف ہوگا۔"

پھر آکامرزا نے مایوسی سے کہا۔ "بہر حال جو کچھ بھی ہو، علی مرزا! امسال ہمارے چھ روزے قضا ہو گئے تھے کہ تم انہیں ہمارے عوض ادا کر دو گے؟"

میں نے جواب دیا۔ "میں رکھ تو سکتا ہوں لیکن یہ قضا جناب خود ہی ادا فرمائیں تو مناسب ہوگا۔"

اس کے دوسرے دن مفتیانِ دین اور امرا نے مل جل کر ایک محضر نامہ تیار کیا جس کی ابتدا اس مصرعے سے کی گئی تھی۔

(درختہ گیر ملک سر افگند بہ درختہ گیر۔ ملک کا سر قطع کر دیا جائے۔)

بادشاہ نے بدرجۂ مجبوری حکم دیا۔ "افسوس کہ ہم قتل کا حکم نہیں دے سکتے!" پھر فرمایا۔ "کامران کو اندھا کر دیا جائے۔"

اس حکم کے بعد بادشاہ وہاں سے ہٹ گئے۔ کئی طاقتور اور توانا آدمی آکامرزا کے خیمے میں داخل ہوئے۔ ان میں سے غلام علی نامی بھاری تن و توش کا سپاہی آگے بڑھا اور بڑے سے رومال کو لپیٹ کر گیند بنائی پھر اسے زبردستی آکامرزا کے منہ میں ٹھونس دیا۔ آکامرزا نے بے اختیار اپنے ہاتھ پھیلا دیے۔ دو آدمیوں نے ہاتھوں کو پیچھے باندھ دیا اور خیمے سے باہر لے آئے، وہاں کچھ لوگوں نے آکامرزا کو زمین پر گرا دیا اور اس کے جسم اور ٹانگوں کو پوری طرح قابو میں کر کے آنکھوں میں نشتر چبھونے لگے۔ جب پانچ نشتر چبھوتے جا چکے تو آکامرزا نے اپنی ٹانگوں پر بیٹھے ہوئے شخص سے کہا۔ "تو ہماری ٹانگوں پر کیوں بیٹھا ہے؟ انہیں تو چھوڑ دے!"

لیکن کسی نے بھی اس کی باتوں پر توجہ نہ دی اور کم و بیش پچاس نشتر دونوں آنکھوں میں چبھوتے گئے۔ اس کے بعد ایک شخص نمک دان لے کر آگے بڑھا اور چٹکیوں سے پسا ہوا نمک نشتر زدہ آنکھوں میں بھر دیا۔ درد کی شدت میں آکامرزا "اللہ اللہ" کرتے رہے۔

مجھ سے آکامرزا کی یہ حالت نہیں دیکھی گئی، میں بھاگ کر بادشاہ کے خیمے کے در پر کھڑا ہو گیا۔ کچھ دیر بعد بادشاہ نے مجھے اندر طلب فرمایا اور پوچھا۔ "کیا ہمارے حکم پر عمل کر دیا گیا؟"

میں نے سہمے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ "اعلیٰحضرت! حرف بہ حرف۔ آکامرزا اندھے کر دیئے گئے!"

بادشاہ نے حکم دیا۔ "ہمارے غسل کے لئے پانی مہیا کیا جائے۔"

* * *

نابینا آکامرزا نے بادشاہ سے مدینہ منورہ جانے کی اجازت طلب کی جو دے دی گئی، میں ان سے ملنے گیا۔ قدموں کی آہٹ سن کر دریافت کیا۔ "کون ہے؟"

میں نے جواب دیا۔ "علی مرزا!"

پوچھا۔ "اب کیا لینے آئے ہو؟"

میں نے جواب دیا۔ "کچھ لینے نہیں دینے آیا ہوں۔"

دریافت کیا۔ "وہ کیا؟"

میں نے کہا۔ "ایک نصیحت۔ تم نے جو مظالم ڈھائے تھے اور جس جس طرح لوگوں کو ستایا تھا، تمہیں اس کا بدلہ اسی دنیا میں مل گیا!"

آکامرزا کی اکڑ اب بھی وہی تھی۔ بولا۔ "ہم نصیحتیں نہیں سننا چاہتے۔"

میں نے کہا۔ "نہ سنو، لیکن یہ تو بتا دو کہ روشن جبیں کہاں ہے؟"

آکامرزا نے جواب دیا۔ "جو خود ہی اندھا ہو اسے کیا پتہ کہ کون کہاں ہے۔"

میں نے غصے میں کہا۔ "او ظالم انسان، تو نے تو میری بینائی کو نقصان ہی پہنچایا تھا لیکن خدا نے تیری بینائی ایک سرے سے چھین لی۔"

آکامرزا خاموش رہا۔ اس کے بعد وہ مدینہ منورہ چلا گیا اور وہیں اس کا

انتقال ہوگیا۔

بادشاہ نے ہندوستان فتح کرلیا اور مجھے اُس کے طفیل بڑا عزت و آرام میسر آیا روشن جبیں کا کچھ پتہ نہ چلا کہ کہاں چلی گئی ہاں افواہاً یہ سننے میں آیا ہے کہ آگامرزا کے دورِ افراتفری اور ہنگامۂ فرار و انتشار میں خود اُس سے بھی کئی کنیزیں چھِن گئیں اور اُسے خود بھی یہ معلوم نہ ہوسکا کہ روشن جبیں کس کے قبضے میں چلی گئی۔

دھندلی بینائی اور غبار آلود نظروں کے سامنے جب بھی کوئی عورت اچانک آتی ہے تو میں غلطی اور خوش فہمی سے یہ سمجھ بیٹھتا ہوں کہ شاید روشن جبیں میری محبت کے ہاتھوں بے قرار ہوکر ڈھونڈتی تلاش کرتی میرے پاس آگئی ہے لیکن اے بسا آرزو کہ خاک شدی۔

※ ※ ※

مشرقی ہندوستان میں انگلستان کی تجارت کرنے والی مختلف سوسائٹیوں نے آپس میں اتحاد کر کے ایسٹ انڈیا کمپنی کی شکل اختیار کر لی تھی، پہلے اس کمپنی نے اپنے ایجنٹوں کے لئے فیکٹریاں اور اپنے مال کے لئے گودام تیار کئے پھر ان کی حفاظت کے لئے قلعوں کی ضرورت پیش آئی۔ جب قلعے تعمیر ہوتے تو ان کے لئے سپاہی ضروری سمجھے گئے اور جب سپاہیوں کی صورت میں افواج وجود میں آگئیں تو ان کے لئے علاقوں کی تسخیر کا کام فراہم کیا گیا۔ چونکہ سات سمندر پار سے آنے والی اس تاجر قوم کے لئے ہندوستان کی ہر شے اجنبی تھی اور ہندوستانیوں کے مقابلے میں وہ تعدادی اعتبار سے بھی کمزور تھے، اس لئے بندوق اور تلوار کے ساتھ ساتھ انہوں نے سیاست اور عیاری سے بھی کام لیا وہ جس قلعے یا علاقے کو فتح کرنا چاہتے، پہلے وہاں سازشیوں کے ہراول دستے بھیج دیتے جب یہ سازشی سورما اپنے شکار کو زخمی کر چکتے تو آخری اور فیصلہ کن ضرب ان تاجروں کی افواج لگا دیتیں۔

بنگال، اودھ، مدراس اور حیدر آباد کو زیر اثر لا چکنے کے بعد ان کی نظریں سرنگاپٹم کی مملکتِ خداداد پر جم گئیں۔ یہاں نواب حیدر علی کے بعد اس کا بڑا بیٹا فتح علی ٹیپو، سلطان کا لقب اختیار کر چکا تھا اور دہلی میں کِرم خوردہ، زنگ آلود اور گھنی ہوئی سلطنت مغلیہ کی موجودگی میں، انگریزوں کی ایما کے بغیر ٹیپو کا سلطان بن جانا بڑی جرأت کی بات تھی، آس پاس کی خود مختار ریاستیں سلطان ٹیپو کو رشک و حسد کی نظروں سے دیکھ رہی تھیں، سرنگاپٹم کے شمال مغرب میں پیشوائے پونا بھی اس نومولود مسلم قوت کو فکر و تشویش سے دیکھ رہا تھا۔ انگریز ہندوستانی ریاستوں اور معاصر طاقتوں کی رگِ رقابت پر انگلیاں رکھ کر اس جان لیوا مرض کی خوب اچھی طرح تشخیص کر چکا تھا۔

ٹیپو ان تاجروں کے عزائم کا اندازہ لگا چکا تھا وہ ان کے مقابل سینہ سپر ہوگیا، یورپ میں فرانس اور انگلستان آپس میں برسرِ پیکار تھے۔ ٹیپو بھی ان کی باہمی آویزش سے پوری طرح باخبر تھا۔ اس نے انگریزوں پر فرانسیسیوں کو ترجیح دی، اس نے دیسی ریاستوں سے خط وکتابت کی اور نہایت دردمندانہ انداز میں انہیں یقین دلایا کہ اگر اس مرحلے پر بھی ہندوستانی طاقتیں متحد اور متفق نہ ہو سکیں، تب وہ دن زیادہ دور نہیں کہ پورا ہندوستان انگریزوں کے قبضے میں چلا جاتے۔ ابنائے وطن کی خود غرضی، موقع پرستی اور سرد مہری کی ہمت شکن فضا سے بھی وہ مایوس

ہوا اور اس نے اپنی ہمعصر دوسری اسلامی حکومتوں سے خط وکتابت شروع کر دی، ایران، افغانستان اور ترکی کو سفارتیں بھیج کر انہیں امداد و اعانت پر آمادہ کرنے کی کوششیں کی گئیں اور ترکی کے سوا، سبھی نے امید افزا جوابات دیے۔

افغانستان کا زماں شاہ، جو احمد شاہ ابدالی کا پوتا تھا۔ وہ شمال مغربی سرحدوں سے فوج لے کر ہندوستان میں داخل ہوگیا۔ لیکن شاطر انگریز نے زماں شاہ کا مقابلہ اپنی افواج سے نہیں کیا۔ مراد آباد سے ایک شیعہ عالم ایران روانہ کر دیا گیا۔ جس نے عباس صفوی کو یہ یقین دلا دیا کہ افغانستان میں، اس کے ہم قوموں پر سخت مظالم ڈھائے جا رہے ہیں، عباس صفوی نے افغانستان پر حملہ کر دیا اور ہندوستان کی حدود میں انگریزوں کے خلاف صف آرا زماں شاہ اس حملے کی خبر سن کر افغانستان واپس چلا گیا۔ ٹیپو پھر تنہا رہ گیا۔

ٹیپو ہی کی طرح دھوندوجی واگیہ نامی ایک آوارہ گرد ہندو سردار بھی انگریزوں کے عزائم بھانپ چکا تھا اور اسے ٹیپو سے عقیدت ہوگئی تھی لیکن اس کے پاس نہ تو کوئی علاقہ تھا نہ کوئی قلعہ، اس نے اپنے آس پاس کچھ آدمی جمع کر لئے تھے اور ان کی مدد سے انگریزوں اور ان کے حلیفوں پر چھاپے مارنے لگا تھا۔ ٹیپو بھی اس کے کارنامے نہایت شوق سے سنا رہتا تھا، اور جب اسے یہ معلوم ہوا کہ دھوندوجی واگیہ اسلام پر مائل ہے تو اس کے دل میں ملاقات کی خواہش پیدا ہوگئی۔

واگیہ اپنے جاں نثاروں کے ساتھ گھوڑوں کو سرپٹ دوڑاتا ہوا دریائے شری وتی کے کنارے پہنچ گیا سامنے راجا آبشار آٹھ سو تینتیس فٹ کی بلندی سے گر رہا تھا۔ واگیہ اپنے ساتھیوں سمیت اس حسین اور پرلطف منظر میں کھو گیا۔ یہ لوگ چوکنا انداز میں گھوڑوں سے نیچے اتر پڑے۔ دھواں اڑاتا آبشار سب کے دلوں میں کھبا جا رہا تھا۔ اگر انگریزوں کا خوف دامنگیر نہ ہوتا تو واگیہ یہیں دریائے شری وتی کے آبشار "راجا" کے قرب و جوار میں رہ پڑتا کیونکہ پرامن زندگی کے لئے اس سے بہتر جگہ ملنی مشکل تھی۔

دھوتی کے پلو سے اس نے اپنا منہ پونچھا اور ایک پتھر پر بیٹھ کر بندوق سامنے رکھ لی۔ اس کے پچاس پچپن چوکنا اور مستعد ساتھی بھی فطرت کی رنگینیوں سے لطف اندوز ہونے لگے کچھ دیر بعد انہوں نے مغرب میں بھاگتے ہوئے ایک ہرن دیکھا، ان کے کان کھڑے ہوگئے۔ انہیں ہرن کی وحشت زدہ رفتار کو دیکھ کر یہ یقین ہو چکا تھا کہ اس کے پیچھے یا تو کوئی خونخوار درندہ ہے یا پھر انسان اس کا پیچھا کر رہے ہیں، ان میں ایک

شخص زمین پر دائیں کروٹ لیٹ گیا اور کان زمین سے لگا کر کچھ سننے کی کوشش کرنے لگا۔ بقیہ لوگ اس سمت منہ کر کے بندوقیں تان کر کھڑے ہو گئے جدھر سے ہرن بھاگ کر آیا تھا۔ واگیہ نہایت اطمینان سے اپنے ساتھیوں پر نظریں جمائے کسی بات کا انتظار کر رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد لیٹا ہوا شخص پھرتی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور واگیہ کی طرف بھاگتا ہوا چیخا۔ "واگیہ جی! دشمن، تقریباً سوسوا سو دشمن!"

واگیہ چیتے جیسی چستی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اٹھتے اٹھتے بندوق ہاتھ میں لے لی پوچھا۔ "کتنی دور ہیں یہ لوگ؟"

اس شخص نے جواب دیا۔ "تقریباً ایک میل دور!"

واگیہ کی تحکمانہ آواز گونجی۔ "کدھر جا رہے ہیں یہ لوگ؟"

"اسی طرف آ رہے ہیں واگیہ جی!"

واگیہ نے اپنے ساتھیوں کی مدد سے گھوڑوں کو شمال کے جنگل میں چھپا دیا اپنے ساتھیوں کو راہ گزر کے متوازی دور تک پتھریلی چٹانوں کے پیچھے بٹھا دیا اور یہ پایا کہ جب غنیم سامنے آ جائیں تو واگیہ جی کے حکم کے مطابق اس کو بندوقوں کی باڑ پر رکھ لیا جائے۔ ان کا حیوانی حسِ سماعت رکھنے والا آہٹ شناس واگیہ کے قریب زمین پر کان لگائے آنے والوں کے دم بدم قریب آنے کی خبر سنا رہا تھا۔ تقریباً گھنٹہ سوا گھنٹہ بعد آہٹ شناس کی اطلاع کے بموجب سوسوا سو مردوں اور عورتوں پر مشتمل قافلہ ان کے سامنے سے گزرنے لگا۔ ان کے ٹھوکریں کھا کھا کر قدم اٹھاتے مویشی یہ بتا رہے تھے کہ وہ کسی ابتلا و مصائب کے سمندر سے گزر کر آ رہے ہیں، گھوڑوں کے جسم خون میں نہائے ہوئے تھے، اور مردوں کے چہرے اور کپڑے خون کی لکیروں اور دھبوں سے گلنار ہو رہے تھے کئی گھوڑوں پر دو دو آدمی سوار تھے، ان میں ایک زخموں سے چور، اپنا سر ایک طرف کاندھے پر جھکائے نیم مدہوش اپنے ساتھی کے سہارے سفر کر رہا تھا۔ عورتیں خوفزدہ سوگوار، گردنیں جھکائے مردوں کے پیچھے پیچھے اپنے گھوڑے بڑھا رہی تھیں، واگیہ نے انہیں پہلی ہی نظر میں پہچان لیا کہ یہ غیر ملکی لوگ ہیں، ان کے سرخ و سفید چہرے، سنہرے بال اور نیلگوں آنکھیں ان کے غیر ملکی ہونے کی شہادت دے رہی تھیں، واگیہ کو ان گوروں سے نفرت تھی۔ اس نے ان افسردہ حال و مضمحل یا لوگوں کی مجموعی کیفیت سے یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ اب ان میں مقابلے کا دم نہیں رہا۔ واگیہ نے اپنی حلق سے ایک عجیب دہشت ناک آواز نکالی اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ اپنے ساتھیوں سمیت نیم دائرے میں، ان

سامنے نمودار ہوا اور ان کا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔ ان کی بندوقوں کی نالیں اہل قافلہ کی طرف تھیں، واگیہ نے تلگو میں حکم دیا۔ "اپنے ہتھیار زمین پر گرا دو!"

چند سفید فام اس کا مطلب سمجھ گئے اور اپنے ہتھیار زمین پر گرا دیے۔ انہوں نے اپنے ساتھیوں کو اپنی زبان میں واگیہ کا حکم سنا دیا اور اس کے فوراً بعد سبھی نے اپنے اپنے ہتھیار زمین پر ڈھیر کر دیے۔

واگیہ گردن اکڑائے اپنے پانچ ساتھیوں کو اپنے پاس لئے ان کے سروں پر پہنچ گیا۔ عورتیں ہراساں اور بدحواس نظروں سے انہیں دیکھ رہی تھیں، واگیہ نے تلگو میں سوال کیا۔ "تم لوگ انگریز ہو؟"

"نہیں!" ایک ادھیڑ عمر نے جواب دیا۔ "ہم فرانسیسی ہیں!"

"اچھا!" واگیہ کو یاد آ گیا کہ فرانسیسی ٹیپو کے حلیف ہیں، اس نے پوچھا۔ "تمہارا یہ حال کیونکر ہوا؟"

ادھیڑ عمر فرانسیسی نے جواب دیا۔ "ہم سرنگا پٹم سلطان ٹیپو کے پاس جا رہے تھے کہ راہ میں انگریزوں سے مڈبھیڑ ہو گئی وہ تعداد میں ہم سے زیادہ تھے، ہمارے بیشتر ساتھی مقابلے میں مارے گئے ہم جان بچا کر کسی نہ کسی طرح یہاں تک آ گئے!" اتنا کہہ کر اس نے واگیہ کو حکم طلب نظروں سے دیکھا جیسے پوچھ رہا ہو۔ "اب تم جو حکم دو گے اس پر عمل ہو گا!"

واگیہ نے اپنے ساتھیوں کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا، ایک منچلے نوجوان نے واگیہ کو اپنی رائے سے بلا پس و پیش مطلع کر دیا۔ فرانسیسی عورتوں پر نظریں گاڑے ہوئے کہا۔ "واگیہ جی! مردوں کو جانے دو، عورتوں کو روک لو، آخر ہمیں بھی تو ان کی ضرورت ہے!"

پھر کئی طرف سے آوازیں بلند ہوئیں۔ "ہم سب کی بھی یہی رائے ہے" ہم سب کی بھی یہی رائے ہے!"

واگیہ نے مردوں کو ایک طرف کر دیا اور عورتوں کو دوسری طرف، اور خود ان دونوں کے درمیان اپنے ساتھیوں سمیت حائل ہو گیا۔ پھر معمر فرانسیسی کے گھوڑے کے پیٹ پر ایک زوردار لات رسید کر دی اور چیخ کر حکم دیا۔ "بھاگ جاؤ۔ فوراً بھاگ جاؤ۔ ورنہ ہمارے ساتھی تمہیں قتل کر دیں گے!"

جان بچی لاکھوں پائے کے مصداق مردوں نے اپنے گھوڑوں کو فوراً آگے

بڑھا دیا۔ عورتوں نے ان کا ساتھ دینا چاہا لیکن واگیہ کے ساتھیوں نے انہیں
قدم بھی نہ ہلنے دیا۔

فرانسیسی اپنی عورتوں کو واگیہ کے رحم و کرم پر چھوڑ کر آگے بڑھ گئے اور
انہیں مڑ مڑ کر اس وقت تک دیکھتے رہے جب تک بلند و بالا پیچیدہ پہاڑیاں
ان کے درمیان حائل نہ ہو گئیں۔

زار و قطار روتی اور آنسو بہاتی ہوئی فرانسیسی خواتین رحم اور التجا
نظروں سے واگیہ کو دیکھنے لگیں، واگیہ کے ساتھی گاہ واگیہ کو اور گاہ فرانسیسی عور
کو دیکھنے لگتے۔

واگیہ اپنے ساتھیوں کو جنگل سے گھوڑے واپس لانے کا حکم دے کر فرانسیس
عورتوں کے حسن و جمال کا جائزہ لینے لگا۔

پہلے اس نے ان کی گنتی کی، یہ کل چھیاسٹھ تھیں، ان میں سات بوڑھی تھ
بقیہ انسٹھ سولہ اور تیس سال کے درمیانی عمر کی تھیں۔ تھوڑی دیر بعد جب گھوڑ
لے کر اس کے ساتھی واپس آ گئے تو وہ فرانسیسی عورتوں کو مویشیوں کی طرح ہنکا کر ا
سب سے بلند پہاڑی چوٹی کی طرف لے گیا جسے وہاں کے مقامی لوگ کدرے مکھ
(گھوڑے کا منہ) کہتے تھے۔ کدرے مکھ کے جنوب میں ایک چھوٹی سی وادی چھوٹے
سرسبز درختوں سے ڈھنپی ہوئی تھی، یہاں پہنچ کر اس نے فرانسیسی خواتین کو ا
قطار میں کھڑا کر دیا اور اپنے ساتھیوں سے کہا۔ "میں جانتا ہوں کہ ان غیر ملکی عورتو
اپنے قبضے میں دیکھ کر تم سب کے کیا احساسات ہوں گے، تم نے میری خاطر اپنا وطن
گھر چھوڑا اور کہساروں اور میدانوں میں خاک اڑاتے پھر رہے ہو سخت ناانصا
گی اگر میں تمہیں ان عورتوں سے دور رکھوں، بھگوان نے تمہاری قربانیوں کے پیش ن
انہیں ہمارے پاس بھیجا ہے لیکن یہ فیصلہ کرنا کہ کون عورت کس کے حوالے کی ج
دشوار ہے!"

واگیہ کی اس مختصر تقریر سے اس کے ساتھیوں کے چہروں پر تازگی آ گ
واگیہ نے اپنے ساتھیوں کو حکم دیا۔ "تم سب ان عورتوں کی پشت پر اپنی
کے متوازی قطار میں کھڑے ہو جاؤ۔"

حکم کی فوراً تعمیل کر دی گئی اور اس کے چوّن ساتھی۔ فرانسیسی خواتین
پشت پر ایک قطار میں کھڑے ہو گئے۔

واگیہ نے بوڑھی عورتوں کو قطار سے نکال دیا۔ چوّن عورتوں کی پشت پر چوّن
ہی، مقابل قطار میں کھڑے ہوتے تھے پانچ عورتوں کی پشتیں خالی تھیں، جب
نوں قطاریں، ایک دوسرے کی پشت پر کھڑی ہو گئیں تو واگیہ نے ان دونوں قطارو
حکم دیا۔ "ایک دوسرے کی طرف مڑ کر اپنے چہرے آمنے سامنے کر لو۔"

مرد تو ایک دم گھوم گئے لیکن واگیہ کے اس حکم کی تعمیل تمام عورتیں ایک
اتھ نہ کر سکیں جو تلگو زبان سے واقف تھیں وہ گھوم گئیں اور جو نہیں جانتی تھیں
ہ بدستور کھڑی رہیں۔

واگیہ نے تلگو جاننے والی عورتوں کو حکم دیا۔ "تم تلگو نہ جاننے والی عورتوں کو بتاؤ
میں نے انہیں کیا حکم دیا ہے!"

اس حکم کے ذرا دیر بعد تمام عورتیں واگیہ کے سپاہیوں کے روبرو کھڑی تھیں۔
واگیہ نے اپنے ساتھیوں کو حکم دیا۔ "جو عورت جس مرد کے مقابل ہے اپنے
قبضے میں کرے اور اسے اپنے تصرف میں لائے!"

کچھ دیر کے لئے واگیہ کا یہ حکم اس کے ساتھیوں کے لئے ناقابل فہم رہا۔ لیکن
اگیہ نے اپنے اس نرالے حکم کی وضاحت کر دی، اس نے کہا۔ "ساتھیو! تم میرے اس
کھے حکم پر تعجب نہ کرو، میں چاہتا تو ان عورتوں کو اپنی مرضی سے تم میں تقسیم کر دیتا
ن اس صورت میں تم میں پسند اور ناپسند کا سوال اٹھ کھڑا ہوتا لیکن اس طریقہ تقسیم
ے، جو میں نے اختیار کیا ہے تم سب کو مطمئن ضرور کر دیا ہو گا کہ جو عورت جس کے مقدر
ں تھی اسے مل گئی۔"

لوگوں نے جوش مسرت سے تالیاں بجائیں اور 'واگیہ جی کی جے' کا نعرہ بلند کیا۔

ادھر سے فارغ ہو کر واگیہ بقیہ پانچ عورتوں کی طرف بڑھا۔ یہ کسی کے بھی حصے
یں نہیں آئی تھیں، واگیہ نے ان کے روبرو پہنچ کر انہیں باری باری بغور دیکھا پھر
اپنے ساتھیوں سے سوال کیا۔ "ساتھیو! ان پانچ عورتوں کے لئے تم کیا کہتے ہو؟"

واگیہ کے ایک پرستار نے جواب دیا۔ "واگیہ جی! تم ہمارے سردار ہو اور سردار
کا حق کچھ زیادہ ہی ہوتا ہے، ان پانچوں کے تنہا مستحق ہو!"

تائید میں سبھی نے کچھ ایسا جوش و خروش دکھایا کہ تھوڑی دیر کان پڑی
آواز تک نہ سنائی دی۔ جب شور کم ہوا تو واگیہ نے اپنے حصے میں آئی ہوئی خواتین کو
جانچنے کی نظر سے دیکھا۔ یوں تو وہ پانچوں ہی حسین تھیں لیکن ان میں ایک غیر معمولی

خوبصورت تھی، واگیہ اس کے روبرو پہنچ کر کھڑا ہو گیا۔ لڑکی کی عمر بمشکل انیس بیس سال رہی ہوگی۔ اس کے شانوں پر سنہرے بال بکھرے ہوئے تھے اور دوپٹے سے بے نیاز جسم، ایک ایسی فراک میں پھنسا ہوا تھا جس کے گلے میں بطورِ خاص جنتوٹیں پیدا کی گئی تھیں

واگیہ کو گھورتے ہوئے دیکھ کر لڑکی نے شرم و حیا سے نظریں جھکا لیں۔

واگیہ نے ہنستے ہوئے لڑکی کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا اور اسے اپنی طرف کھینچتے ہوئے کہا۔ "ادھر آؤ، میرے قریب!"

لڑکی ڈری سہمی اس کے قریب چلی گئی اور خوفزدہ نظروں سے لمحے بھر کے واگیہ کو دیکھا اور نظریں جھکا لیں۔

واگیہ کا ہاتھ اب بھی اس کے کاندھے پر رکھا تھا۔ اس نے پوچھا۔ "لڑ تمہارا نام؟"

لڑکی نے بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ "روزی ڈینیل!"

واگیہ نے ترشی سے پوچھا۔ "تم رو کیوں رہی ہو؟"

اچانک نظریں یوں اٹھیں جیسے بجلی کوند گئی ہو، لڑکی نے دلیری سے جواب د "میں تمہیں پسند نہیں کرتی۔ پھر بھی تمہارے قبضے میں آگئی ہوں اگر تم خود میری جگہ ہو تو کیا خوش ہوتے؟"

واگیہ نے طیش میں آکر ایک طمانچہ رسید کر دیا۔ بولا۔ "تم سفید فام تاجر لوگ آخر ہندوستان میں کیا لینے آتے ہو؟ کیا تمہارے مردوں نے ہندوستان کی ناموس پر ہاتھ نہیں ڈالا؟"

"ڈالا ہوگا!" لڑکی نے بے نیازی سے جواب دیا۔ "لیکن میں فرانسیسی، میری قوم سفید فام ہونے کے باوجود انگریزوں کے خلاف تمہارا ساتھ دے رہی۔"

واگیہ نے جواب دیا۔ "بکواس بند کرو، سرنگا پٹم کا ٹیپو تم پر اعتبار کرتا ہے کرے لیکن میں نہ تم فرانسیسیوں پر اعتماد کر سکتا ہوں نہ انگریزوں پر تم دونوں ہی کے بھائی گرہ کٹ ہو!"

لڑکی نے منطق کا سہارا لیا۔ "لیکن ہم فرانسیسی یہ نہیں چاہتے کہ ہندوستان

نگریزوں کا غلام ہو جائے، سردار! اگر تم سے یہ سوال کیا جائے کہ تم انگریز کو زیادہ پسند کرتے ہو یا فرانسیسی کو تو تم کیا جواب دو گے! اس وقت تم یقیناً فرانسیسی کو ترجیح دو گے؟"

واگیہ زور زور سے ہنسنے لگا۔

"بھولی لڑکی! تم نے کیسا مہمل سوال کیا ہے یہ تو ایسا سوال ہے جیسے پوچھا جائے کہ واگیہ جی بندوق کی گولی سے مرنا پسند کرو گے یا رسی کے پھندے سے!"

واگیہ کی بات سے اس کے سارے ہی ساتھی کھلکھلا کر ہنس دیے۔

واگیہ نے روزی کے علاوہ چاروں عورتوں کو گھوڑوں پر سوار کرا کے اپنے نرغے میں لے لیا اور روزی کو اپنے گھوڑے پر آگے بٹھا لیا۔ اس کے ساتھیوں نے بھی اپنے سردار کی روش اختیار کی اور اپنے حصے میں آئی ہوئی عورتوں اور لڑکیوں کو اپنے آگے بٹھا کر ان کے خالی گھوڑوں کو درمیان میں لے لیا۔

واگیہ نے روزی کی سنہری زلفوں کو لہرا دیا اور الٹے ہاتھ سے لگام کھینچ کر ڈھیلی چھوڑ دی اور سیدھے ہاتھ کو ہوا میں لہرا کر اپنے ساتھیوں کو کوچ کا اشارہ کیا۔ ایک ساتھ بہت سارے گھوڑوں کی ٹاپوں سے کدرے مکھ کی وادی گونج اٹھی۔

یہ لوگ اپنے گھوڑے دوڑاتے ہوئے نیل گری کی حدود میں داخل ہو گئے اور اس کی سب سے بلند چوٹی "ڈوڈا بیٹا" (بڑی پہاڑی) کے دامن میں پہنچ کر دم لیا۔ یہاں انہوں نے کچھ دن رہنے کا منصوبہ بنایا۔ انہوں نے مقامی لوگوں کو لوٹ کی کمائی کا سبز باغ دکھا کے ہم نوا اور ہم خیال بنا کے اپنے ساتھیوں میں شامل کر لیا۔ واگیہ نے انہیں ہن اور پگوڈے (سونے کے سکے) دے کر رام کر لیا۔ مقامی خود تو سائیس اور خدمت گار بن گئے اور اپنے مہمان آقاؤں کو عیش کرنے کے لئے اپنی رہائش گاہیں دے دیں، یہاں داد عیش دینے کے دوران کئی عورتیں ہلاک کر دی گئیں کیونکہ وہ اپنے ضمیر اور مرضی کے خلاف ان رہزنوں کا ساتھ دینے پر آمادہ نہ تھیں، ان کی جگہ بقیہ چار عورتیں کام آئیں۔ مخلص اور ایماندار سردار واگیہ نے اپنے لئے روزی کو مخصوص رکھا۔

جب وہ روزی کی خلوت گاہ میں داخل ہوا تو یہ دیکھ کر پریشان ہو گیا کہ اس کے ہاتھ میں تقریباً چھ انچی چھرا چمچما رہا ہے وہ ٹھٹھک کر دروازے پر ہی رک گیا اور روزی کو حکم دیا۔ "لڑکی! اسے پھینک دو!"

روزی نے چھرے کی دھار پر انگلی پھیری اور اطمینان سے جواب دیا۔ "مجھ سے دور رہو اگر تمہیں نہ مار سکی تو خود کو ضرور ہلاک کر لوں گی!"

اس نے پوچھا۔ "تمہیں یہ چھرا ملا کہاں سے؟"

روزی نے جواب دیا۔ "اسی کوٹھری سے، یہیں اس طاق میں رکھا تھا!"

واگیہ چاہتا تو نہایت آسانی سے اس سرکش لڑکی کو، دور ہی سے چھرا پھینک کر ہلاک کر دیتا لیکن اسے یہ یقین ہو گیا تھا کہ لڑکی اپنی موت سے ذرا بھی خوفزدہ نہیں ہے وہ بخوشی مرنے پر تیار تھی جو خود مرنے پر آمادہ ہو اسے مارنا کوئی آسان کام نہیں ہے، اسے روزی کی یہ ادائیں، اس کی صورت شکل سے زیادہ اچھی لگیں، مسکرا کر پوچھا۔ "آخر تم مرنا کیوں چاہتی ہو؟"

"صرف اس لئے کہ میں تمہاری خواہشات نہیں پوری کر سکتی!"

واگیہ طنز سے ہنس دیا۔ بولا۔ "کیا تم یہ سمجھتی ہو کہ اگر میں چاہوں تو تم مجھ سے محفوظ رہ سکتی ہو؟"

"ہاں مجھے اس بات کا یقین ہے کہ تم تو کیا دنیا کی کوئی طاقت، کوئی شخص بھی مجھے میری مرضی کے خلاف نہیں استعمال کر سکتا!"

"اچھا!" واگیہ کو روزی کی یہ ناتجربہ کارانہ بھولی بھالی باتیں اس کے ناز و انداز سے زیادہ اچھی لگیں، روزی کے غصّے پر اسے پیار آ رہا تھا نہایت نرم لہجے میں بولا۔

"بھولی لڑکی! تم نے اپنا کیا نام بتایا تھا؟"

روزی نے جواب دیا۔ "روزی ڈینیل!"

"خوب روزی ڈینیل! اپنا یہ چھرا تو پھینک دو، تمہیں اگر اپنے ناز و انداز کے سحر اور بھولی بھالی باتوں کے زہر کا علم ہو جائے تو پھر کبھی بھی اس حقیر چھرے کا سہارا لینا پسند نہ کرو۔ میں تمہیں یہ یقین دلاتا ہوں کہ کوئی کام بھی تمہاری مرضی کے خلاف نہ ہو گا۔ اب اس عہد کے بعد تو اپنا چھرا پھینک دو!"

لیکن روزی نے چھرا پھینکنے سے انکار کر دیا۔

واگیہ چند قدم پیچھے ہٹا۔ روزی یہ سمجھی کہ واگیہ جست لگا کر اس پر حملہ آور ہونے والا ہے لیکن واگیہ نے ہاتھ میں چھپی ہوئی رسی کو کمند کی طرح اس کے چھرے والے ہاتھ کی طرف پھینکا اور جھٹکا دے کر چھرے کو اپنی طرف کھینچ لیا۔ چھرا ہوا میں لہراتا ہوا واگیہ کے سامنے آ گرا۔ واگیہ نے جھک کر اٹھا لیا۔ اور بے ساختہ قہقہہ لگاتا ہوا بولا۔ "اسی چھرے

پر ناز تھا تمہیں، ہم لوگ مردوں کے شکاری بھلا عورتوں کو کیا نظر میں لائیں گے!"

اس کے بعد وہ روزی کی طرف بڑھا روزی پناہ کی تلاش میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔

واگیہ نے کہا۔ "روزی! تم پریشان مت ہو، میں اب بھی یہی کہوں گا کہ تم میرے عہد پر یقین کرو، میں سردار ہوں اور کسی سردار کے لئے عہد شکنی نہایت بری بات ہے!"

روزی نے رک کر پوچھا۔ "پھر تم مجھ سے چاہتے کیا ہو؟"

تمہاری قربت، تم سے باتیں کرنا، تمہارا حال سننا، کوئی ایک خواہش تھوڑی ہے۔

روزی اس عجیب و غریب شخص سے قدرے لطف اندوز ہوئی، بولی۔ "میں تمہاری باتوں پر یقین تو کر لوں لیکن مجھے تم سے خوف آتا ہے۔"

واگیہ اس کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا۔ بولا۔ "اب اگر میں چاہوں تو تم اپنے تحفظ میں کس حد تک مدافعت کر سکتی ہو!"

روزی نے کوئی جواب نہ دیا تو واگیہ نے کہا۔ "اس دنیا کا نظام اعتماد اور اعتبار پر ہی چل رہا ہے!"

وہ روزی کے قریب بیٹھ کر باتیں کرنے لگا۔ روزی بھی سمٹ کر کنارے پر ہو گئی۔

واگیہ اس سے دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں کرتا رہا اور اس نے اپنی کسی بات سے بھی یہ ظاہر نہ ہونے دیا کہ وہ روزی سے غیر معمولی محبّت کرنے لگا ہے!

اسی ملاقات میں روزی نے اپنی بابت یہ بتایا کہ وہ اپنے چچا کے لڑکے کرنل پامر سے محبّت کرتی ہے اور اسی سے بچپن سے منسوب ہے!"

واگیہ نے پوچھا۔ "وہ کہاں ہے؟"

روزی نے جواب دیا۔ "سرنگا پٹم میں ہو گا کیونکہ سلطان نے اسے بلایا تھا!"

واگیہ نے پوچھا۔ "کیا تمہارا کرنل پامر ان لوگوں میں موجود تھا جنہیں میں نے حکم دے کر چلتا کر دیا تھا؟"

"ہاں ان میں وہ بھی موجود تھا وہ زخمی تھا اگر وہ زخمی نہ ہوتا تو میری مدد کو ضرور بڑھتا!"

واگیہ ہنسا، کہنے لگا۔ "اچھا ہی ہوا کہ وہ ہمارے مقابلے پر نہیں آیا اگر غلطی اور نادانی سے آ جاتا تو یقیناً قتل کر دیا جاتا!" پھر پوچھا۔ "کیا پامر بھی تم سے محبت

کرتا ہے؟"

روزی نے گردن جھکا کر آہستہ سے جواب دیا۔ "ہاں وہ بھی مجھے بہت چاہتا ہے!"

واگیہ ایک دم گرم ہو گیا۔ چیخ کر بولا۔ "تم جھوٹ بول رہی ہو۔ تم سادہ لوح اور بھولی بھالی لڑکی ہو اگر پامر کو تم سے محبت ہوتی تو تمہیں میرے حوالے کر کے ہرگز نہ جاتا!"

روزی نے پامر کی وکالت کی، بولی۔ "اس نے ایسا مجبوری کی حالت میں کیا تھا!"

"عاشق اور مجبوری دو متضاد چیزیں ہیں جو عاشق ہو، وہ مجبور نہیں ہوتا!"

واگیہ کی وزنی باتوں نے روزی کو چونکا دیا۔ وہ تو اسے اب تک سیدھا سادا رہزن سمجھ رہی تھی سفاک انسان، جو دلائل اور منطق کی جگہ بھی اپنے ہتھیاروں سے کام لیتا ہے!

روزی چپ ہو رہی لیکن واگیہ نے چلتے چلتے دل سے متنبہ کیا۔ بولا۔ "اگر تم اب بھی پامر سے محبت کرتی ہو تو شوق سے کرتی رہو۔ لیکن میری ایک بات ضرور یاد رکھو، بزدل پامر تمہاری جیسی دلیر اور مردانہ حوصلے کی لڑکی کی محبت کا اہل نہیں ہے!"

روزی کے پاس اس بات کا کوئی جواب نہیں تھا۔

نیل گری کی وادی میں رہتے ہوئے تقریباً بارہ دن گزر چکے تھے واگیہ کی ناکامی اور روزی کی کامیابی کا علم سبھی کو ہو چکا تھا انہیں حیرت تھی کہ ان کے سخت دل سردار واگیہ جی کو آخر ہو کیا گیا ہے، واگیہ کے تمام ساتھی خوب خوب داد عیش دے چکے تھے اور اب انہیں کمائی کی فکر دامنگیر تھی، ان کے نئے ساتھی بھی واگیہ جی کے فرمان کوچ کے منتظر تھے۔

واگیہ نے وادی کو چھوڑنے سے پہلے اپنے آہٹ شناس کو چند آدمیوں کے ساتھ نیل گری کی شمالی حدود کے اس پار بھیج دیا کہ پہلے وہ اس بات کا اطمینان کر آئے کہ مطلع صاف بھی ہے یا نہیں، کیونکہ اس کا خیال تھا کہ فرانسیسی کسی نہ کسی بڑی طاقت کا سہارا لے کر اس کو تلاش ضرور کر رہے ہوں گے!

دوسرے دن ہی اس کا آہٹ شناس واپس آ گیا۔ اور اس نے یہ تشویشناک خبر سنائی کہ اس نے میسور کی حدود سے نکل کر، نیل گری کی حدود میں داخل ہوتے ایک سلطانی دستے کو دیکھا ہے، ان کے ساتھ چند سفید فام بھی ہیں جو یقیناً فرانسیسی ہوں گے، اس دستے میں تقریباً ڈھائی تین سو آدمی ہوں گے!

واگیہ نے پوچھا۔ "تو انہیں کہاں چھوڑ آیا؟"

آہٹ شناس نے جواب دیا۔ "وہ کہیں قریب ہی بھٹک رہے ہوں گے!"

واگیہ نے اس ہنگامی مسئلے پر اپنے ساتھیوں سے رائے طلب کی تقریباً ہر ایک نے ہی مشورہ دیا کہ چھپ کر ان پر شب خون مارا جائے لیکن واگیہ نے اس سے اختلاف کیا۔ بولا "میں ٹیپو کی بہادری، تدبر، فراست اور حب الوطنی کا دل سے قائل ہوں، ہم دونوں کے مقاصد بھی ایک ہیں پھر ہم آپس میں لڑ کر اپنی طاقت خواہ مخواہ کیوں ضائع کریں!"

ساتھیوں نے واگیہ کا ٹیپو کی طرف جھکاؤ محسوس کر کے، خود کو اس کی مرضی کا تابع کر دیا اور اسی مجلس مشورت میں واگیہ نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ کسی بھی طرح سلطان سے رابطہ پیدا کرنے کی کوشش کرے گا!

سلطانی دستے کی آمد کی خبر فرانسیسی خواتین نے بھی سنی اور انہیں یہ سوچ کر خوشی ہوئی کہ جلد یا بدیر ان کے جبری آقا کیفر کردار کو پہنچ جائیں گے لیکن روزی کی سوچ ان سے مختلف تھی، اسے واگیہ میں ایک بڑے آدمی کی خصوصیات دکھائی دے رہی تھیں، ایک ہوشیار، صاحب فراست باکردار انسان کی خصوصیات، اسے خوب اندازہ تھا کہ واگیہ سلطانی دستے کے قابو میں باآسانی نہیں آئے گا!

اسی دن شام ہی کو واگیہ اپنے درجن بھر دلیروں کو لے کر ادھر روانہ ہو گیا جدھر سے سلطانی دستہ ان کی طرف بڑھا چلا آ رہا تھا، آہٹ شناس اس کے ساتھ تھا جو بار بار زمین پر لیٹ کر اپنے کان زمین سے لگا کر غنیم کی آہٹ اور فاصلے کا اندازہ لگاتا رہتا۔ وہ غنیم کی سمت تک کا تعین کرتا جا رہا تھا۔

دیودار کے جنگل میں پہنچ کر وہ رک گیا اور اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر سرگوشی کرتا ہوا بولا۔ "واگیہ جی! غنیم ہم سے اب زیادہ دور نہیں ہے!"

واگیہ نے پوچھا۔ "کیا وہ ہماری طرف آ رہے ہیں؟"

"بالکل بالکل۔"

واگیہ نے اپنے ساتھیوں کو ادھر ادھر چھپاتے ہوئے حکم دیا۔ "جب میں گولی چلاؤں اسی وقت تم سب بھی گولیاں چلا دینا!"

لوگوں نے واگیہ کی بات گرہ میں باندھ لی۔

شاید نصف گھنٹے بعد یہ دستہ نمودار ہوا۔ ان کے ساتھ پانچ چھ فرانسیسی بھی تھے واگیہ نے پوچھا۔ "ہم میں کوئی ایسا بہادر بھی ہے جو کسی نہ کسی طرح غنیم کے لشکر میں چلا جائے اور اسے میرا ایک رقعہ پہنچا دے!"

ایک پچیس چھبیس سالہ منچلا نوجوان آگے بڑھا۔ بولا۔ "اس کام کو میں انجام

دوں گا!"

واگیہ بولا۔ "دھنیہ ہے تیری سورمائی پر، خوب!"

اندھیرا پھیل چکا تھا۔ سلطانی دستہ ہاتھوں میں مشعلیں لیے بڑھا چلا آرہا تھا۔ یکایک کسی طرف سے بندوق چلنے کی آواز سنائی دی۔ بس پھر کیا تھا۔ واگیہ کے ساتھیوں نے تابڑ توڑ حملے شروع کر دیے، پوری وادی میں بندوقوں کی آواز اور چیخ پکار سے میدان حشر جیسا سماں بندھ گیا تھا۔

سلطانی دستے کو یہ شبہ گزرا کہ ان کے حریف بھی تعداد میں شاید بہت زیادہ ہیں، وہ موقع کی تلاش میں ادھر ادھر چھپنے لگے۔ واگیہ نے بھی ان کا تعاقب نہیں کیا کیونکہ وہ ان سے چند معاملے کی باتیں کرنا چاہتا تھا۔ ان کی پوری رات نگرانی اور چوکسی میں گزر گئی۔ سلطانی دستے نے اپنی مشعلیں بھی بجھا دی تھیں۔

صبح جب فجر کے بعد اپنے آہٹ شناس کی اطلاع پر واگیہ ذرا آگے بڑھا تو راستے میں اسے کئی لاشیں پڑی دکھائی دیں، واگیہ چھپتا چھپاتا درختوں اور چٹانوں کی آڑ لیتا چیتے کی چالاکی اور عقاب جیسی تیز نگاہوں کے سہارے ایک چشمے تک پہنچ گیا وہاں اس نے منہ ہاتھ دھوئے اور چند گھونٹ پانی پیا ہی تھا، یکایک پہاڑی کے نشیب سے کسی نے بندوق چلائی یہ لوگ لیٹ گئے۔ گولی ایک سیاہ چٹان سے ٹکرا کر سنگریزے اڑاتی غائب ہو گئی واگیہ نے لیٹ کر ادھر دیکھا، جدھر سے گولی کی آواز آئی تھی۔ تقریباً پچھتر اسی گز نیچے دو بھاری پتھروں کے درمیان بندوق کی متحرک نال پر اس کی نظر پڑ گئی۔ واگیہ دیر تک خاموش پڑا نال پر نظریں جمائے رہا۔ بیس پچیس منٹ بعد پتھروں کے درمیان سے ایک مرد نمودار ہوا اور بھاگ کر ایک درخت کی آڑ میں ہو گیا۔ واگیہ کی بندوق کی نال اس شخص کی حرکات کے ساتھ ساتھ حرکت کرنے لگی اور پھر ایک زوردار کڑک کے ساتھ بندوق کی نال سے شعلہ نکلا اور واگیہ کا شکار ڈھیر ہو گیا واگیہ اپنے ساتھیوں کو لے کر نہایت ہوشیاری سے نیچے اترا اور گردوپیش کا جائزہ لیتا اپنے شکار تک پہنچ گیا۔ یہ کوئی غیر ملکی نوجوان تھا جو اوندھے منہ پڑا ہوا تھا۔ گولی اس کے داہنے شانے کو چھید گئی تھی اور پتھر پر گرنے کی وجہ سے اس کا سر بھی پھٹ گیا تھا۔ اس کی بندوق آدھی اس کے جسم کے نیچے تھی اور آدھی باہر، واگیہ نے اس کے نتھنوں پر ہتھیلی رکھ دی۔ ابھی سانس آجا رہی تھی واگیہ کے جی میں آئی کہ اس سفید فام کے سینے میں خنجر اتار دے۔ لیکن ذرا دیر بعد اسے ہوش آ گیا۔ اس نے سکڑی ہوئی بھنوؤں سے آنکھیں کھول دیں، اور واگیہ کو خشم آلود نظروں سے گھورا۔ اس نے واگیہ کو پہچان لیا تھا۔ لڑکھڑاتی آواز میں پوچھا۔ "تم وہی

ہو نا جس نے ہم سے ہماری عورتیں چھین کر ہمیں بھگا دیا تھا؟"

"ہاں؟" واگیہ نے جواب دیا۔ اسے اس نوجوان پر کسی بات کا شک ہو گیا تھا، اس نے پوچھا۔ "کیا تمہارا نام پامر ہے؟"

زخمی نوجوان واگیہ کی زبان سے اپنا نام سن کر ذرا حیران ہو گیا۔ پوچھا۔ "تم مجھے کس طرح جانتے ہو؟"

واگیہ نے جواب دیا۔ "روزی کے ذریعے، اس نے تمہارا ذکر کیا تھا!"

پامر نے کرب سے کروٹ بدلنی چاہی لیکن طاقت جواب دے گئی لڑکھڑاتی آواز میں سوال کیا۔ "وہ کہاں ہے؟"

واگیہ نے جواب دیا۔ "میرے پاس!"

پامر نے "اف" کر کے آنکھیں بند کر لیں اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کی آنکھوں کے گوشوں سے آنسو بہہ نکلے۔

واگیہ اسے سسکتا چھوڑ کر واپس چلا جانا چاہتا تھا کہ پامر نے پھر آنکھیں کھول دیں اور اپنی کمر میں ہاتھ ڈال کر کچھ تلاش کرنے لگا واگیہ نے کہا۔ "پامر! مجھے تم سے کوئی ہمدردی نہیں، کیونکہ جب تم سفید فام تاجروں کا ہم پر زور چلتا ہے تو تم بھی پتھر ہو جاتے ہو میں تمہیں سسکتا چھوڑ کر واپس جانا چاہتا ہوں" پھر پامر کی بے بسی اور اذیت سے لطف اندوز ہو کر مسکرانے لگا۔ پوچھا۔ "روزی کے نام کوئی پیغام؟"

"کوئی پیغام نہیں!" یہ کہتے ہوئے اس نے کمر کے نیچے سے اپنا ہاتھ نکالا اس میں خنجر تھا۔ ہاتھ اوپر اٹھا اور پامر نے یہ کہتے ہوئے اسے اپنے پیٹ میں گھونپ لیا۔ "روزی سے کہہ دینا پامر مر گیا۔ تیرا عاشق اس جہان سے کوچ کر گیا!"

پیٹ سے خون کا فوارہ چھوٹ نکلا اور ذرا دیر بعد پامر کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی۔

واگیہ یہ یقین کیے بغیر کہ پامر مرا یا زندہ ہے، وہاں سے ہٹ گیا۔

ابھی یہ لوگ آئندہ کے اقدام کا کوئی فیصلہ بھی نہ کر سکے تھے کہ سامنے کی چھوٹی سی خم دار سڑک پر ایک گھڑ سوار سفید پھریرا اڑاتا ہوا گزرا۔ یہ صلح کی علامت تھی، واگیہ نہایت ہوشیاری اور احتیاط سے اس شخص کے سامنے آگیا اور اسے پہچان لیا کہ یہ اس کا اپنا ہی آدمی ہے وہ شخص جو سلطانی دستے میں واگیہ کا پیغام لے کر گیا تھا۔ واگیہ نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روک لیا اور بے چینی سے پوچھا۔ "کیا خبر لائے؟"

اس نے جواب دیا۔ "خوش خبری، بہت بڑی خوش خبری!"

واگیہ کے تمام ساتھی اِدھر اُدھر سے نکل کر وہاں جمع ہونے لگے۔

واگیہ نے اپنے قاصد سے سوال کیا۔ "کیسی خوش خبری، صاف صاف بتاؤ!"

قاصد نے جواب دیا۔ "میں سلطانی دستے کے امیر کے پاس سے چلا آرہا ہوں' اس کے پاس واگیہ جی کے لئے کوئی خاص پیغام ہے جسے وہاں چل کر آپ خود وصول کر سکتے ہیں!"

واگیہ نے پوچھا۔ "کس قسم کا پیغام؟"

قاصد نے جواب دیا۔ "سلطان چاہتا ہے کہ واگیہ جی اپنے ساتھیوں کو لے کر سرنگا پٹم پہنچ جائیں وہاں انہیں سامان جنگ سپاہی اور قلعے مل جائیں گے واگیہ جی وہاں اپنی صلاحیتوں کو اچھی طرح آزما سکیں گے!"

واگیہ اپنے آدمیوں کے ساتھ قاصد کی رہنمائی میں، سلطانی دستے میں پہنچ گیا دستے کے امیر نے اس کا گرم جوشی سے استقبال کیا اور مصافحہ کر کے بغل گیر ہو گیا۔

واگیہ نے بے تکلفی سے پوچھا۔ "تم میرے لئے سلطان کا کیا پیغام لاتے ہو؟"

سلطانی امیر نے، سلطان کا رقعہ واگیہ کی طرف بڑھا دیا۔ واگیہ نے احتراماً عقیدت سے اس کاغذ کو چوما اور آنکھوں سے لگالیا۔ پھر کھول کر پڑھنے لگا۔ سلطان نے واگیہ سے خواہش کی تھی کہ وہ اپنے ساتھیوں کو لے کر سرنگا پٹم آجائے وہاں اسے ہر قسم کی سہولت دی جائے گی اور سلطان اس سے شایانِ شان سلوک کرے گا؟"

واگیہ نے سلطانی امیر سے کہا۔ "دوست! تم یہیں ٹھہرو میں ڈڈا بیٹا کے دامن سے اپنے ساتھیوں کو بلا لاؤں!"

سلطانی دستہ وہیں ٹھہر گیا۔ واگیہ چلتے چلتے پامر کی لاش پر گیا اور سرہانے کھڑے ہو کر کہا۔ "بدنصیب پردیسی! تو نے مر کر میرے لئے بڑی الجھن پیدا کر دی ہے اور بدقسمتی سے موت سے پہلے میری ہی آخری گولی تیرے شانے کو چھید کر اپنا کام کر گئی اگر تو خودکشی نہ کرتا تب بھی مر جاتا!"

اس کے بعد اس نے پامر کے چہرے [illegible] کا خوب اچھی طرح جائزہ لیا۔ اس کی داہنی پنڈلی بھی زخمی تھی اور یہ زخم پرانا تھا۔ [illegible] کے نیچے کسی گہری چوٹ کا چکنا نشان تھا اور ہاتھ کی چھوٹی چھوٹی انگلیاں خاصی گرہ دار تھیں، جس سے پامر کے حقائق پسند اور عملی ہونے کا ثبوت بہم پہنچتا تھا۔ الٹے ہاتھ کی چھنگلیا کی برابر والی انگلی میں سونے کی انگوٹھی تھی جس پر "آر" کھدا ہوا تھا۔ جس سے واگیہ نے روزی کے پہلے حرف کا اندازہ لگایا۔ واگیہ نے انگوٹھی اتار کر دھوتی کے پھینٹے میں رکھ لی اور واپسی کے لئے مڑا۔ بولا۔ "اچھا دوست! رخصت!

تم معلوم نہیں کب تک یہاں پڑے رہو گے اور روزی بھگوان جانے کب تک تمہارا انتظار کرے گی۔ شاید زندگی بھر کیونکہ یہ بات میں اسے کس طرح بتا سکتا ہوں کہ میں نے تمہیں ادھ موا کر دیا تھا۔ اس کے بعد تم نے خودکشی کر لی۔"

واگیہ کے پیچھے آنے والے ساتھی اسے تلاش کرتے ہوئے پامر کی لاش تک پہنچ گئے۔

کسی ایک نے پوچھا۔ "واگیہ جی! اس کے پاس سے کوئی کام کی چیز نکلی؟"

واگیہ نے اپنی دھوتی کے پھینٹے میں سے چند پگوڈے نکال کر اپنے ساتھیوں میں تقسیم کر دیئے

واگیہ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ نیل گری کی وادی میں چلا گیا اور سب کو تیاری اور روانگی کا حکم سنایا۔ ذرا سی دیر میں سلطانی پیش کش اور طلبی کا سبھی کو علم ہو گیا۔ دو سو مقامی لوگ بھی اس کے ساتھ جانے کی تیاری کرنے لگے۔

فرانسیسی خواتین خوش تھیں کہ فرانسیسیوں کا حلیف سلطان شاید دھوکا دے کر واگیہ اور اس کے ساتھیوں کو سرنگا پٹم طلب کر رہا ہے اور یہ سارے کے سارے دریائے کاویری کے ٹاپو میں داخل ہوتے ہی گرفتار کر لئے جائیں گے اور فرانسیسی خواتین ان سے جبراً چھین کر فرانسیسیوں کے حوالے کر دی جائیں گی۔

روزی نے اپنے شانے پر بکھرے ہوئے سنہری بالوں کو گھوڑے کی دم کی طرح باندھ لیا اس وقت اسے ایک گونا طمانیت حاصل ہو گئی تھی اسے یہ یقین تھا اگر وہ واقعی سرنگا پٹم پہنچ گئی تو یہ محکومی کی حالت نہیں باقی رہے گی کیونکہ ٹیپو فرانسیسیوں کا ہمدرد اور حلیف تھا۔ وہاں اس کے ہم وطن پہلے سے موجود ہوں گے اور انہی میں پامر بھی ہو گا۔ واگیہ کے لئے اس کے دل میں جذبہ احترام ضرور پیدا ہو گیا تھا۔ کیونکہ اس نے قزاق اور جنگلی چھاپہ مار ہونے کے باوجود روزی کو ستایا نہیں تھا۔ اس نے دل میں یہ طے کر لیا تھا کہ اگر ٹیپو نے اسے واقعی دھوکے سے بلا کر گرفتار کر لیا تو وہ اپنے ہم وطنوں کے اثرات استعمال کر کے کم از کم واگیہ کو رہائی ضرور دلائے گی۔

واگیہ نے روزی سے بطورِ خاص کہا۔ "روزی! ہم لوگ سرنگا پٹم چل رہے ہیں!"

"مجھے معلوم ہے!" روزی نے بے نیازی سے جواب دیا۔

واگیہ کچھ کہنے کے لئے الفاظ اور اسلوب تلاش کرنے لگا۔ کچھ تامل سے پوچھا۔ "کیا تم پامر کو بھلا نہیں سکتیں؟"

"نہیں!" روزی نے جواب دیا۔ "اس کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا!"

"اگر وہ فرانس واپس چلا جائے تمہیں چھوڑ کر، تب تم کیا کرو گی؟"

روزی نے جواب دیا۔ "میں بھی فرانس چلی جاؤں گی!"

"اگر وہ یہیں ہندوستان میں رہ کر تمہیں بھلا دے تو؟"

"ایسا کبھی نہیں ہو سکتا!"

"اگر وہ مر جائے تو؟"

"تو میں بھی مر جاؤں گی!" پھر آزردگی سے واگیہ کو دیکھ کر کہنے لگی۔ "لیکن تمہیں ایسی بات نہیں کہنی چاہیے تھی۔"

واگیہ پھر کسی فکر میں ڈوب گیا۔ پھر پوچھا۔ "پامر کی عمر کیا ہوگی؟"

روزی نے جواب دیا۔ "یہی چوبیس پچیس سال!"

"کیا اس کی بائیں کنپٹی کے نیچے کسی گہری چوٹ کا چکنا نشان بھی پایا جاتا ہے؟"

"ہاں!" روزی چونک کر بولی۔ "کیا تم نے اسے کہیں دیکھا ہے؟"

"نہیں!" واگیہ نے کہا۔ "کیا اس کی انگلیاں چھوٹی چھوٹی اور گرہ دار ہیں؟"

روزی چوکنے انداز میں، وحشت زدگی سے واگیہ کو گھورنے لگی، بولی "بات کیا ہے واگیہ جی، تم مجھے سب کچھ صاف صاف کیوں نہیں بتا دیتے؟"

واگیہ نے افسوس سے جواب دیا۔ "مجھے کسی نے بتایا ہے کہ اس حلیے کا اور نام کا ایک غیر ملکی سرنگاپٹم جاتے ہوئے کسی پہاڑی سے پھسل کر ہلاک ہو گیا اس کی انگلی میں جو انگوٹھی تھی، اس پر حرف آر کھدا ہوا تھا؟"

روزی چیخ مار کر رونے لگی۔ "تم مجھ سے جھوٹ بول رہے ہو اس لئے کہ میں پامر کو بھلا کر تم سے محبت کرنے لگوں، لیکن واگیہ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ کبھی بھی نہیں، میں تمہارے اس جھوٹ پر کسی قیمت پر بھی یقین کرنے کو تیار نہیں ہوں!"

واگیہ نے دھوتی کے پھینٹے سے پامر کی انگوٹھی نکال کر روزی کے آگے پھینک دی۔ بولا "میں جھوٹ نہیں بول رہا روزی۔ اس انگوٹھی کو پہچانو کہ یہ کس کی ہے؟"

روزی نے پھرتی سے انگوٹھی اٹھا لی اور اسے الٹ پلٹ کر دیکھنے لگی اور یہ سمجھنے میں ذرا بھی دیر نہ لگی کہ یہ وہی انگوٹھی ہے جو پامر اپنے بائیں ہاتھ کی تیسری انگلی میں پہنے رہتا تھا۔

روزی نے مذبذب لہجے میں پوچھا۔ "یہ تمہیں کہاں ملی؟"

واگیہ نے جواب دیا۔ "میں اس شخص کو پہچانتا نہیں لیکن وہ ہمارے پاس یہ پیغا کر ضرور آیا تھا کہ پامر نامی فرانسیسی کسی پہاڑی سے پھسل کر ہلاک ہو گیا، پھر اس نے پامر کا وہ حلیہ بیان کیا۔ جو میں نے تمہارے سامنے بیان کیا۔ وہ دراصل تم سے ملنا چاہتا تھا تمہاری تلاش

ا یہاں تک آ گیا تھا لیکن جب اسے یہ معلوم ہوا کہ تم سے ملاقات نہیں ہو سکتی تو تمہارے نام ایک ام اور انگوٹھی دے کر واپس چلا گیا!"

روزی نے شک و شبہے سے دریافت کیا۔ "وہ پیغام کیا تھا؟"

واگیہ نے جواب دیا۔ "پامر نے مرتے وقت تمہارے نام یہ پیغام چھوڑا ہے کہ اس کے بعد م آزاد ہو جس سے چاہو شادی کر لو۔"

روزی نے غصے میں کہا۔ "تم اپنے مقصد کے لئے جھوٹ بول رہے ہو، میں تمہاری ات کا یقین نہیں کر سکتی!"

واگیہ نے کہا۔ "تمہاری مرضی یقین کرو یا نہ کرو، مجھے جو پیغام ملا تھا تمہیں پہنچا دیا!"

روزی نے کہا۔ "تم مجھے کسی بھی طرح سرنگاپٹم تک پہنچا دو، اس خبر کی میں خود تصدیق روں گی اس کے بعد کوئی فیصلہ کروں گی!"

اسے اپنی طرف مائل کرنے کا اس تدبیر کے سوا کوئی چارہ بھی نہ تھا۔

دھونڈو جی واگیہ کا شہرہ اس سے پہلے ہی سرنگاپٹم میں پہنچ چکا تھا۔ یہ لوگ جب جنوب کے میسوری دروازے سے سرنگاپٹم میں داخل ہوئے تو انہیں دیکھنے کے لئے بہت سے لوگ جمع ہو چکے تھے۔ ٹیپو نے انہیں یہ عزت بخشی کہ چند امرا ان کے استقبال کو آئے۔ اس وقت سلطان اپنے ایوان عام دریا دولت باغ کی بالائی منزل میں موجود تھا۔ سلطان کے امرا واگیہ کے آدمیوں کو نیچے چھوڑ کر، اسے سلطان کے روبرو لے گئے، واگیہ نے سلطان کو پہلی بار دیکھا تھا۔ اس نے دیکھا۔ ایک آبنوسی تخت پر سرخ ریشمی گاؤ تکیے کے سہارے گندمی رنگ اور تقریباً پانچ فٹ آٹھ انچ قامت کا پر رعب انسان بیٹھا ہے، اس کی ناک خم دار تھی اور آنکھیں بڑی بڑی پر آب تھیں، چہرے کے خط و خال نازک تھے اور ہاتھ پاؤں بھی چھوٹے چھوٹے تھے، داڑھی منڈی ہوئی تھی اور گردن پر بٹیں پڑی ہوئی تھیں، واگیہ فرطِ عقیدت سے سلطان کے روبرو جھک گیا۔ سلطان نے واگیہ کو دیکھتے ہی معمولی سی حرکت کی اور چہرے سے خوشی کا اظہار کیا۔

واگیہ کو سلطان کے روبرو بیٹھنے کی عزت بخشی گئی۔

اسی وقت وزیراعظم سلطنتِ خداداد میر صادق اور دیوان پورنیا سلطان کے روبرو پیش ہوئے، پورنیا بھاری جسم کا بنیا تھا۔ اس کے لٹے کاندھے پر چادر سے کچھ چھوٹا کپڑا پڑا ہوا تھا اور سر پر مارواڑیوں جیسی ٹوپی رکھی تھی، میر صادق کی مونچھیں، باچھوں کے آس پاس نیچے ٹھوڑی کی طرف جھک گئی تھیں، اور اس کی آنکھوں سے بے حیائی اور خود غرضی مترشح تھی۔ داڑھی ندارد تھی۔

سلطان کی ایما پر اس کے معتمد نے واگیہ کا میر صادق اور پورنیا سے تعارف کرایا۔ صادق بظاہر خوش ہوا۔ اس نے سلطان سے کہا۔ "حضور والا! یہ وہی بدنام زمانہ ڈھوند واگیہ ہے نا جس کی رہزنی کا دور دور شہرہ ہے!"

واگیہ کو میر صادق کا یہ اندازِ گفتگو ناگوار گزرا۔ سلطان نے بھی اسے محسوس کر لیا۔ "ہمیں اس کی انگریز دشمنی اور حب الوطنی پسند ہے دوسرے یہ ایک غیر معمولی صلاحیت کا ا ہے اور ہماری خواہش پر سرنگاپٹم آیا ہے!"

میر صادق نے دوسرا وار کیا، بولا۔ "اس نے ایک آدھ بار سلطنتِ خداداد کی پر بھی تو حملہ کر کے لوٹ مار کی ہے؟"

"درست، لیکن اب واگیہ ہمارا دوست اور مہمان ہے!"

پورنیا ابھی تک خاموش تھا۔ اب اس نے بھی زبان کھولی لیکن میر صادق کی حما اور واگیہ کی مخالفت میں، بولا۔

"اعلیٰ حضرت! تقریباً دو ہفتے پہلے اس شخص نے سلطان کے حلیف فرانسی ایک قافلے پر حملہ کر کے ان کی عورتوں کو چھین لیا تھا۔ وہ لوگ ابھی تک اعلیٰ حضرت کے مہ اور ان کی عورتیں آج اور اس وقت بھی دریا دولت باغ کے باہر واگیہ کے ساتھیوں کے موجود ہیں!"

سلطان نے شاکی نظروں سے واگیہ کو دیکھا اور پوچھا۔ "کیا یہ درست ہے؟"

"ہاں حضور والا!" واگیہ نے جواب دیا۔ "اگر حضور والا کو فرانسیسیوں پر اعتماد ہے یہ ناچیز بھی ان پر اعتماد اور ان کی عزت کرے گا۔ ان کی جو عورتیں ہمارے پاس ہیں ہم ا کر دیں گے!"

پورنیا نے دلیری اختیار کی، بولا۔ "لیکن تم اعلیٰ حضرت کو پہلے یہ باور کرا دو کہ ان حلیف فرانسیسیوں کے ساتھ تم اور تمہارے ساتھیوں نے جو انتہائی ناشائستہ حرکت کی ہے کے لئے تم لوگ سلطان کی سزا کے مستحق نہیں ہو!"

واگیہ کا غصے سے چہرہ تمتما گیا۔ بولا۔ "اس ایوان عام میں سلطان کے رو برو ادب مانع ہے اگر مجھ سے یہی سوال باہر کیئے جائیں تو میں ان کے منہ توڑ جواب د سکوں گا!"

میر صادق نے سلطان کو مخاطب کیا۔ "حضورِ والا! اس کی سرکشی اور باغیانہ سرشت فرمائیں، اسے آدابِ سلطانی تک کا خیال نہیں، پھر حضورِ والا اس پر کس طرح اعتماد کریں گے

واگیہ نے اپنی فطری دلیری سے جواب دیا۔ "یہاں میں اپنی مرضی اور خواہش سے نہیں آیا ہوں، مجھے سلطان نے بلایا ہے، اب جبکہ میں اپنے ساتھیوں کو لے کر سرنگاپٹم میں داخل ہو چکا ہوں تم سب کو اپنے سلطان کے مہمانوں کی اس طرح اہانت اور بے عزتی نہیں کرنی چاہیئے۔"

سلطان ان کی تلخ باتیں ناگواری سے سن رہا تھا۔ اس نے پورنیا اور میر صادق کو ڈانٹا۔ "تمہیں یہاں اس لئے تمہیں طلب کیا گیا ہے کہ تم واگیہ کو اس کی فردِ جرم سناؤ۔ واگیہ کیا ہے اور یہ ہمارے کس سلوک کا مستحق ہے ہمیں خوب معلوم ہے!"

میر صادق نے جھک کر سلطان کو تعظیم دی اور ہاتھ جوڑ کر عرض کیا۔ "حضورِ والا! یہ غلام قرآن پاک کی قسم کھا کر جناب کو یہ یقین دلانا چاہتا ہے کہ ناچیز نے واگیہ کی بابت جو کچھ بھی کہا سنا ہے اس میں خلوص اور دیانت کا جذبہ کارفرما ہے، یہ غلام اس مملکتِ عظیم کا وزیر ہے اور اس منصب کی ذمہ داریوں کے پیش نظر واگیہ سے صفائی طلب کر رہا تھا!"

پورنیا نے عرض کیا۔ "اگر اعلیٰ حضرت اپنے حلیفوں کے دشمنوں پر اسی طرح کرم فرماتے رہے تو پھر وہ دن دور نہیں کہ اعلیٰ حضرت اپنے دوستوں کے اعتماد سے محروم ہو جائیں گے!"

سلطان ان شاطروں کی چرب زبانی سے مات کھا گیا۔ اس نے واگیہ سے سوال کیا۔ "تم نے ہمارے حلیف فرانسیسیوں پر تاخت کیوں کی؟ اور ان کی عورتوں کو ان سے کیوں چھین لیا؟"

واگیہ نے جواب دیا۔ "سلطان خوب اچھی طرح واقف ہیں کہ ہم حق پرست لوگ نہ تو کوئی خاندان رکھتے ہیں نہ کوئی گھر نہ در، دکن کی حکومت ہماری دشمن ہے۔ مرہٹے ہمارے خلاف ہیں انگریز ہمارے خون کے پیاسے ہیں، کچھ عرصے پہلے تک خود سلطان کا دل بھی ہماری طرف سے صاف نہ تھا ان حالات میں ہمیں کہیں سر چھپانے کی جگہ تک نہیں مل سکتی۔ ہمارے سپاہیوں کو عورتیں درکار تھیں، ایک سردار کی حیثیت سے میرا فرض تھا کہ میں ان کی یہ ضرورت پوری کرتا۔ اب ہم ان عورتوں کو ان کے وزراء کے حوالے کر دیں گے اور آئندہ اس قسم کی [illegible] نہیں کریں گے۔"

سلطان نے پورنیا کو حکم دیا۔ "واگیہ کے ساتھی آج سے ہمارے ملازم ہیں انہیں تین ماہ کی تنخواہیں پیشگی ادا کر دی جائیں!" پھر میر صادق کو حکم دیا۔ "سرنگاپٹم کے مشرقی حصے گنجام میں تم ان سب کی رہائش کا انتظام کر دو!" پھر اپنے معتمد سے کہا۔ "اور تم ان فرانسیسیوں کو طلب کر لو، جن کی عورتیں واگیہ کے قبضے میں ہیں!"

پورنیا، میر صادق اور سلطان کا معتمد، تینوں سلطان کے حکم کی تعمیل کے لئے باہر چلے گئے۔

سلطان نے واگیہ سے کہا۔ "واگیہ! تم ان کی باتوں سے بد دل نہ ہونا۔ یہ دونوں ہمارے

بہترین خیر خواہ ہیں اور نہیں چاہتے کہ ہم کسی طرح اور کسی وجہ سے، کسی پریشانی میں مبتلا ہو جائیں، انہوں نے تم سے جس قسم کی باتیں کیں، اس میں بدنیتی کو کوئی دخل نہیں!"

صاف گو داگیہ نے اپنی آزادانہ سرشت کے ماتحت جواب دیا۔ "اگر سلطان انہیں اپنا خیر خواہ اور مخلص تصوّر فرماتے ہیں تو انہیں کوئی کس طرح ٹوک سکتا ہے لیکن اس ناچیز کی رائے میں یہ دونوں نمک حرام اور غدّار ہیں ان سے وفاداری کی امید رکھنا ایسا ہے جیسے ببول سے آم کی توقع لگانا۔"

سلطان نے ناگواری سے داگیہ کو دیکھا۔ "اپنے خدمت گاروں کو ہم بہتر سمجھیں گے وہ لوگ جنہوں نے انہیں پہلی بار دیکھا ہو!"

داگیہ نے سلطان کی ناراضی کی پرواکئے بغیر پوچھا۔ "پورنیا اور میر صادق کی بابت اس ناچیز نے یہ عام شہرہ سن رکھا ہے کہ سلطان کے والد نواب حیدر علی خلد آشیاں نے آپ کو یہ حکم دیا تھا کہ ان دونوں کو فوراً قتل کر دیا جائے!"

سلطان نے کہا۔ "ہاں والد مرحوم نے ان دونوں کے خلاف یہ حکم دیا تھا لیکن ہم انہیں اپنا خیر خواہ اور دکھ سکھ کا ساتھی تصوّر فرماتے ہیں۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ والد مرحوم کی رائے سو فیصد درست ہی ہو!"

داگیہ نے بے بسی سے عرض کیا۔ "سلطان اپنے خدمت گاروں سے اچھی طرح واقف ہیں ہم کیا کہہ سکتے ہیں!"

اسی دوران سلطان کے روبرو شہر کوتوال اس جرم میں پیش کیا گیا کہ شہر میں کسی جگہ چوری ہو گئی تھی، اور شہر کوتوال چوروں کو پکڑنے میں ناکام رہا تھا۔ جس کا مال چوری ہوا تھا۔ اس نے رو کر بتایا کہ تقریباً دو ہزار پگوڈوں کا سامان چوری ہوا ہے۔ سلطان نے چشم زدن میں یہ فیصلہ سنا دیا کہ دو ہزار پگوڈے شہر کوتوال اپنے پاس سے ادا کر دے کیونکہ یہ چوری یا چوروں کا پتہ لگا اور ان سے مال برآمد کر کے صاحبِ سامان کے حوالے کرتا۔ چونکہ شہر کوتوال اس میں ناکام رہا تھا۔ اس لئے سلطانی قوانین کی رو سے یہ رقم شہر کوتوال کو ادا کرنی چاہیئے۔"

داگیہ کو سلطان کا یہ طریقہ بہت پسند آیا۔

فرانسیسی عورتیں ان کے مردوں کو واپس کر دی گئیں، داگیہ کے ساتھی سلطان کی فوج میں شامل کر دیئے گئے خود داگیہ کوئی عہدہ بھی نہ حاصل کر سکا۔ روزی اپنے ہم وطنوں میں پیہم کر پار کو تلاش کرتی رہی جہاں اسے بس اتنا علم ہو سکا کہ پام زدار دفعت ہو جانے کے بعد

دستے کے ہمراہ نیل گری گیا تھا۔ جو داگیہ کو سلطان کے پاس لایا ہے داگیہ نے اس کی ہلاکت کا جو واقعہ بیان کیا تھا اس کی تصدیق کوئی بھی نہ کر سکا۔

داگیہ کو آہستہ آہستہ یہ محسوس ہونے لگا کہ اس نے سرنگا پٹم آ کر عقل مندی نہیں کی، وہ اور سلطان کی سرد مہری کا شکار رہا۔ اس سے روزی بھی جدا ہو گئی، علاقہ گنجام کے ایک مکان میں وہ کسمپرسی اور بے بسی کی زندگی گزار رہا تھا اسے سلطان سے شکایت تھی کہ وہ یہاں سلطنتِ خداداد کی خواہش پر، اس کی مدد کرنے آیا تھا۔ اور وہ مسلمان ہو جانا چاہتا تھا۔ لیکن سلطان غدار امراء میں گھرا ہوا اسے نظر انداز کر رہا تھا۔ اس نے سلطان کو ایک خط لکھا:۔

"قبلۂ عالم! بندہ تو حضور والا کی خواہش پر اس خیال سے سرنگا پٹم آیا تھا کہ اس سے اس کی صلاحیتوں کے مطابق کوئی خدمت لی جائے گی لیکن یہ ناچیز اب تک حضور کی عدم التفاتی کا شکار رہے۔ خادم نے حضور کی تائید اور ہمدردی حاصل کرنے کے لئے یہاں تک فیصلہ کر لیا تھا کہ اپنے آبائی دھرم کو چھوڑ کر حضور والا کا مذہب اختیار کر لے لیکن حضور کی بے توجہی کی وجہ سے یہ خاکسار اب تک لوک پرلوک کی یہ نعمت بھی حاصل نہ کر سکا۔ یہ عاجز چاہتا ہے کہ حضور کو اس کی بابت جو فیصلہ بھی کرنا ہے جلد از جلد اس کا انکشاف فرما دیں۔ بندہ حد درجہ شکر گزار ہوگا!"

سلطان نے یہ خط اپنے امراء کے سامنے رکھ دیا اور ان سے مشورہ لیا کہ اسے کیا کرنا چاہیئے؟

میر صادق نے جواب دیا۔ "حضور والا! یہ غلام قرآن پاک کی قسم کھا کر یہ یقین دلانے کو تیار ہے کہ دھوندو جی داگیہ فریبی ہے اور اس کی میٹھی میٹھی باتوں میں بھی کوئی مکر ہے، قرآن پاک کی قسم جب تک آپ کا یہ غلام وزارت کے عہدے پر فائز ہے کسی لیٹرے کو حضور والا کے مزاج میں دخیل نہ ہونے دے گا!"

پورنیا نے دبے لفظوں میں کہا۔ "حضور خود ہی فیصلہ فرما لیں کہ جو شخص اتنی آسانی سے کسی ترغیب کے بغیر اپنے باپ دادا کا مذہب چھوڑنے پر آمادہ ہے وہ حضور کا یا اسلام کا کتنا وفادار ہوگا۔ داگیہ پیدائشی رہزن ہے ایک رہزن کا اسلام قبول کر لینا اس پوتر دھرم کے لئے عزت و آبرو کی بات تو نہیں!"

سلطان نے کہا۔ "ہم چاہتے ہیں کہ داگیہ کو کسی نہ کسی منصب سے سرفراز ضرور کریں، ہم اسے ایک دم کوئی بڑا منصب نہیں دینا چاہتے اگر وہ مسلمان ہونا چاہتا ہے تو اسے پہلے مسلمان ہو

جانے دیں گے اس کے بعد ایک عالم دینی امور کی تعلیم پر متعین کر دیا جائے گا اور جب وہ مذہ
اسلام اور شعائر اسلامی سے واقف ہو کر ان پر کاربند ہو جائے گا تو اسے کوئی اچھا سا منصب
عطا فرما دیں گے!"

میر صادق نے سلطان کو ایسی نظروں سے دیکھا جیسے وہ کچھ کہنا تو ضرور چاہتا ہے
پورنیا وغیرہ کی موجودگی میں کہنا نہیں چاہتا، سلطان نے موضوع بدل دیا اور بعض دوسر
امور زیر بحث آ گئے۔ انگریزوں اور فرانسیسیوں کا ذکر چھڑ گیا۔ سلطان فرانسیسیوں کی تعریف او
انگریزوں کی مذمت کر رہا تھا لیکن میر صادق نے دونوں کی مخالفت کی، کہنے لگا۔ "حضور والا! قر
قرآن پاک کی دونوں ہی ناقابلِ اعتبار ہیں، وہ انگریز ہوں یا فرانسیسی دونوں تاجر ہیں، دونوں ہی
زر اور برادرِ شغال ہیں، نہ انگریزوں پر اعتماد کیا جا سکتا ہے نہ فرانسیسیوں پر حضورِ والا مجھے تو ا
دونوں ہی سے نفرت ہے!"

پورنیا نے دست بستہ ہو کر سلطان سے جانے کی اجازت چاہی جو دے دی گئی۔ جب
پورنیا چلا گیا تو سلطان نے میر صادق سے کہا۔
"تو ہاں میر صاحب! تم اس وقت واگیہ کے بارے میں کچھ کہنا چاہتے تھے ؟
مصلحتاً نہ کہہ سکے تھے بولو، وہ کیا بات تھی جو تمہاری زبان پر آتے آتے رہ گئی!"

میر صادق نے جواب دیا۔ "حضورِ والا! واگیہ کے سلسلے میں آپ کے غلام کے ذہن میں
تجویز آئی ہے اگر حضرت اس کو عمل کی بھٹی سے گزار دیں تو واگیہ کی نیت کا کھرا کھوٹا پن فو
سامنے آ جائے گا!"

سلطان نے حکم دیا۔ "بیان کرو!"

میر صادق نے عرض کیا۔ "حضور والا! یہ غلام جو کچھ عرض کرے گا وہ سلطان کی محبت
اور خلوص میں ڈوب کر عرض کرے گا!"

سلطان نے کہا۔ "میر صاحب! ہمیں تمہاری محبت اور خلوص پر اعتماد ہے جو کچھ کہنا ہ
صاف صاف کہہ دیں!"

میر صادق نے کہا۔ "حضور والا! جیسا کہ واگیہ نے اپنے خط میں اسلام سے اپنی محبت
ذکر کیا ہے، حضور اسے فوراً مسلمان کر لیں، حضور والا اسے شرفِ ملاقات بخشنے کے لئے طلب فر
پھر جیسے ہی واگیہ یہاں آئے حضور والا کے خدام جبراً اپنے قابو میں لا کر اس کی سنت کر دیں، کی
کلمے کے ساتھ ہی ایک مسلمان کے لئے یہ ضروری رسم ہے!"

سلطان نے میر صادق کی اس تجویز کو اچنبھے سے سنا۔ میر صادق جلدی جلدی بولا۔ "

ی قسم حضور والا! سنّت کے بعد واگیہ کی یہ مجال نہ ہوگی کہ اسلام یا حضور سے انحراف کر سکے
سے حضور والا کا یہ فعل گراں گزرا تو یہ بات کھل کر سامنے آ جائے گی کہ واگیہ موقع پرست ہے
یا اسلام یا حضور سے کوئی محبت نہیں!"

سلطان نے میر صادق کو کوئی جواب تو نہ دیا لیکن کسی سوچ میں ضرور پڑ گیا۔ اسے میر
ادق کے خلوص پر اعتماد تھا اس لئے اس کی تجویز سے اختلاف نہ کر سکا۔

روزی اپنے ایک ادھیڑ عمر ہم وطن کے ساتھ واگیہ کے دروازے پر پہنچ کر اس کے
ک پڑوسی سے پوچھنے لگی۔ "کیوں جناب! کیا واگیہ جی اسی مکان میں رہتے ہیں؟"

واگیہ اپنی بیٹھک کا باہری دروازہ بند کیے کسی سوچ میں گم تھا، روزی کی آواز سن
کر دروازہ کھول دیا اور سر باہر نکالتا ہوا بولا۔ "کون؟ روزی! اندر آ جاؤ، میں یہاں موجود ہوں!"

روزی اپنے ادھیڑ عمر ساتھی کے ساتھ اندر داخل ہو گئی۔ واگیہ نے انہیں تیلے رنگ
کے موٹے گدّے کے فرش پر احترام سے بٹھا دیا اور خود بڑھ کر ٹیک لگانے کے لئے دو گاؤ
تکیے پیش کر دیے۔

روزی کچھ بولے بغیر اپنے ساتھی کے ساتھ، خاموشی سے یوں بیٹھ گئی جیسے اس میں کوئی
طوفان پھٹ پڑنے کے لئے اندر ہی اندر مچل رہا ہو۔

واگیہ بھی ان دونوں کے ساتھ بیٹھ گیا، بولا۔ "یہ میری خوش قسمتی ہے کہ میں تمہیں یاد آ گیا
ر تم میرے پاس بن بلائے آ گئیں!"

روزی نے غمگین آواز میں کہا۔ "واگیہ! اس وقت میں تمہارے پاس اس لئے آئی ہوں
کہ تمہیں پامر کی بابت جو کچھ بھی معلوم ہے مجھے سچ سچ بتا دو!"

واگیہ کے چہرے کی خوشی کافور ہو گئی۔ ہونٹ یوں اینٹھنے لگے جیسے ان سے کوئی تلخ شے
ٹکرا گئی ہو، بولا۔ "روزی! پامر چکا ہے، تم اس پر یقین کیوں نہیں کرتیں؟"

روزی جذباتی ہو گئی، ذرا زور سے بولی۔ "میں اس کی موت کا کس طرح یقین کر لوں،
واگیہ! اس کی لاش کہاں ہے؟"

واگیہ نے جواب دیا۔ "لاش کا مجھے خود بھی کوئی علم نہیں، کیونکہ اس کی موت میرے
سامنے نہیں واقع ہوئی!"

روزی نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیا، روتی ہوئی بولی۔ "واگیہ! تم جھوٹ بول
رہے ہو، میرا دل مجھے یہ بار بار یقین دلا رہا ہے کہ تم سچ نہیں بول رہے، کم از کم۔ پامر کے معاملے

میں تم ضرور جھوٹے ہو!"

داگیہ نے بدمزگی سے کہا۔ "اگر تم میری بات پر یقین نہیں کر رہیں تو نہ کرو تمہیں اس کا اختیار ہے اور اگر تم مجھے جھوٹا سمجھ رہی ہو تو مجھ سے سچ بلوا لو کسی طرح!"

روزی نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔ "اگر تمہیں سچ بولنے پر مجبور کر دینا میرے اختیار میں ہوتا تو داگیہ تم ـــ ہرگز اس طرح جھوٹ نہ بول سکتے!"

داگیہ نے اس بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ کچھ عجیب نظروں سے روزی کو دیکھنے لگا۔

اب اس کے ادھیڑ عمر ساتھی نے بولنے کے لئے کندھے اچکائے، بالوں پر ہاتھ پھیرتا ہوا بولا۔ "مسٹر داگیہ! جیسا کہ مجھے اپنی بھتیجی روزی کے ذریعے معلوم ہوا کہ آپ ایک بہادر اور باکردار انسان ہیں کچھ دنوں پہلے روزی مکمل آپ کے اختیار میں تھی لیکن آپ نے اس سے کوئی ناشائستہ سلوک نہیں کیا یہ بڑے ظرف اور کردار کی بات ہے۔ مسٹر پامر روزی کا منگیتر ہے اگر اس کی بابت آپ کچھ جانتے ہیں تو بتا دیں!"

داگیہ نے جواب دیا۔ "میں پامر کی بابت جو کچھ جانتا تھا، روزی کو بتا چکا ہوں، اس سے زیادہ کچھ بھی نہیں جانتا!"

روزی کے چچا نے کہا۔ "لیکن مسٹر داگیہ! پامر تو سلطانی دستے کے ساتھ تمہارے پاس گیا تھا پھر وہاں سے وہ واپس نہ آیا۔ اور تم نے روزی کو یہ بتایا ہے کہ اس کی موت کی اطلاع تمہیں کس شخص نے دی تھی، ہم دونوں یہ جاننا چاہتے ہیں کہ آخر وہ کون تھا جس نے تمہیں پامر کی موت کی خبر اور اس کی انگوٹھی دی تھی، تم نے روزی سے پامر کا حلیہ جس طرح بیان کیا تھا اس سے بھی یہی شبہ گزرتا ہے کہ تم خود پامر سے ملے ہو اور وہ جہاں بھی ہے تم اس سے واقف ہو!"

داگیہ نے مختصر جواب دیا۔ "میں کچھ بھی نہیں جانتا!"

روزی نے روتے ہوتے کہا۔ "داگیہ! میرا دل کہتا ہے کہ پامر زندہ ہے اور تم نے اس پر قابو پا کر کہیں قید کر دیا ہے۔ تم میری وجہ سے اسے قید میں رکھنا چاہتے ہو اور اس کی موت کا یقین دلا کر تم مجھے اپنی طرف ملتفت کرنا چاہتے ہو!"

داگیہ نے دہشت بھرے لہجے میں کہا۔ "بکواس بند کرو لڑکی، میرا دماغ نہ خراب کرو!"

روزی کے چچا نے مایوسی سے کہا۔ "روزی! ہمیں داگیہ کی بات پر یقین کر لینا چاہئے!"

روزی نے جھنجلا کر کہا۔ "میں ہرگز یقین نہ کروں گی اور ایک نہ ایک دن داگیہ کو سچ بولنے پر مجبور کر دوں گی!"

داگیہ نے اندرونی کرب سے اپنی آنکھیں بند کر لیں، جیسے وہ کسی بہت بڑے بوجھ

برداشت کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔

ماحول پر کچھ دیر سکوت طاری رہا ایسا سکوت جیسے کوئی موت واقع ہو گئی ہو۔

پھر اشکبار آنکھیں اٹھیں اور روزی نے داگیہ کو مخاطب کیا۔ "داگیہ! بس چند باتیں اسے اور کروں گی اس کے بعد چلی جاؤں گی۔"

داگیہ نے اسے رحم آمیز نظروں سے دیکھا، بولا۔ "کہو!"

روزی نے پوچھا۔ "تم نے چند دن پہلے جس بلند کرداری کا ثبوت دیا تھا کیا تم حقیقتاً ایسے ہی ہو کیونکہ وہ تمہارے پیشے کی نفی کرتا ہے؟"

داگیہ نے جواب دیا۔ "روزی! میں ناٹک کا اداکار نہیں، سپاہی ہوں۔"

روزی نے کہا۔ "تب میں تم سے ایک درخواست کروں گی!"

داگیہ اس کی صورت دیکھنے لگا۔

روزی لمحے بھر کے سکوت کے بعد بولی۔ "میں تمہارے ساتھ رہنا چاہتی ہوں داگیہ!"

"میرے ساتھ؟!۔ تم میرے ساتھ رہنا چاہتی ہو؟ آخر کیوں؟" داگیہ حیرت زدہ رہ گیا۔

"ہاں میں تمہارے ساتھ رہنا چاہتی ہوں لیکن ایک یقین دہانی پر! ایک شرط پر!"

روزی غیر یقینی انداز میں داگیہ کی صورت دیکھ رہی تھی۔

روزی کا چچا بھی حیرت سے اس کی شکل دیکھ رہا تھا۔

داگیہ نے نرمی سے پوچھا۔ "لیکن تم میرے ساتھ کیوں رہنا چاہتی ہو؟"

روزی نے جواب دیا۔ "اپنے رشتے داروں میں رہنے سے پامر یاد آتا ہے، میں اسے بھول جانا چاہتی ہوں!"

داگیہ کو کچھ امید بندھی، آہستہ سے بولا۔ "مجھے کوئی اعتراض نہیں جب سے چاہو میرے ساتھ رہنا شروع کر دو!"

روزی کے چچا نے ناگواری سے کہا۔ "یہ کس طرح ممکن ہے کہ ہم سب کے ہوتے ہوتے تم یہاں مسٹر داگیہ کے پاس رہو!"

روزی نے جواب دیا۔ "یہ اس طرح ممکن ہے کہ یہاں میں رہنا چاہتی ہوں!"

داگیہ نے خوشی کو چھپاتے ہوتے کہا۔ "میں وقت سے پہلے ہی تمہیں خوش آمدید کہنے کو تیار ہوں!"

روزی نے کہا۔ "لیکن پہلے مجھے یہ یقین دلا دو کہ تم مجھے اسی طرح رکھو گے جس طرح کچھ دن پہلے بھی مجھے رکھ چکے ہو!"

"وعدہ لینے کی کوئی ضرورت نہیں روزی!" واگیہ کہنے لگا۔ "تم یقین رکھو کہ کوئی بھی وہ کام جس کا تمہاری ذات سے کسی بھی قسم کا تعلق ہوگا تمہاری مرضی کے خلاف یا خواہش کے بغیر نہ ہوگا!"

"مجھے تم پر اطمینان ہے!" روزی نے جواب دیا۔

روزی کا چچا بار بار پہلو بدل رہا تھا۔

روزی نے واگیہ سے کہا۔ "کیا تھوڑا سا پانی پلاؤ گے؟"

واگیہ اندر جاتا ہوا بولا۔ "تھوڑا کیا بہت پیو۔ افسوس کہ میں شراب نہیں پیش کر سکتا کیونکہ مملکتِ خداداد کی حدود میں شراب قانوناً ممنوع ہے!"

روزی نے تلخی سے ہنس کر کہا۔ "اسی لئے تو پانی مانگ رہی ہوں!"

واگیہ بولا۔ "ابھی آیا چند منٹ میں!" وہ اندر چلا گیا۔

روزی جلدی جلدی چچا کو سمجھاتی ہوئی بولی۔ "میرے یہاں رہنے کے فیصلے سے آپ ذرا بھی پریشان نہ ہوں، یہاں رہنے میں ایک مصلحت ہے میرے خیال کے مطابق اگر پامر واقعی کہیں قید میں نہیں ہے تو پامر کے بارے میں جو کچھ بھی واگیہ کو معلوم ہوگا ایک نہ ایک دن اسے اگلوا لوں گی بس یہی ایک وجہ ہے یہاں رہنے کی!"

چچا نے مایوسی سے سر ہلا دیا۔ "روزی۔ تم ایک لٹیرے کے عہد پر کب تک یقین کرو گی!"

"اس طرف سے آپ بالکل مطمئن رہیں!" روزی اتنا کہہ کر چپ ہو رہی کیونکہ سامنے سے واگیہ آرہا تھا، پانی کا برتن اس کے ہاتھ میں تھا کٹورے نما لیکن اس سے ذرا بڑا۔

روزی نے پانی پیا اور اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ بولی۔ "واگیہ جی! میں اپنا سامان لے کر کل آرہی ہوں، اسی وقت!"

واگیہ نے خوشی کو دباتے ہوئے کہا۔ "روزی! میں تمہارا انتظار کروں گا۔ کیا ایسا ممکن نہیں ہے کہ تم اپنا سامان لے کر آج ہی یہاں آجاؤ!"

"کوشش کروں گی!" یہ کہتے ہوئے روزی نے چچا کا ہاتھ پکڑا اور بیٹھک سے باہر آ گئی۔

رات کی تاریکی میں ایک دو گھوڑوں والی گاڑی واگیہ کے دروازے پر آ کر کھڑی ہو گئی۔ واگیہ، روزی کا بے چینی سے انتظار کر رہا تھا، گاڑی کے رکتے ہی وہ دروازہ کھول کر باہر گیا اور روزی کے استقبال کو آگے بڑھا۔

لیکن گاڑی میں سے ایک گٹھے جسم کا ہندو اترا۔ اور اس نے اترتے ہی ایک دوسرے بھاری بھرکم شخص کو اترنے میں مدد دی۔ اجنبی ہندو نے پوچھا۔ "کیا واگیہ جی یہیں رہتے ہیں؟"

"ہاں!" واگیہ نے آگے بڑھ کر جواب دیا۔ "میں ہی دھوندو جی واگیہ ہوں!"

بھاری بھرکم شخص بولا۔ "تم ہمیں اندر لے چلو۔ تم سے کچھ ضروری باتیں کرنا ہیں!"

اس نے یہ آواز کہیں اور بھی سنی تھی، وہ ان دونوں کو اندر بیٹھک میں لئے چلا گیا۔

وہاں ایک دو انچ موٹی موم بتی جل رہی تھی، واگیہ نے اس بھاری بھرکم شخص کو فوراً ہی پہچان لیا "دیوان جی آپ! زہے نصیب۔ جو پورنیا جی ہمارے گھر تشریف لائے!"

"چپ رہ!" پورنیا نے شفقت سے ڈانٹا۔ "پہلے یہ بتا کہ اس گھر میں تیرے سوا اور کون رہتا ہے؟"

واگیہ نے جواب دیا۔ "یہاں میں تنہا رہتا ہوں۔ کیوں؟ کیا کوئی خاص بات؟"

"ہاں ہمیں تجھ سے کچھ خاص باتیں کرنا ہیں۔"

"تو کیجئے۔" واگیہ نے اجازت دے دی۔

پورنیا نے اپنے آدمی کو حکم دیا۔ "جاؤ، باہر جا کر کھڑے رہو، اور اس بات کی نگرانی کرتے رہو کہ یہاں کوئی ایسا ویسا آدمی تو نہیں آرہا!"

پورنیا کا آدمی باہر چلا گیا۔ تب پورنیا نے رازداری سے اپنی زبان کھولی۔ "کیوں شری دھوندو جی واگیہ! کیا میں چند ذاتی نوعیت کی باتیں تم سے کر سکتا ہوں؟"

"نہایت شوق سے!" واگیہ نے کہا۔

پورنیا، کم سے کم نرم لہجے میں بولا۔ "احمق تو اپنے آقاؤں کا انتخاب آخر کس طرح کرتا ہے؟ مجھے بھی تو بتا دے!"

واگیہ اس کی باتوں کا مطلب نہیں سمجھ سکا۔ بولا۔ "پورنیا جی جو کہنا ہے صاف صاف بتا دیجئے زیادہ وقت برباد کرنے سے فائدہ!"

پورنیا نے کہا۔ "یہ خبر سچی ہے کہ تو اسلام قبول کرنے والا ہے؟"

"ہاں یہ خبر درست ہے!"

پورنیا کے چہرے پر شکنیں پڑ گئیں، بولا۔ "تو ہندو قوم کا وقار ہے اگر تو کہے گا تو ہم تجھے میسور کے اصل راجا کے دربار میں کوئی منصب دلا دیں گے!"

واگیہ اس کا مطلب نہ سمجھنے کے انداز میں بولا۔ "میسور کا اصل راجا کہاں ہے؟"

پورنیا نے جواب دیا۔ "تجھے سب کچھ عنقریب معلوم ہو جائے گا، یہ بات اپنے

تک رکھنا کہ مملکتِ خداداد عنقریب ہستی سے نیست میں جانے والی ہے!"

داگیہ نے حیرت سے سوال کیا۔ "وہ کس طرح پورنیا جی؟ کچھ مجھے بھی تو بتاؤ!"

پورنیا نے کہا۔ "میسور پر پہلے ہندوؤں کا راج تھا لیکن بعد میں اس پر سلطان کے باپ حیدر علی نے زبردستی قبضہ کر لیا اب حیدر علی کے بعد سلطان حکومت کر رہا ہے لیکن میرے اندر بیٹھا کوئی کہہ رہا ہے کہ یہ حکومت پھر اپنے اصل حکمرانوں کے ہاتھ میں جانے والی ہے اور ہم سب ہندو، ملک کی بڑی طاقتوں سے مل کر غاصبوں کو ہٹانے کی کوششوں میں مصروف ہیں!"

داگیہ کا تیز ذہن پورنیا کی بات کا مطلب سمجھ گیا، بولا۔ "تو تم سلطان کا نمک کھا کر اس کے خلاف سازشیں کر رہے ہو! تھو ہے تم پر پورنیا جی! تم غدار ہو!"

پورنیا نے جواب دیا۔ "شری داگیہ جی! میں پہلے ہندو ہوں اس کے بعد کچھ اور اور تمہیں بھی یہی ہونا چاہیئے، میں نے جب سے یہ سنا ہے کہ تم ہندو دھرم چھوڑ کر سلطان کی خاطر مسلمان ہونے والے ہو، پریشان ہو گیا ہوں، خبردار جو تم نے ہندو دھرم چھوڑا!"

داگیہ نے جواب دیا۔ "میں اپنی مرضی کا مالک ہوں پورنیا جی! آپ ناحق پریشان ہوتے ہیں!"

پورنیا نے اپنے سیدھے ہاتھ کی ہتھیلی داگیہ کے سامنے کر دی، بولا۔ "داگیہ جی! اس ہاتھ پر اپنا سیدھا ہاتھ رکھ کر تم مجھ سے یہ عہد کرو کہ تم اپنی زندگی کی آخری سانس تک ہندو ہی رہو گے!"

داگیہ نے جواب دیا۔ "میں ایسا کوئی عہد نہیں کروں گا جس پر میرا دل آمادہ نہیں کرتا!"

پورنیا نے کہا۔ "اچھا! میں چلتا ہوں لیکن میری یہ بات نہ بھولنا کہ اب تم دربار میں ہرگز نہ جانا، اگر غلطی سے تم وہاں چلے بھی گئے تو جانتے ہو اس کا کیا انجام ہو گا؟"

"نہیں جانتا!" داگیہ بولا۔ "کچھ تمہی ہماری رہنمائی کرو کہ آخر تم کہنا کیا چاہتے ہو؟"

پورنیا بولا۔ "سلطان تمہیں جبراً مسلمان بنانے کی فکر میں ہے تم جس دن بھی وہاں گئے سلطان کے متعینہ آدمی تمہیں زبردستی مسلمان کر لیں گے!"

"جھوٹ!" داگیہ بولا۔ "بھلا یہ کس طرح ممکن ہے؟"

پورنیا بولا۔ "میں نے جو کچھ کہا ہے اس کی سچائی کا تجھے بہت جلد ثبوت مل جائے گا!"

داگیہ نے جواب دیا۔ "مجھے تو کچھ دیکھے بغیر ہی اللہ پر بھروسہ ہے!"

پورنیا عاجز آ کر یہ کہتا ہوا چلا گیا۔ "ہمیں اپنے ساتھیوں کو سخت سزائیں دلوانا کب پسند ہے پھر اس کے لئے تو....." بات نامکمل رہ گئی اور داگیہ اس عجیب و غریب غدار انسان کی بابت سوچتا ہی رہ گیا۔

روزی اپنا قیمتی سامان لے کر داگیہ کے گھر پہنچ گئی داگیہ نے اسے ایک ہال کمرہ اس لئے دے دیا کہ وہ اس میں اپنا زیادہ سے زیادہ سامان رکھ کر اطمینان سے رہ سکے۔

ان دنوں سلطنتِ خداداد آتش فشاں کے دہانے پر اپنی زندگی کی آخری سانسیں لے رہی تھی، تقریباً اڑتیس سال قبل ۱۷۶۱ء میں نواب حیدر علی نے اسے اپنے قبضے میں لے لیا تھا۔ یہاں پہلے ایک ہندو راجا تھا اور اس راجا کے تصرف و اقتدار میں صرف تینتیس گاؤں تھے۔ جس کے مجموعے کو ریاست میسور کہا جاتا تھا۔ لیکن جب یہ ریاست، سلطنتِ خداداد بن کر ابھری تو اس کی حدود ایک آزاد اور خودمختار ملک کی حیثیت اختیار کر گئیں جس کا اپنا ایک نظام تھا۔ اپنی ایک طاقتور فوج تھی، اپنی ایک آزاد خارجہ پالیسی تھی، ان دنوں امریکہ اپنے انگریز آقاؤں کے خلاف جنگ آزادی میں مشغول تھا۔ جارج واشنگٹن نے اپنے ملک سے انگلستانی اقتدار کو نکال باہر کیا اور کارنوالس، امریکہ کی زمام حکومت وہاں کی تیرہ ریاستوں کے حوالے کر کے احساس شکست خوردگی اور ندامت لئے جب وطن واپس گیا تو انگلستان کی وزارتِ عظمیٰ پوری دنیا کا نقشہ پھیلا کر بیٹھ گئی اور ان خطوں کی جستجو کرنے لگی جن کو اپنی نو آبادیات میں لا کر امریکہ کا نعم البدل قرار دیا جا سکتا، ان کی نگاہیں ہندوستان پر جم گئیں، انہوں نے کارنوالس کو سیاسی گناہ کے کفارے کے لئے ہندوستان کا گورنر جنرل بنا دیا یہ ہندوستان آیا اور تھوڑی سی مدت میں سازش اور سیاست کے وہ بیج بو گیا کہ جب یہ پودے بڑے ہو کر پھلے پھولے تو ہندوستان کی چھوٹی چھوٹی ریاستیں نفاق و نا اتفاقی کا شکار ہو گئیں، اودھ، بنگال، اڑیسہ، گوالیار، حیدر آباد، ارکاٹ اور پیشوائے پونا سبھی اس کے زیر دام آ چکے تھے لیکن ان میں تنہا ٹیپو کی نظریں ہندوستان کے مستقبل پر لگی ہوئی تھیں، خوار و زبوں، غلامی کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہندوستان۔

کہتے ہیں کہ انسانی آنکھ کی پتلی کے پیچھے ایک لچکدار محدب عدسہ ہوتا ہے خدا نے یہ عدسہ شیشے کے بجائے ایک مخصوص قسم کی جھلی میں بھری ہوئی شفاف رطوبت سے بنایا ہے جن لوگوں کی آنکھ کا یہ عدسہ ضرورت سے کم محدب ہوتا ہے وہ دور کی چیزیں تو صاف دیکھ سکتے ہیں مگر قریب کی چیزیں نہیں دیکھ سکتے۔ سلطان ٹیپو کو جس نوع کی سیاسی اور ملکی نظم و نسق کی بصیرت عطا ہوئی تھی اس میں اسے دور دراز کی چیزیں تو صاف نظر آ رہی تھیں لیکن جو کچھ ملک

کے اندر یا اس کے آس پاس ہو رہا تھا وہ اس کی سیاسی بصیرت سے اوجھل تھا۔ اس کی سیاسی بصیرت نے یہ تو دیکھ لیا کہ یورپ میں انگلستان اور فرانس آپس میں برسرِ پیکار ہیں اور فرانس سے تعلقات استوار کر کے انگریزوں کو زک پہنچائی جا سکتی ہے لیکن اندرونِ ملک جو سازشیں ہو رہی تھیں انہیں نہ دیکھ سکا۔ اس کی سیاسی بصیرت اسے یہ تو دکھا رہی تھی کہ ترکی، افغانستان، ایران اور بعض دوسری مسلم حکومت قائم کی جا سکتی ہے لیکن اسے میر صادق وزیرِ اعظم مملکتِ خداداد، میر قمر الدین سپہ سالار اور میر غلام علی لنگڑا امیر البحر اور انسپکٹر جنرل قلعہ جات کی سازشیں اور غداریاں نہیں نظر آ رہی تھیں، وہ میر میراں پورنیا کو نہیں پہچان سکا تھا جو میسور کی سابقہ رانی اور ہندو ریاست کی بحالی کی سرگرم کوششوں میں مشغول تھا۔

انگریزوں نے سلطنت خداداد کے خلاف حیدر آباد، ارکاٹ اور مرہٹوں کو اپنا ہمنوا بنا لیا۔ کارنوالس اپنے حصے کا کام ختم کر کے انگلستان واپس چلا گیا۔ اس کے بعد سر جان شور آیا اور پانچ سال کے عرصے میں اس نے شمالی ہند کی حکومت اودھ کو سیاسی حیثیت سے مفلوج کر کے رکھ دیا۔ اسی دوران بنگال کے انگریز فوجی افسروں نے بغاوت کی اور وہاں کی حکومت پر قبضہ کر لینا چاہا سر جان شور نے سختی کے بجائے نرم رویہ اختیار کیا اور باغیوں کی بہت سی شرائط مان لیں، اسی دوران سلطان ٹیپو یورپ کے فرانسیسی فاتح نپولین سے انگلستان کے خلاف تعلقات استوار کرنے کی کوششیں کر رہا تھا انگلستان کے حکمران ان حالات میں سر جان شور جیسے مصلحت اندیش اور نرم سیاستدان کو کس طرح برداشت کر سکتے تھے۔ انہوں نے سر جان شور کو انگلستان واپس بلا لیا اور اس کی جگہ لارڈ ولزلی کو ہندوستان کا گورنر جنرل بنا دیا گیا لارڈ ولزلی کی فرانسیسی بیوی نے ہندوستان جانے سے انکار کر دیا اور شوہر سے علیحدگی اختیار کر لی اور اس کا اثر یہ ہوا کہ زخم خوردہ ولزلی کو فرانس اور اس کے دوستوں سے سخت نفرت ہو گئی۔

جب وہ جنوبی افریقہ کے راستے ہندوستان آ رہا تھا تو راستے میں اس کی ان انگریز جنرلوں سے ملاقاتیں ہوئیں جو ٹیپو کی افواج سے کئی جگہ شکستیں اٹھا چکے تھے، یہیں اس کی حیدر آباد کے انگریز ریذیڈنٹ میجر کرک پیاٹرک سے بھی ملاقات ہوئی، جس نے ولزلی کو یہ تکنے کی بات بتائی کہ جب تک ہندوستان میں فرانسیسی موجود ہیں، انگریز ناکام رہیں گے یہیں اس نے سر جان شور کے وہ خطوط دیکھے جن میں اس نے اپنے انگلستانی آقاؤں کو لکھا تھا۔ "افسوس کہ میں ٹیپو کی بڑھتی ہوئی طاقت کو نہیں روک سکا۔"

ہندوستان پہنچتے پہنچتے ولزلی، یہاں کی ساری تفصیلات سے آگاہ ہو چکا تھا۔
سلطان نے فرانسیسی حکومت کو، مارشس میں سفارت بھیج کر جو عہد و پیمان

گئے تھے، پورنیا نے اس کی ایک نقل نئے گورنر جنرل ولزلی کو بھجوا دی، دوسری طرف میر غلام علی لنگڑا کے ذریعے سلطان ترکی سے جو خط و کتابت ہوئی تھی اس کی نقلیں بھی انگریزوں کو پہنچ چکی تھیں، لارڈ ولزلی کی آمد کی اطلاع سلطان کو بھی ہو چکی تھی۔ وہ انگریزی حدود میں ہونے والے رد و بدل کو تشویش سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے اپنی تشویش کا اظہار اپنے امراء پر بھی کیا۔ میر صادق نے سلطان کی تشویش کو ہنسی میں اڑا دیا۔ بولا "اللہ پاک کی قسم حضورِ والا! یہ فرنگی کئی ہزار میل کا سفر کر کے یہ ہزار پریشانی و خرابی ہندوستان تک پہنچتے ہیں، یہ تھکی ہاری قوم حضورِ والا کی بہادر افواج کا کس طرح مقابلہ کر سکتی ہے بھلا، آپ بے فکر رہیں آپ کے غلام انہیں وہ مزہ چکھائیں گے کہ بھاگ کر اپنے وطن ہی میں دم لیں گے جا کر!"

سلطان نے کہا۔ "اگر یہ قوم بہادر ہوتی تو ہم ہرگز فکر مند نہ ہوتے، یہ ایک مکار قوم ہے جو میدانِ جنگ کے بجائے سازشی قلعے تعمیر کر کے عیاری اور مکاری کے ہتھیاروں سے لڑتی ہے!"

"یہ اور بھی اچھا ہے!" میر صادق نے جواب دیا۔ "قسم کلام پاک کی حضورِ والا! کاٹھ کی ہانڈی بار بار نہیں چڑھتی، ان کی سازش اور سیاست بار بار تو کامیاب ہونے سے رہی، جب ان کا یہ داؤں ہمارے بچے بچے کو معلوم ہو جائے گا تو گویا ان کا یہ حربہ بالکل بے کار ہو جائے گا اور اس وقت یہ کیا کریں گے؟"

سامنے میر غلام علی لنگڑا بھی ٹانگیں پھیلائے آدابِ سلطانی کا خیال کئے بغیر بیٹھا تھا۔ سلطان اس سے مخاطب ہوا۔ پوچھا "کیوں میر صاحب! تمہارا کیا خیال ہے کیا ہم انگریزوں کو ان کے ناپاک منصوبوں میں ناکام بنا دیں گے؟"

غلام علی نے جواب دیا۔ "حضورِ والا! یہ ایک ایسا سوال ہے جس کا جواب اگر یہ ناچیز اثبات میں دے گا تو ممکن ہے اسے خوشامد اور چاپلوسی میں شمار کیا جائے اور اگر نفی میں دے گا تو یہ دروغ گوئی ہو گی۔ اس لئے مناسب یہی ہے کہ میر صادق نے جو کچھ فرمایا ہے اس کی تائید کر دی جائے!"

پورنیا نے کچھ کہنے کے لئے سر اٹھایا۔ سلطان نے اسے بھی بولنے کی اجازت دی۔ کہا "پورنیا! کیا تم بھی کچھ کہنا چاہتے ہو؟"

"جی ہاں خداوند!" پورنیا ادب سے گویا ہوا۔ "اس ناچیز کی تو یہ رائے ہے کہ خداوند انگریزوں سے خواہ مخواہ خائف ہیں، یہ جو نظام دکن، والیٔ ارکاٹ اور پیشوائے پونا اور انگریزوں میں اتحاد و یگانگت کی خبریں گرم ہو رہی ہیں، سب افواہیں ہیں، معلوم نہیں یہ افواہیں کون چھوڑتا ہے اس غلام کا تو یہ خیال ہے کہ فرنگی خود یہ افواہیں پھیلا رہے ہیں تاکہ حضورِ والا ان سے

خوفزدہ ہوجائیں اور اپنے پڑوسیوں کی دشمنی مول لے لیں!"

سلطان نے جواب دیا۔ "خدا کرے تم جو کہہ رہے ہو وہی درست ہو لیکن ہمیں ا
کی طرف سے غافل نہیں رہنا چاہیئے۔" پھر وہ میر قمر الدین سپہ سالار سلطنتِ خداداد کی طرف
رجوع ہوا۔ اسے حکم دیا۔ "قمر الدین! فوجوں کو ہر وقت تیار رکھو معلوم نہیں کس وقت نقا
جنگ بج جائے!"

آزمودہ کار قمر الدین نے جواب دیا۔ "حضور بالکل بے فکر رہیں، اب جو جنگ ہوگی
وہ ہماری آخری جنگ ہوگی!"

میر صادق نے آہستہ سے نیاز مندانہ عرض کیا۔ "حضور والا! واگیہ کا کیا بنا؟"

سلطان نے حکم دیا۔ "اسے کل ماید ولت کے روبرو حاضری کا حکم دیا جائے!"

میر صادق نے نیاز مندی سے کہا۔ "بہت خوب حضورِ والا! اور اس غلام کی رائے
میں، کل ہی اسے نعمتِ اسلام سے بھی نواز دیا جائے۔ قرآن پاک کی قسم بڑا نیک کام ہوگا۔"
پورنیا نے ناگواری سے منہ بنایا لیکن میر صادق کے علاوہ کوئی اور اسے محسوس
نہ کر سکا۔

روزی، بیکار واگیہ کے پاس بیٹھی گھنٹوں باتیں کرتی رہتی۔ وہ فرانس کے شمالی
صوبے نارمنڈی کے روون نامی شہر سے تعلق رکھتی تھی جہاں جون آف آرک کو جادوگر قرار
دے کر زندہ جلا دینے کے ایک عرصے بعد ولی تسلیم کر لیا گیا تھا۔ اس کے وطن میں سیبوں سے
بڑا پیار کیا جاتا تھا۔ وہ وہاں کی ہر شے کا نہایت عقیدت اور محبت سے ذکر کرتی، وہ دریائے سین
کی پر لطف روانی کا ذکر اس طرح کرتی جیسے وہ کسی بہشتی دریا کا ذکر کر رہی ہو جب اسے اپنا بچپن
یاد آتا تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی کیونکہ اس تصور میں اس کے ساتھ پامر موجود ہوتا جو معلوم
نہیں کہاں لاپتہ ہو گیا تھا۔

روزی اپنے پامر کی کچھ یادگاریں سامنے رکھ کر اس کا والہانہ ذکر کر رہی تھی اس نے
ایک نارنجی رنگ کے رومال کو اٹھا کر پیشانی سے لگا لیا۔ بولی۔ "جب پامر کے سر میں درد اٹھتا تھا
تو وہ ہمیشہ اسے اپنی پیشانی کے گرد لپیٹ لیا کرتا تھا!"

واگیہ نے سنی ان سنی کے انداز میں روزی کی طرف دیکھا اور دیکھتا رہ گیا۔

روزی نے ایک چوڑے کناروں والا ہیٹ اٹھا لیا۔ بولی۔ "وہ یہاں کی دھوپ سے
بہت پریشان ہو جاتا تھا، جب باہر نکلتا تو اسے ضرور پہن لیتا تھا۔"

واگیہ نے بے توجہی سے کہا۔ "اب ان باتوں سے فائدہ؟ مرے ہوئے انسان کو یاد کرنے
سے فائدہ!!"

روزی اس کی آنکھوں میں کچھ تلاش کرنے لگی، بولی۔ "واگیہ! تم مجھ سے کچھ چھپاتے
ہو معلوم نہیں کیوں، تم مجھ سے پامر کی بابت جو کچھ کہتے ہو اس پر مجھے یقین نہیں آتا!"

"یہ اس لئے کہ تم پامر کی محبت میں پاگل ہو گئی ہو، ایک معمولی ناتجربے کار نوجوان سے
اتنی محبت! حماقت نہیں تو اور کیا ہے!"

روزی نے اس سے غیر متوقع سوال کیا۔ "اگر میں تم سے یہ وعدہ کر لوں کہ اپنے دل سے
پامر کا خیال نکال کر تمہیں اپنے دل میں بسا لوں گی تو کیا تم میری چند باتیں مان لوگے؟"

واگیہ نے غیر یقینی انداز میں روزی کو دیکھا اور کہنے لگا۔ "میں نہیں سمجھتا کہ تم پامر کی
جگہ مجھے کس طرح دے دو گی!"

"لیکن تم میری بات کا یقین کر لو!" روزی کہنے لگی۔ "میں ہندوستان چھوڑ دینا چاہتی
ہوں مجھے یہاں کچھ اچھا نہیں لگتا۔ کیا تم میرے ساتھ فرانس چلو گے، وہاں ہم دونوں دریائے سین
کے کنارے اپنی زندگیاں گزار دیں گے!"

"ناممکن!" واگیہ نے جواب دیا۔ "میں اپنے وطن کو دشمنوں کے حوالے کر کے کس طرح
جا سکتا ہوں!!"

روزی نے کہا۔ "تم اپنے وطن کو انگریزوں سے کس طرح بچا لوگے؟"

واگیہ نے جواب دیا۔ "کل کا حال کسے معلوم ہے، میں تو بس ایک بات جانتا ہوں وہ یہ
کہ اگر میں بدقسمتی سے انگریزوں اور ان کے حلیفوں کو شکست نہ دے سکا تو انہیں تنگ ضرور
کرتا رہوں گا۔ میرے پاس نہ تو خطہ زمین ہے نہ کوئی قلعہ، میں شب و روز اپنے ساتھیوں کے
ساتھ وطن دشمنوں پر تاخت کرتا رہوں گا یہاں تک کہ ایک دن شاید میں خود بھی اپنے وطن
پر قربان ہو جاؤں۔"

روزی حیرت سے اس سرپھرے جیالے کی باتیں سنتی رہی، بولی۔ "واگیہ! تم اپنے
کردار اور باتوں سے میرے دل میں گھر کرتے جا رہے ہو اگر تم چاہو تو میں تمہاری خاطر اسی ملک
میں رہ سکتی ہوں لیکن میں اس دکنی حصے میں نہیں رہنا چاہتی تم مجھے شمالی ہندوستان کے
پہاڑی علاقوں میں لے چلو، ہمالیائی بستیوں میں، میں اپنی بقیہ زندگی گمنامی میں گزار دینا
چاہتی ہوں!"

"روزی! میرے سامنے ایک عظیم الشان مقصد ہے، اس مقصد کو نظر انداز کر کے

تمہیں کس طرح حاصل کر سکتا ہوں !!"

"تب پھر تم ایسا کرو واگیہ کہ مجھے کسی طرح پامر سے ملا دو، میں اس سے کہہ دوں گی کہ اب میں تم جیسے معمولی انسان سے محبّت نہیں کر سکتی کیونکہ مجھے واگیہ جیسا بہادر اور صاحبِ کردار مل گیا ہے، میں پامر کے عہد و پیمان اسے واپس کر دینا چاہتی ہوں !"

واگیہ نے روزی کو معنی خیز نظروں سے دیکھا' بولا "میں سمجھا تمہارا مطلب! خوب!!"

اسی لمحے دروازے پر دستک ہوئی۔ واگیہ باہر نکلا تو پتہ چلا "قبلۂ عالم سلطان ٹیپو اسے یاد فرما رہے ہیں !"

واگیہ اندر گیا اور روزی سے بولا۔ "مجھے سلطان نے یاد کیا ہے اب شاید میں کچھ کارآمد ہو جاؤں، اگر موقع ملا تو پامر کی بابت کچھ اور باتیں ہو جائیں گی !"

اس کے بعد واگیہ جانے کی تیاری کرنے لگا۔ روزی اسے بے چینی سے دیکھتی رہی' جب کہانی رنگ پر آئی تو داستان گو محفل سے اٹھ گیا۔

واگیہ اپنے خیالوں میں کھویا ہوا جب شاہی ڈیوڑھی پر پہنچا تو اچانک اس پر کئی آدمی ٹوٹ پڑے، یہ سب بھاری بھرکم اور تن و توش کے لوگ تھے انہوں نے واگیہ کو قابو میں کر کے زنجیر سے جکڑ دیا۔ شاہی جراح ان کے ہمراہ تھا' یہ واگیہ کو لے کر شاہی ڈیوڑھی کے ایک بند حصّے میں چلے گئے وہاں شاہی جراح اپنا استرا لے کر بے بس واگیہ کی طرف بڑھا۔

واگیہ نے حیرت سے پوچھا۔ "کیا تم لوگ مجھے ہلاک کر دینا چاہتے ہو؟"

"نہیں !" شاہی جراح نے جواب دیا۔ "مجھے وزیر اعظم میر صادق نے یہ حکم دیا ہے کہ میں تمہاری اسلام پسندی کے پیشِ نظر سنّت کر کے مسلمان بنا لوں' میرا خیال ہے میرا یہ فعل تمہیں گراں نہیں گزرے گا !"

بے بس واگیہ نے آنکھیں بند کر لیں' پوچھا۔ "کیا اس میں سلطان کی مرضی بھی شامل ہے؟"

"ہاں !" شاہی جراح نے جواب دیا۔ "سلطان نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں میر صادق کے حکم کی تعمیل کر دوں !"

واگیہ نے آہستہ سے کہا۔ "تم سلطان کا حکم پورا کر دو !"

اور ذرا دیر بعد واگیہ، دھوندو جی واگیہ کے بجائے شیخ احمد ہو چکا تھا۔ سنّت کے بعد ایک عالمِ دین نے اس سے کلمہ پڑھوایا اور اسے اسلام کی بنیادی تعلیمات سے آگاہ کیا۔

واگیہ نے عالمِ دین سے کہا۔ "حضرت! آپ سلطان سے اس غلام کا سلام عرض کر دیں

ہیں کہ مجھے اپنا اسلامی نام شیخ احمد پسند تو ہے لیکن میں چاہتا ہوں مجھے ملک جہاں خان کے
اب سے بھی سرفراز کیا جائے !"

تھوڑی دیر بعد سلطان نے اسے اس کا پسندیدہ خطاب بھی عطا فرما دیا۔

چند دنوں بعد جب ملک جہاں خان کی حالت سنبھلی تو سلطان کی طرف سے ایک عالم
ں پابندی سے حاضر ہونے لگا اور ملک جہاں خان کو اسلامی تعلیمات سے آگاہ کرنے لگا۔

روزی کو بھی اس واقعے کا علم ہو گیا وہ کانپ گئی اور اس نے ملک جہاں خان سے پوچھا
اگیہ جی ! کیا تم اب بھی سلطان کے وفادار ہو؟"

ملک جہاں خان نے جواب دیا۔ "براہ کرم تم مجھے اب واگیہ جی نہ کہو۔ اب میں مسلمان ہو
کا ہوں اور میرا اسلامی نام ملک جہاں خان ہے !"

روزی نے پوچھا۔ "کیا تم مسلمان ہو جانے پر خوش ہو؟"

"بالکل خوش ہوں، میں ہمیشہ سے اسلام کو پسند کرتا ہوں' میرے ساتھ جو کچھ ہوا ہے
ں میں سلطان سے زیادہ میر صادق کا عناد کارفرما ہے اور میں اسے کسی طرح بھی کامیاب نہ ہونے
دں گا !"

جب وہ بالکل اچھا ہو گیا اور تعلیمات اسلامی سے بھی بہرہ ور ہو گیا تو سلطان کو اس
ر بڑا رحم آیا اس نے میر صادق کو حکم دیا۔ "میر صاحب ! ملک جہاں خان ہر طرح یہ ثابت کر چکا ہے
کہ وہ ہمارا وفادار ہے' اب ہمیں اسے کسی قلعے کی سرداری سونپ دینی چاہیئے تم اسے کل ہی کسی
قلعے پر روانہ کر دو !"

میر صادق نے دونوں ہاتھ اپنے کانوں پر رکھ لئے' بولا۔ "قبلۂ عالم ! اگر آپ اسے کوئی
ذمّے داری دے رہے ہیں تو بشوق دیں لیکن اگر اس غلام کی رائے معلوم کریں گے تو اللہ پاک کی قسم
برنا چیز یہی کہے گا کہ اس جیسے راہزن کو کوئی ذمّہ داری کا منصب عطا فرمانا سخت غلطی ہو گی وہ
ایک ڈاکو ہے جو اپنے چند اوباشوں کے ساتھ حیدر آباد، پونا اور خود حضور والا کے فدائیوں پر
چھاپے مار کر گزر بسر کرتا رہا ہے ایسے داغی اور ناقابلِ اعتبار شخص کو مطلق العنان بنا دینا مصالح
ملکی کے خلاف ہے کیونکہ اس کا اندیشہ ہے کہ آگے چل کر وہ ایسا فتنہ برپا کرے گا کہ اس کا تدارک
دشوار ہو جائے گا !"

میر صادق کی باتیں اثر کر گئیں اور سلطان نے ملک جہاں خان کو کوئی منصب بھی نہ دیا۔

ملک جہاں خان جب بالکل مایوس ہو گیا تو اس نے ایک دن سلطان سے درخواست
کی کہ اسے سلطان کے بڑے بیٹے فتح حیدر سلطان کی ملازمت میں چلا جانے دیا جائے پھر جب

سلطان کو ضرورت ہو گی ملک جہاں خان آجاتے گا!"

سلطان نے اس بات کی اجازت دے دی۔

ملک جہاں خان نے روزی سے کہا۔ "روزی! میں سرنگا پٹم کے باہر شہزادے ف حیدر کی ملازمت میں جا رہا ہوں، ظاہر ہے تم میرے ساتھ نہیں چل سکو گی، بولو، کہاں پسند کرو گی؟"

"میں تمہارے ساتھ چلوں گی!" روزی نے جواب دیا۔ "شہزادے کی فوج میں بہ فرانسیسی موجود ہیں، ان دنوں میرے چچا بھی وہیں گئے ہوتے ہیں!"

روزی ملک جہاں خان کے ساتھ سرنگا پٹم کے باہر کری گڑھ کے پہاڑی علاقے چلی گئی۔

سلطان نے فرانس کے لئے جو سفارت ماریشس بھیجی تھی واپس آچکی تھی اس دو ہفتے پہلے ولزلی نے سلطان کو لکھا تھا۔

"آپ یہ خبر سن کر خوشی محسوس کریں گے کہ یورپ میں انگلستان نے فرانس کو شکا دے دی ہے!"

سلطان کو خوب معلوم تھا کہ یہ خبریں اسے جلانے کے لئے بھیجی جا رہی ہیں۔

سلطان کو ۱۸ نومبر (۱۷۹۸ء) کو ایک خط اور موصول ہوا۔ لارڈ ولزلی نے لکھا

"یہ ناممکن ہے کہ آپ یہ سمجھ رہے ہوں مجھے اس خبر کی اطلاع نہیں ہے کہ آپ کمپنی دشمن فرانس سے کس قسم کی خط و کتابت کر رہے ہیں۔ معاملے کی تحقیق کے لئے میجر ڈوٹن کا جا رہا ہے اور اسے یہ ہدایت کر دی گئی ہے کہ وہ کمپنی کے تحفظ کے لئے سلطان سے جو علاقہ چاہے طلب کر لے۔"

سلطان، ولزلی کے مقصد سے آگاہ ہو گیا اور اس نے جنگ کی تیاری شروع کر سلطان فوج لے کر سداسیر پہنچا اور انگریزی فوجوں سے نبرد آزما ہو گیا۔ وہیں اس نے یہ تشویشناک خبر سنی کہ انگریزی افواج سرنگا پٹم کی طرف بڑھ رہی ہیں، سلطان اپنی افواج کے ساتھ سرنگا پٹم آگیا۔

میر قمر الدین جسے انگریزوں کی سرکوبی کے لئے ایک دوسرے محاذ پر متعین کیا گیا تھا وہ انگریزی فوج کے پیچھے پیچھے جنگ کئے بغیر اس طرح آیا گویا وہ انگریزی فوج کا باربردار حصہ ہو۔

انگریزی فوجیں کسی مدافعت یا رکاوٹ کے بغیر سرنگا پٹم کے چاروں طرف پھیل

ں کے ساتھ، ان کے حلیف بھی تھے، سلطان کے ایک منصب دار میر قاسم علی نے انگریزی ی، قلعے کے جنوب مغربی گوشے کے اس حصے میں رہنمائی کی جو قلعے کا سب سے کمزور پہلو گریزی فوجیں قلعے کے گرد مورچے مضبوط کر کے گولہ باری کرنے لگیں، اب سلطان محصور تھا اور اس بات پر حیران تھا کہ اس کے جرنیل موثر مدافعت کیوں نہیں کر رہے اس موقع پر مسلم ملک جہاں خان یاد آیا جو اس سے دل برداشتہ ہو کر اس کے بڑے بیٹے فتح حیدر ن کری گڑھ کے پہاڑی علاقے میں چلا گیا تھا اس نازک موقع پر سلطان نے فرانسیسی ں کو طلب کیا اور ان سے مشورہ چاہا۔ فرانسیسی جرنیل موسیو سپیو کو مخاطب کرتے ہوئے ن نے کہا۔

"میرے غیر ملکی دوستو! تم دیکھ رہے ہو کہ ہم اس وقت جن حالات سے دوچار ہیں اطمینان نہیں کیا جا سکتا جنہیں ہم اب تک اپنا معتمد اور یار غار جانتے تھے ان کی دغابازی ری حیرت سے دیکھ رہے ہیں، غنیم کا زور روز بلکہ ساعت بساعت بڑھتا جا رہا ہے لات میں ہمیں کیا کرنا چاہیئے؟"

موسیو سپیو نے شدتِ جذبات سے جواب دیا۔ "حضورِ والا! ہم نے آپ کا نمک کھایا لا حضورِ والا نے ہمیشہ ہی ہم پر بھروسہ کیا ہے ہم ہر وقت اپنا خون بہانے کو تیار ہیں، ان حالات میں ہم یہی رائے دے سکتے ہیں کہ حضورِ والا جواہرات کی پیٹیاں، اشرفیاں اور توشک کا قیمتی سامان لے کر، خواتین حرم سرا کے ساتھ، نصف رات کے بعد شمالی صوبے سرایا چتل ر چلے جائیں، باہر دس ہزار سوار اور پانچ ہزار پیادہ فوج جاں نثاری کو موجود ہے وہ آپ کو ات سرایا چتل درگ تک پہنچا دے گی!"

سلطان نے پوچھا۔ "اور سرنگا پٹم کس پر چھوڑ جائیں؟"

موسیو سپیو نے جواب دیا۔ "سرنگا پٹم اور قلعے کو فدوی اور فدوی کے ہم وطن سپہ سالار الی کے سپرد فرما جائیں ہم اس کا وعدہ کرتے ہیں کہ جب تک ہم میں سے ایک بھی زندہ رہے ور کے ادائے حقِ نمک میں کوتاہی نہ کرے گا۔"

موسیو سپیو اتنا کہہ کر ایک دم چپ ہو گیا۔ سلطان نے کہا۔ "ہاں ہاں، اور اور، تم چپ ہو گئے؟ بولو تم اور کیا کہنا چاہتے ہو؟"

موسیو سپیو نے سر جھکا رکھا تھا۔ سلطان سے نظریں ملائے بغیر بولا۔ "اگر حضورِ والا ردی کی اس تجویز سے اختلاف ہو تو انگریزوں کو دوست بنا لینے کی ایک اور تجویز بھی فدوی اس موجود ہے!"

سلطان نے کہا۔ "بیان کرو!"

موسیو سپیو نے عرض کیا۔ "انگریزوں کو ہم فرانسیسیوں کے ساتھ کینہ و پرخاش زیاد ہے، حضور والا ہم فرانسیسیوں کو انگریزوں کے حوالے فرما دیں ہمیں یقین ہے کہ ہماری گرفتاری کے انگریز مصالحت پر آمادہ ہو جائیں گے!"

سلطان، موسیو سپیو کی باتوں سے بہت متاثر ہوا۔ نہایت دکھ سے کہنے لگا۔ "د تم غریب الوطن ہماری طلبی پر یہاں آئے ہو اور ہمیشہ ہمارے وفادار اور رفیق رہے ہو۔ پھر طرح ممکن ہے کہ تم جیسا شریف، بہادر، نمک حلال اور وفادار دوست دشمنوں کے حوالے کر دیا اگر ہماری پوری سلطنت تلف و تاراج ہو جائے تو بھی ہمیں افسوس نہ ہوگا لیکن یہ ناممکن ہے تمہیں انگریزوں کے حوالے کر دیں!"

سلطان نے اندر جا کر جواہرات، خزانہ اور توشک خانے کا قیمتی سامان یک جا ان کے لئے ہاتھیوں اور اونٹوں کا انتظام بھی کر لیا گیا۔ مستورات کے لئے تیز رفتار بیلوں اور کا انتظام بھی ہو گیا۔

اس کے بعد سلطان نے پورنیا اور میر صادق سے فرانسیسیوں کی تجویز کا ذکر کیا اور ا مشورہ طلب کیا کہ ان حالات میں سلطان کو کیا کرنا چاہیئے؟

میر صادق نے ہاتھ جوڑ کر عرض کیا۔ "اللہ پاک کی قسم حضور والا۔ ہم نمک خوار جب زندہ ہیں حضورِ والا کے پسینے پر اپنا خون بہا دیں گے رہا قوم فرانس کی تجویز کا مسئلہ، تو پاک کی قسم اس قوم نے کس سے وفا کی ہے جو آپ کے ساتھ کرے گی۔ یہ غلام پہلے ہی عرض ہے کہ فرانسیسی اور انگریز الگ الگ نہیں ہیں، دونوں ایک ہیں، ایک سگِ زرد ہے تو دا برادرِ شغال۔"

سلطان نے پورنیا کی طرف دیکھا، اس نے عرض کیا۔ "حضورِ والا کو یہ یقین رکھ چاہیئے کہ جیسے ہی حضرت سرنگا پٹم کا قلعہ فرانسیسیوں کے حوالے کریں گے یہ اسے انگریزوں حوالے کر دیں گے!"

سلطان نے کہا۔ "تب پھر تم لوگ انگریزوں سے صلح کی بات کرو!"

پورنیا نے جواب دیا۔ "ہاں یہ آسان اور ممکن ہے!"

میر صادق نے کہا۔ "وہ صلح کی بات ہو یا نہ ہو لیکن حضور والا کو یہ یقین کر لینا چاہ انگریز قوم حضرت سے جنگ میں نہیں جیت سکتی، ہاں عیاری اور مکاری میں البتہ اسے ح والا پر تفوق حاصل ہے!"

سلطان کا ایک وفد صلح کی درخواست لے کر انگریز جرنیل ہارس کے پاس گیا اسے پہلے ی سے یہ خفیہ ہدایت مل چکی تھی کہ سرنگا پٹم کے فتح ہونے تک صلح کی گفت و شنید نہ کی جائے جنرل ارس سلطان کے مزاج سے واقف تھا۔ اس نے سلطان کے وفد کے سامنے صلح کے لئے ایسی شرائط کھ دیں جنہیں سلطان کسی قیمت پر بھی نہ مان سکتا تھا۔

جنرل ہارس نے کہا۔ "سلطان تمام فرانسیسیوں کو برطرف کر کے، تمام ساحلی علاقے ہمارے حوالے کر دے اور غیر مشروط اطاعت کا اقرار کرے تو صلح کی جا سکتی ہے اگر یہ تینوں شرطیں چوبیس گھنٹوں کے اندر مان لی گئیں تو صلح ہو سکتی ہے ورنہ نہیں!"

جنرل ہارس کی شرائطِ صلح جب سلطان کے سامنے بیان کی گئیں تو اس نے حقارت سے انہیں مسترد کر دیا۔

توپوں کے چلنے کی آوازیں پورے سرنگا پٹم میں گونج رہی تھیں، مختلف سمتوں سے انگریزی افواج کے گولے سرنگا پٹم میں تباہی مچا رہے تھے۔ اور سلطانی افواج کے گولے فضا میں سن اور مٹی بکھیر رہے تھے کیونکہ ان گولوں میں بارود کی جگہ سن اور مٹی بھری ہوئی تھی۔

سلطان نے جواہرات، خزانے اور توشک خانے کے قیمتی سامان اور حرم سرا کے ساتھ جانے سے پہلے اپنے امراء کو فیصلے سے آگاہ کیا۔ کہا۔ "فرانسیسی دوستوں کی رائے مناسب تھی ہم سرا یا چیتل درگ روانہ ہو رہے ہیں کیونکہ سرنگا پٹم کی جنگ میں اب کچھ نہیں رہا۔"

بدر الزمان نامی ایک غدار نے سلطان کو اس فرانسیسی تجویز پر عمل کرنے سے روکا۔ اس نے کہا۔ "قبلۂ عالم! آپ یہ کیا غضب فرما رہے ہیں، حضور والا کے جان نثاروں کو جیسے ہی یہ معلوم ہوگا کہ حضرت اپنی حرم اور خزانے کے ساتھ سرنگا پٹم سے باہر تشریف لے گئے ہیں ہمتیں ہار بیٹھیں گے اور سارا شیرازہ منتشر ہو جائے گا۔ ان حالات میں آپ کا یہ غلام، حضور والا کے اس غیر شاہانہ اور شایانِ ہمت کے خلاف عمل کی تائید نہ کرے گا!"

سلطان نے بدر الزماں کے جواب پر اپنے سامنے موجود امراء کی صورتیں دیکھیں وہ سبھی سر جھکائے کھڑے تھے، اور ان میں سلطان سے آنکھیں ملانے کی بھی ہمت نہ تھی۔

سلطان نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "رضائے مولا بر ہمہ اولیٰ!"

اور اس نے تمام بندھا ہوا سامان توشک خانے میں رکھوا دیا۔

۴ مئی کی صبح دس بجے نجومیوں نے حاضری دی اور سلطان کو بتایا کہ آج کا دن حضور

کے لئے بہت منحوس ہے، سلطان نے نحوست دور کرنے کے لئے ایک ہاتھی کالے مخملی جھول سمیت جس کی جھالر میں کئی سیر موتی ٹنکے ہوتے تھے، فقراء میں تقسیم کر دیا۔ اسے خبر ملی تھی کہ قلعے کی شمالی فصیل ٹوٹ چکی ہے، سلطان فصیل کے معائنے کو پہنچا اور وہیں آم کے سایہ دار درخت کے نیچے بیٹھ کر خاصہ طلب کیا۔ اس کے آس پاس جو امراء اور وزراء موجود تھے وہ سلطان سے نظریں چرا رہے تھے۔ کھانا آیا۔ سلطان نے پہلا لقمہ منہ میں رکھا ہی تھا کہ جنوب سے آہ و واویلا کا شور بلند ہوا۔ سلطان نے کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا۔ پوچھا۔ "معلوم کیا جائے کہ یہ لوگ آہ و واویلا کیوں مچا رہے ہیں؟"

واویلا کرنے والے جنوب مغربی محاذ کے سپاہی تھے۔ انہوں نے یہ اندوہ ناک خبر سنائی کہ جنوب مغربی محاذ کا وفادار جرنیل سید غفار شہید ہو گیا۔ سلطان نے ہاتھ کا لقمہ رکھ دیا اور اپنے امراء اور وزراء پر نظر ڈالی۔ سبھی مطمئن اور بے فکر سر جھکائے کھڑے تھے۔ سلطان نے انہیں شاید پہلی بار ملامت کی، کہا۔ "غدارو! تمہیں اپنی غداری کا جو صلہ ملے گا ہمیں معلوم ہے۔ ہندوستان غیر ملکیوں کی غلامی میں چلا جائے گا۔ یہاں کی صنعت و معیشت تباہ ہو جائے گی۔ تمہارے پسینے اور خون کی سرخی انگریزوں کے چہروں پر جھلکے گی۔ تم اور تمہاری نسلیں اس ملک میں محتاج اور ذلیل ہو کر ایک ایک دانہ چاول اور پیاز کی ایک ایک گانٹھ کو ترسیں گی۔"

سلطان کھڑا ہو گیا۔ تلوار پرتلے میں ڈالی اور دونالی بندوق لے کر گھوڑے پر سوار ہو گیا، اور ڈڈی نامی دروازے سے باہر نکلا۔ سلطان کے امراء اور وزراء ادھر ادھر منتشر ہو گئے۔ سلطان کے باہر نکلتے ہی میر صادق نے ڈڈی دروازے کو بند کرا دیا اور وزیر اعظم کی حیثیت سے پہرے داروں کو حکم دیا۔ "خبردار جو یہ دروازہ اب کھولا گیا۔ وہ سلطان ہی کیوں نہ ہو یہ دروازہ اب کسی کے لئے بھی نہ کھلے گا کیونکہ کوئی بھروسا نہیں، سلطان کے بہانے کون یہاں داخل ہونے کی کوشش کرے۔"

ان ہدایات کے بعد میر صادق شہر کی مشرقی سمت روانہ ہو گیا۔ جہاں اس کی کوٹھی تھی، میر صادق فاتحین کو اپنی کوٹھی میں خوش آمدید کہنا چاہتا تھا۔

ڈڈی دروازے کا احمد خان نامی ایک وفادار سپاہی میر صادق کے احکامات کو شک و شبہے سے سن کر اس کے تعاقب میں لگ گیا، پہلے اس کا یہ خیال تھا کہ میر صادق، سلطان کے عقب میں محاذ جنگ پر جائے گا لیکن جب اس نے اس غدار کو اپنی کوٹھی، علاقہ گنجام کی طرف جاتے دیکھا تو گھوڑے کو ایڑ لگا کر اس کے سر پر جا پہنچ گیا اور اسے للکارا۔ "او غدار! کہاں جاتا ہے؟"

میر صادق نے پلٹ کر دیکھا۔ احمد خاں ـــــ کی تلوار بجلی کی طرح کوندی اور میر صادق کا سر اڑ کر دور جا گرا۔ میر صادق کا بے جان لاشہ گھوڑے سے گر کر پھڑکنے لگا۔

سلطان اپنے محافظ دستے کے ساتھ شہر کے شمال مغربی حصے میں دہلی دروازے پر پہنچا۔ یہاں اس کی ایک انگریزی دستے سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ اس کے امراء جنگ میں شریک ہونے کی بجائے، دور سے رومال ہلا ہلا کر انگریزوں کو یہ بتا رہے تھے کہ سلطان میدان میں آچکا ہے اسے فوراً ہی محاصرے میں لے کر یہ کھیل ختم کیا جا سکتا ہے۔

کسی وفادار نے اطلاع دی۔ "قبلۂ عالم! انگریزی سپاہ جنوبی اور جنوب مغربی فصیل سے اندر داخل ہو چکی ہے!"

سلطان نے غضب ناک ہو کر پوچھا۔ "میر معین الدین کیا کر رہا ہے۔ اور وہاں کی سپاہ کہاں چلی گئی؟"

مخبر نے عرض کیا۔ "میر معین الدین کا کچھ پتہ نہیں اور ان محاذوں کی سپاہ کو پورنیا نے تنخواہیں دینے کے بہانے دو گھنٹے پہلے ہی اپنے پاس بلا لیا ہے!"

انگریزوں کا دباؤ بڑھتا جا رہا تھا۔ سلطان کے محافظ ایک ایک کر کے شہید ہوتے جا رہے تھے، جب اس محاذ کو قابو سے نکلتے دیکھا تو سلطان ڈڈی دروازے پر واپس آیا۔ لیکن یہ بند ہو چکا تھا۔ سلطان نے اسے کھولنے کا حکم دیا تو کسی غدار نے اندر سے کہا۔ "دروازہ نہیں کھل سکتا۔ حضور والا خود کو انگریزی سپاہ کے حوالے کر دیں!"

سلطان دانت پیستا غصے میں شہر کے مشرق میں بڑے دروازے کی طرف بڑھا اس کے دائیں طرف اس کا محل تھا جس کے اردگرد بارود کی سرنگ بچھی ہوئی تھی، سلطان اپنے محل کو اڑا دینا چاہتا تھا لیکن ان ہنگامی حالات میں اسے اس کا موقع نہ مل سکا۔

جب وہ شہر کے بڑے دروازے پر پہنچا اس وقت مشرقی فصیل سے بھی انگریزی سپاہ اندر داخل ہو چکی تھی، اب وہ تین طرف سے محصور ہو چکا تھا۔ مشرق، مغرب اور جنوب سے آنے والی انگریزی افواج نے اسے گھیرے میں لے لیا۔ سلطان نے بھرپور کوشش کی کہ بڑے دروازے میں داخل ہو کر دوسری طرف نکل جائے لیکن یہاں بڑا ہجوم تھا۔ سلطان گولیاں چلاتا آگے بڑھتا رہا اچانک ایک گولی سلطان کے سیدھے بازو میں پیوست ہو گئی۔ سلطان تین چار قدم آگے بڑھ گیا اور زخمی بازو کو دبانے کی کوشش کی لیکن دوسری گولی پھر وہیں پیوست ہو گئی اور گھوڑا بھی زخمی ہو گیا۔ راجا خان نامی ایک سردار اس کے ساتھ تھا۔ سلطان نے راجا خان سے کہا۔ "ہم زخمی ہو گئے ہیں، ہمیں گھوڑے سے اتار لو اور تھوڑے سے پانی کا انتظام کر دو!"

راجا خان نے کہا۔ "حضور والا! اب مقابلے کا وقت نہیں رہا۔ بہتر یہی ہے کہ حضرت

خود کو انگریزوں پر ظاہر کر دیں۔"

سلطان نے حقارت سے کہا۔ "کیا تم دیوانے ہو گئے ہو، خاموش رہو، کیا تم نہیں جانتے کہ گیدڑ کی صد سالہ زندگی سے شیر کی ایک دن کی زندگی بہتر ہے!"

راجا خان نے سلطان کو گھوڑے سے اتارنا چاہا لیکن وزن برداشت نہ کر سکا اور وہ دونوں ایک ساتھ زمین پر ڈھیر ہو گئے۔ سلطان کے دوسرے جانثاروں نے اسے ایک پالکی میں لٹا دیا۔ اس دوران انگریزی سپاہ چاروں طرف پھیل چکی تھی۔ ایک انگریز سپاہی سلطان کی پالکی کے قریب پہنچا اور اس کی پیٹی اور شمشیر پر قبضہ کرنا چاہا۔ سلطان نے تلوار کے بھرپور وار سے انگریز کو لنگڑا کر دیا۔ انگریز سپاہی نے گرتے گرتے اپنی بھری ہوئی بندوق سلطان پر خالی کر دی، اور شاعرِ مشرق کے بقول ملتِ اسلامیۂ ہند کی ترکش کا خدنگِ آخریں بھی غداروں کے ہاتھوں ضائع گیا۔ ٹیپو، جس نے کئی بار اپنے دشمنوں کی متحدہ قوتوں کو شکست دی تھی، اپنے دوستوں اور منصب داروں کے اعتبار اور اعتماد پر شہید ہو گیا۔ سفینے والوں نے اپنے ناخدا کو طوفان کی ہلاکت خیزیوں کے حوالے کر کے، بخوشی غیر ملکیوں کی زنجیرِ غلامی اپنے گلے میں ڈال لی تھی۔ کوئی نہیں جانتا کہ اگر رحم دل اور حمیتِ مذہبی کے پیکر ٹیپو کو اپنے منصوبے میں کامیابی حاصل ہو جاتی تو برصغیر کا سیاسی نقشہ کیسا ہوتا؟ جس انگریز سپاہی نے سلطان کو شہید کیا تھا اسے کیا معلوم تھا کہ اس نے اپنی چند گولیوں سے ڈیڑھ سو سال کے لئے ہندوستان کی آزادی سلب کر لی ہے کیونکہ ٹیپو کے بعد پھر ایسا شجیع اور غیرت مند سپوت ہندوستان نے نہیں پیدا کیا۔

سلطان کی ادھ کھلی آنکھوں سے جھانکتی ہوئی حسرت اور بے کسی زبانِ حال سے کہہ رہی تھی کہ آہ میں وہ جلا ہوا کھنڈر ہوں جسے گھر والوں ہی نے جلا کر تباہ و برباد کر دیا۔

ایک انگریز افسر چند سپاہیوں کے ساتھ محل کے دروازے پر پہنچا۔ ایک سفید جھنڈا اس کے ہاتھ میں تھا۔ اس نے محل کے حفاظتی دستے سے کہا۔ "اب جنگ ختم ہو چکی۔ محل کا دروازہ کھول دو اور سلطان کو ہمارے حوالے کر دو!"

حفاظتی دستے کے افسر نے کہا۔ "سلطان کے حکم کے بغیر دروازہ نہیں کھل سکتا!"

انگریز افسر نے سفید جھنڈا لہراتے ہوئے کہا۔ "یہ امن کا جھنڈا ہے، دروازہ کھول دو!" انگریز افسر نے محافظ افسر کی یقین دہانی کے لئے اپنی تلوار نیام سے نکال کر اس کے حوالے کر دی۔ محافظ اندر چلا گیا اور تھوڑی دیر بعد محل کا دروازہ کھل گیا اور انگریزوں نے سلطان کو ہر کہیں تلاش کر ڈالا لیکن سلطان نہیں ملا۔

قلعہ دار نے عرض کیا۔ "جناب والا! سلطان محل میں نہیں ہے بلکہ یہ معلوم ہوا ہے کہ

وہ قلعہ کی اندرونی فصیل کے بڑے دروازے پر زخمی پڑا ہوا ہے۔"

انگریز افسر نے غصے میں کہا۔ "اگر تیری یہ اطلاع غلط نکلی تو تجھے قتل کر دیا جائے گا!"

شام ہو چکی تھی اور پھر یہ شام رات کی سیاہی میں غائب ہو گئی۔ مشعلیں لئے انگریز افسر قلعے کے بڑے دروازے پر پہنچے۔ یہاں لاشوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ لاشوں کو کھینچ کھینچ کر سلطان کو تلاش کیا جانے لگا۔ یہیں راجا خان بھی زخمی پڑا ہوا تھا۔ جب سپاہیوں نے اسے ٹانگ پکڑ کر گھسیٹا تو وہ چلایا۔ "صاحبان! میں زندہ ہوں تم کسے تلاش کر رہے ہو؟"

قلعے دار نے جواب دیا۔ "قبلۂ عالم کہاں ہیں؟"

راجا خان نے جواب دیا۔ "وہ تو جاں بحق ہو چکے!"

انگریز افسر نے بے چینی سے پوچھا۔ "سلطان کی لاش کہاں ہے؟"

راجا خان نے انہیں سلطان کی لاش کے قریب لے جا کر کھڑا کر دیا۔ قلعے دار نے لاش کو پہچان لیا اور زار و قطار رونے لگا۔ اس وقت بھی سلطان کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں، لارڈ ولزلی کا بھائی کرنل ولزلی بھی وہیں موجود تھا۔ اسے شبہ گزرا کہ سلطان ابھی زندہ ہے، اس نے جلدی سے سلطان کی نبض دیکھی، ہاتھ تو گرم تھا لیکن نبض ساکت تھی۔ سلطان کے جسم پر گولیوں کے چار زخم موجود تھے، تین جسم کے مختلف حصوں پر ایک سیدھے کان کے نیچے۔ اس وقت سلطان جسم پر سفید قمیض اور پھولدار چھینٹ کا پاجامہ پہنے ہوئے تھا اور ایک سرخ ریشمی کپڑے سے کمر کس رکھی تھی۔

افواجِ انگریزی کے جنرل ہارس کے حکم پر سلطان کی لاش کی تجہیز و تکفین ہوئی۔ شہزادوں اور ندیموں نے لاش کا آخری دیدار کیا۔ سلطان کے جنازے کے ساتھ مقامی لوگوں کے علاوہ انگریزوں کی چار کمپنیاں بھی آہستہ آہستہ چل رہی تھیں، نواب حیدر علی کی قبر کے پاس یہ ہجوم ٹھہر گیا۔ یہیں نمازِ جنازہ پڑھی گئی۔ جنرل ہارس بھی یہیں پہنچ گیا۔ سلطان کی لاش کو دیکھ کر فرطِ خوشی میں چلایا۔ "آج سے ہندوستان ہمارا ہے!"

انگریزی کمپنیاں دو رویہ صف بستہ کھڑی ہو گئیں، سلطان کا جنازہ ان کے درمیان سے گزار کر قبر تک پہنچایا گیا۔ ہوا کا نام و نشان تک نہ تھا۔ آسمان ابر آلود تھا۔ تھوڑی دیر بعد کی چمک اور کڑک شروع ہو گئی۔

پھر فوج کو آخری سلامی کا حکم دیا گیا۔ بندوقیں سر ہوئیں، ماتمی توپیں چھوٹنے لگیں اور اس کے ساتھ ہی بادلوں اور بجلی کی چمک کڑک میں شدت پیدا ہو گئی۔ اس قدرتی توپ کی آوازیں اتنی شدید تھیں کہ انگریزی توپوں کی آوازیں دب گئیں، سلطان کے دیوان خانے، محل سرا

اور سلطان کی تعمیر کردہ مسجدِ اعلیٰ پر بجلی گری۔ اس بجلی سے انگریزی کیمپ بھی نہ بچا، جس سے دو نامی افسر اور چند سپاہی ہلاک ہو گئے۔

سرنگاپٹم پر پوری طرح قابض ہو جانے کے بعد انگریزوں نے میر قمر الدین اور پورنیا کو شہزادہ فتح حیدر کے پاس روانہ کیا کہ وہ دونوں شہزادے کو سمجھا بجھا کر جنگ سے باز رکھیں۔

شہزادہ فتح حیدر اپنے باپ کی شہادت کی خبر سن چکا تھا۔ جب پورنیا اور قمر الدین اس کے پاس پہنچے تو اس نے دریافت کیا۔ "اب تم لوگ میرے پاس کیوں آئے ہو؟"

پورنیا نے سر عجز جھکا کر عرض کیا۔ "صاحب عالم! جو ہونا تھا وہ ہو چکا۔ اب جنگ فضول ہے اگر آپ انگریزوں کی اطاعت پر آمادہ ہو جائیں تو آپ کو حکومت مل سکتی ہے!"

قمر الدین نے کہا۔ "مجھ سے انگریز افسروں نے یہ وعدہ کیا ہے کہ اگر شہزادے نے جنگ نہ کی تو شہید سلطان کی حکومت آپ کے حوالے کر دی جائے گی!"

شہزادے نے جہاں خان کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ "تم کیا کہتے ہو؟"

ملک جہاں خان نے کہا۔ "آپ چاہیں تو ان غداروں کی باتوں پر اعتبار کر لیں، ورنہ میری ناقص رائے تو یہ کہتی ہے کہ اگر سرنگاپٹم نکل گیا ہے تو پروا نہیں، ابھی سلطنتِ خداداد کے دوسرے قلعوں سے جنگ جاری رکھی جا سکتی ہے، اور میں شہزادے کو یہ یقین دلانے پر تیار ہوں کہ زندگی کی آخری سانس تک اس کا ساتھ دوں گا!"

لیکن شہزادہ انگریزوں سے جنگ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ شہزادہ اپنی فوج کو پورنیا اور قمر الدین کے ساتھ لے کر سرنگاپٹم انگریزوں کی اطاعت کرنے روانہ ہو گیا۔

ملک جہاں خان باہر نکلا اور روزی کو ساتھ لے کر ایک طرف روانہ ہو گیا۔ اس نے جاتے جاتے شہزادے سے کہا۔ "شہزادے! میں ان غداروں پر اعتماد نہیں کر سکتا اس لئے مجبوراً شہزادے کا ساتھ نہیں دے سکتا!"

کمیشن کے سامنے جب یہ مسئلہ زیر بحث آیا کہ حصے بخروں کے بعد بچا کھچا حصہ کس کے حوالے کیا جائے تو بعض انگریز افسروں نے سلطان کے کسی بیٹے کو تخت نشین کر دینے کی سفارش کی اس موقع پر سلطان کے امیر البحر میر غلام علی نے آگے بڑھ کر عرض کیا۔ "سانپ کو ہلاک کر کے اس کے بچوں کی پرورش کرنا کہاں کی عقل مندی ہے!!"

لیکن پورنیا نے ادب سے عرض کیا "جناب والا! ریاست میسور اڑتیس سال پہلے ایک ہندو ریاست تھی، اس ریاست کے حقیقی وارث ابھی موجود ہیں کیوں نہ یہ ریاست انہی کے

حوالے کر دی جائے!"

انگریزوں نے پورنیا کی بات مان لی اور ریاست قدیم ہندو راجا کے خاندان کے حوالے کر دی گئی اور پورنیا کو اس ریاست کا دیوان مقرر کر دیا گیا۔

غداری کے صلے میں میر غلام علی کی تین ہزار طلائی پگوڈا ماہانہ پنشن مقرر ہوئی جسے وہ بارہ سال تک وصول کرتا رہا۔

میر معین الدین ۴ مئی کے ہنگامے ہی میں مارا گیا۔ میر قمر الدین سپہ سالار افواجِ سلطانی کو گرم کنڈہ کی جاگیر عطا کی گئی جہاں وہ مرضِ جذام میں مبتلا ہو کر مر گیا۔ میر صادق کی قبر پر لوگ جا جا کر تھوکتے اور غلاظت کے ڈھیر لگانے لگے۔

ملک جہاں خان اس توقع پر کری گڑھ سے نکلا تھا کہ وہ کچھ ساتھی فراہم کر کے انگریزوں کو تنگ کرتا رہے گا اور روزی اس امید پر اس کے ساتھ ہو گئی تھی کہ شاید ان نازک حالات میں یہ بہادر انسان قیدی پامر کو رہا کر دے کیونکہ اس کا خیال تھا کہ دو، ایک دوسرے کے دشمن مصیبت زدہ، یکساں مصیبت کے ہاتھوں دوست ہو جاتے ہیں۔

وہ اونچی نیچی پہاڑیوں کی پرپیچ راہیں طے کرتا میسور کی جنوبی حدود سے گزر کر نیلگری میں داخل ہوا تو روزی نے خوفزدہ ہو کر دریافت کیا۔ "ملک جہاں خان! یہ تم مجھے کہاں لئے جا رہے ہو؟"

خاموش اپنے خیالوں میں کھوئے ہوئے جہاں خان نے سر اٹھایا اور بے معنی انداز میں پہاڑی سلسلے پر نظریں جما کر بولا۔ "تمہارے محبوب پامر کے پاس!"

روزی کا مارے خوشی کے چہرہ دمکنے لگا، بے تابی سے دریافت کیا۔ "وہ کہاں ہے؟"

"گھبراؤ نہیں، میں تمہیں وہیں لئے چل رہا ہوں!"

جب وہ روزی کو لے کر اس درخت کے نیچے پہنچ گیا جہاں پامر کی لاش چھوڑ گیا تھا تو وہ گھوڑے سے اتر پڑا اور ہاتھوں کا سہارا دے کر روزی کو بھی اتار لیا۔ روزی کو جہاں خان کی نیت پر شبہ گزرا۔ اس نے سہمے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ "تم یہاں کیوں رک گئے؟"

جہاں خان نے کہا۔ "میں پامر کو یہیں چھوڑ گیا تھا!"

روزی نے بے چینی سے کہا۔ "یہاں کہاں، یہاں تو کوئی سر چھپانے کی جگہ تک نہیں؟"

"ہاں روزی تم صحیح کہہ رہی ہو" پھر ایک طرف جاتا ہوا بولا۔ "ادھر آؤ میرے ساتھ مجھے یقین ہے کہ میں پامر کو ضرور تلاش کر لوں گا تم مایوس نہ ہو!"

روزی اب بھی اس کی طرف سے مطمئن نہ تھی، اس کے خیال میں آج جہاں خان گمراہ ہو گیا تھا اور وہ اس کی عزت آبرو لوٹنے کے لئے مناسب جگہ کی تلاش میں تھا۔

• وہ بھاگ کر ایک کھلی جگہ پر چلی گئی، بولی۔ "میں کہیں نہیں جاؤں گی، آخر تمہارے ارادے کیا ہیں؟"

جہاں خان نے ہونٹ بھینچ لئے، بولا۔ "نادان لڑکی! مجھ پر شک نہ کر، میں یہاں تیرے پامر کی تلاش میں آیا ہوں!"

روزی سہمی ہوئی دور کھڑی رہی، اور جہاں خان تنہا اِدھر اُدھر گھومتا پھرتا رہا۔ ایک دیوار کے سائے میں ہڈیوں کا ایک پنجر اس طرح پڑا تھا کہ اس کا سر ایک نیم مدور پتھر کے نیچے لٹک رہا تھا اور جسم کے دوسرے اعضا جنگلی درندے نوچ نوچ کر کھا گئے تھے، اس نے جھک کر پنجر کے شانے کی ہڈی کے اس نشان کو تلاش کیا جو اس کی گولی سے زخمی ہو گیا تھا۔ وہاں کی ہڈی چھڑی ہوئی تھی پھر اس نے زخمی پنڈلی کا نشان بھی تلاش کر لیا اور چیختا ہوا روزی کی طرف دوڑا۔

"روزی! جلدی آؤ۔ تمہارا پامر مل گیا۔ ادھر آؤ۔ یہاں دیکھو۔ دیکھو یہاں دیوار کے نیچے تمہارا پامر پڑا ہوا ہے!"

روزی سہمی ہوئی دل نہ چاہنے کے باوجود جہاں خان کے پاس چلی گئی۔ جہاں خان نے اسے ہڈیوں کے پنجر کے سرہانے کھڑا کر دیا اور کہا "یہ رہا تمہارا پامر، اگر پہچان سکتی ہو تو پہچان لو!"

روزی کو پہلی بار اس بات کا احساس ہوا کہ شاید جہاں خان کا دماغی توازن جاتا رہا ہے، وہ منہ سے تو کچھ بھی نہ بولی بس رحم آمیز نظروں سے جہاں خان کو دیکھنے لگی۔

جہاں خان نے ٹھہرے ٹھہرے غمزدہ لہجے میں پامر سے مقابلے کی ساری روداد بیان کر دی، اس کے بعد بولا۔ "میں اسے یہیں بے گور و کفن چھوڑ گیا تھا اور مجھے یقین تھا کہ اگر میں سالوں بعد بھی یہاں آؤں گا تو اس کا پنجر یہیں کہیں مل ضرور جائے گا۔ کیونکہ یہاں کون ہے جو کسی کی تجہیز و تکفین کرے!"

روزی نے یقین نہ کرنے کے انداز میں پوچھا۔ "لیکن تم ہمیشہ یہ بات چھپاتے کیوں رہے؟"

جہاں خان نے جواب دیا۔ "صرف اس لئے کہ مجھ سے غلطی میں جو سرزد ہو گیا تھا۔ تم پر اس کا اظہار کر کے تمہیں دکھ نہیں پہنچانا چاہتا تھا!"

روزی نے کہا۔ "لیکن اب بھی میں یہ کس طرح یقین کر لوں کہ تم جو کچھ کہہ رہے ہو

وہ صحیح ہے!"

"تمہاری مرضی!" جہاں خان نے کہا۔ "یقین نہ کرنے سے تم زندگی بھر پامر کا انتظار کرتی رہو گی اور کچھ نہیں، اور میں تمہیں انتظار کی ان جان لیوا ساعتوں سے بچانا چاہتا ہوں!"

روزی آہستہ آہستہ روتی رہی، سامنے حدِ نظر تک پھیلا ہوا نیلگوں آسمان، اپنے بے کراں خلا اور لامتناہی وسعتوں سے روزی کی تنہائی اور دل کے خلا میں گھاؤ ڈال رہا تھا۔

جہاں خان نے اچانک پیچھا چھڑانے والے انداز میں سوال کیا۔ "اب تمہارا کیا ارادہ ہے؟"

• روزی ہکا بکا اس کی صورت دیکھنے لگی، بولی۔ "میں کیا بتاؤں؟ کچھ سمجھ میں نہیں آتا!"

جہاں خان نے کہا۔ "میں تمہیں کالی کٹ لئے چلتا ہوں، وہاں تمہیں کسی بحری جہاز میں بٹھا کر فرانس روانہ کر دوں گا۔ تم اپنے وطن واپس جاؤ کیونکہ اب فرانس والوں کے لئے اس ملک میں کوئی گنجائش نہیں رہی!"

روزی کی نیت کچھ اور تھی، وہ کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن نہیں کہہ سکی بولی۔ "اگر میں یہیں اسی ملک میں رہنا چاہوں تو؟"

جہاں خان نے کہا۔ "یہاں تم کس کے پاس رہو گی؟"

روزی نے پوچھا۔ "تم کہاں جاؤ گے؟"

جہاں خان نے جواب دیا۔ "کچھ پتہ نہیں، لیکن یہ طے ہے کہ ان حالات میں، میں خاندان نہیں بنا سکتا!"

روزی نے کہا۔ "پھر تم مجھے کالی کٹ پہنچا دو، میں وطن واپس جاؤں گی!"

جہاں خان نے اسے کالی کٹ پہنچا دیا وہاں اس نے روزی کو ایک تجارتی جہاز پر سوار کر کے فرانسیسی مقبوضے مڈغاسکر بھیج دیا۔ مڈغاسکر سے فرانسیسی حکومت نے اسے فرانس روانہ کر دیا۔ جہاں وہ نارمنڈی کے شہر روون چلی گئی جہاں اس کا آبائی مکان اس کا منتظر تھا۔ اس نے ہندوستان سے چلتے وقت جہاں خان کو اپنا روون کا پتہ دے دیا تھا جسے اس نے بے دلی سے لے لیا تھا۔

کالی کٹ سے غائب ہو کر، کچھ عرصے بعد جہاں خان بیس پچیس ہزار سواروں کے ساتھ مرہٹوں کی سرحد پر نمودار ہوا اور ان کے سردار گوکھلے اور پرسرام کے سروں کو نیزے پر چڑھا کر سلطان شہید کے دشمنوں کو لرزا دیا۔ انگریز اس کی تلاش میں اپنی فوجیں لئے سرگرداں رہے لیکن جہاں خان کے پاس چونکہ کوئی قلعہ یا قطعہ زمین نہ تھا اس لئے یہ آوارہ گرد چھاپہ مار کوہستانی

سلسلوں اور جنگلوں کی خاک چھانتا ہوا، اچانک یوں غائب ہوا کہ تاریخ اس کے انجام کی سچی نشان دہی سے آج تک قاصر ہے۔

دوسری طرف لورن میں، دریائے سین کے کنارے روزی یہ آس لگائے جیتی رہی کہ ہو سکتا ہے کسی دن پالمر اسے تلاش کرتا ہوا لورن پہنچ کر اسے ششدر کر دے اور اس کے انتظار کی گھڑیاں ختم ہو جائیں، روزی کے دل میں کہیں جہاں خان بھی موجود تھا جسے اس نے چلتے وقت اپنا پتہ دے دیا تھا۔ روزی کا خیال تھا کہ یہ آوارہ گرد، مایوس ترین انسان، ممکن ہے کسی دن انتہائے ناامیدی اور روزی کی محبت میں فرانس کا رخ کرے، اور اپنی بقیہ زندگی روزی کی قربت میں گزارنے پر آمادہ ہو جائے لیکن یہ دونوں ہی بے وفا نکلے اور انہوں نے روزی کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے انتظار کی کشاکش میں مبتلا رکھا۔

(ختم شد)